ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مرتبہ

سعید احمد اکبرآبادی

ندوۃ المصنفین کی دینی اور اجتماعی کتابیں

اسلام کا اقتصادی نظام

وقت کی ایک اہم انقلاب انگیز کتاب جس میں اسلام کے معاشی نظام کا جامع نقشہ پیش کیا گیا ہے، چوتھا ایڈیشن۔ قیمت عہ، مجلد سے

اسلام کا نظام مساجد

نظام مساجد کے تمام گوشوں پر دل پذیر بحث اور اس کی منفعتوں اور برکتوں کی تفصیل۔
قیمت سے مجلد للعہ

اسلام میں غلامی کی حقیقت

مسئلہ غلامی کی تحقیق پر ندوۃ المصنفین کی معرکۃ الآرا کتاب جس میں انفرادی اور اجتماعی غلامی کے ایک ایک پہلو پر اسلام کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے، قیمت سے، مجلد للعہ

قرآن اور تعمیر سیرت

ایک عظیم الشان اصلاحی کتاب

قرآن مجید کی تعلیم و تربیت کا انسانی سیرت کی تعمیر میں کیا دخل ہے اور اس تعلیم کے ذریعہ سے اس سیرت و کردار کا کس طرح ظہور ہوتا ہے یہ مبترک کتاب خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ مسلمان عام طور پر احساس کہتری کی اندھیریوں میں پھنسے ہوئے ہیں یہ گراں مایہ تالیف ان کے روحانی رشتے کو مضبوط کرنے میں چراغ راہ کا کام دے گی۔
قیمت صر، مجلد سے

ارشادات نبوی کا لاثانی ذخیرہ

اردو زبان میں

ترجمان السنہ: ہماری زبان میں حدیثوں کی ایسی جامع اور مستند کتاب آج تک وجود میں نہیں آئی تھی اس میں عربی متن معہ اعراب بھی ہے اور صاف و سلیس ترجمہ بھی، ساتھ ہی محققانہ تشریحی نوٹ بھی ہیں۔ ترتیب میں کتاب التوحید کو پہلے رکھا گیا ہے اور پھر اسی مناسبت سے پوری کتاب کی ترتیب قائم کی گئی ہے پہلی جلد کے شروع میں کئی سو صفحات کا ایک مقدمہ ہے

جلد اول قیمت عـہ، مجلد لـعہ

جلد دوم قیمت للعہ مجلد للعہ

فہم قرآن قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں کلام ربانی کا قطعی منشاء معلوم کرنے کے لئے آنحضرت کے ارشادات و اقوال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے اس کتاب کا اصل موضوع یہی ہے ایک بہترین تبلیغی اور اصلاحی کتاب ہے

وحی الٰہی مسئلہ وحی کے تمام گوشوں پر دل پذیر بحث، وحی کی حقیقت اور اس کی صداقت سمجھنے کے لئے لاجواب کتاب۔
قیمت سے، مجلد للعہ

منیجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

بُرھان

جلد ۳۴ شمارہ ۱

جنوری ۱۹۵۵ء مطابق جمادی الاول ۱۳۷۴ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

مدارس عربیہ کے لئے ایک لمحۂ فکر

از

(سعید احمد)

(۵)

علوم غیر دینیہ ہمارے قدیم درس نظامی میں علوم و فنون دینیہ و عربیہ کے ساتھ کچھ ایسے علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں جو نہ دینی ہیں اور نہ عربی اور یہ علوم صرف پڑھائے ہی نہیں جاتے بلکہ اُن کی تعلیم پر کافی وقت اور محنت صرف کی جاتی ہے اور پھر مدارسِ عربیہ سے جو حضرات فارغ التحصیل ہوتے ہیں ان میں سے بعض کا طغرائے امتیاز یہی ہوتا ہے کہ وہ بہت بڑے منطقی ہیں یا فلسفی ہیئیت کے امام ہیں یا ریاضیات میں ان کو بڑی دسترس ہے۔ ان علوم و فنون کا درسِ نظامی میں شامل ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارے اسلافِ کرام جنھوں نے یہ نصاب بنایا تھا وہ اس حقیقت کو اچھی طرح محسوس کرتے تھے کہ علمائے دین کا کام صرف یہ ہی نہیں ہے کہ وہ تفسیر۔ حدیث۔ فقہ اور ان کے ممدو معاون علوم و فنون سے واقف ہوں بلکہ ان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ وقت کے مروجہ علوم و فنون سے بھی باخبر ہوں۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلافِ کرام کے اس اعتقاد و خیال کی بنیاد امور ذیل پر تھی!

(۱) قرآن مجید میں اور احادیث میں متعدد مقامات پر تاکید کی گئی ہے کہ علم حاصل کرنا چاہیے جو علم غیر نافع یا مضر ہے اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے لیکن وہ علوم و فنون جو دماغ میں انجلا پیدا کریں جن سے انسانی تجربہ میں پختگی اور استحکام پیدا ہو۔ جو انسانی افکار و خیالات

میں انقلاب آفرینی کریں اور جن سے انسانی تہذیب و تمدن کو فائدہ پہنچے ان علوم کا حاصل کرنا اسلام میں نہ صرف یہ کہ مباح اور جائز ہے بلکہ اس اعتبار سے اس کو فرض کفایہ کہا جا سکتا ہے کہ ان علوم و فنون میں سربراہی اور دستگاہ کو قومی ترقی اور سیاسی نہضت و رفعت میں بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔

(۲) بعض علوم و فنون کا مذہب سے براہ راست تو کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن بالواسطہ ان کے اثرات بہت گہرے اور دور رس ہوتے ہیں اور انسان کا مذہبی شعور بھی ان اثرات کی زد سے محفوظ نہیں رہتا۔ مثلاً فلسفہ اور اس کی مختلف شاخیں، ان علوم کا حاصل کرنا علمی افادیت سے قطع نظر، دین کی تبلیغ و اشاعت اور اس کی حفاظت و صیانت کے پیش نظر بھی ضروری ہوگا تاکہ اسلامی عقائد و افکار پر جس طرف اور جہت سے حملوں کا اندیشہ ہو ان کے خلاف مورچہ بندی کر لی جائے، اور مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کو ضلالت فکر و عمل سے بچایا جا سکے۔

(۳) بعض علوم و فنون ایسے ہیں جن کا مذہب سے اگرچہ کوئی تعلق نہیں ہے لیکن قرآن مجید کے بیان کردہ حقائق مثلاً عروج و زوالِ اقوام کے اسباب۔ نفسیاتِ خیر و شر۔ انسانی فکر و شعور کا تدریجی ارتقا۔ بقائے اصلح۔ اصولِ حکومت و سلطنت۔ اصولِ معیشت اور ان کے علاوہ دوسری اسلامی تعلیمات۔ ان کے سمجھنے میں یا ان سے متعلق یقین و اعتقاد کی پختگی میں مدد ملتی ہے تو ظاہر ہے کہ علمی اور دینی دونوں قسم کے نقطۂ نظر سے ان کا حاصل کرنا بھی بحیثیت مجموعی ضروری ہوگا اس قسم کے علوم میں تاریخ۔ اقتصادیات۔ سائنس۔ علم الالسنہ، علمِ آثار قدیمہ اور ان سے متعلقہ علوم و فنون داخل ہیں۔

بہر حال سطور بالا سے یہ ظاہر ہے کہ مدارسِ عربیہ کا کام دینی علوم کے ساتھ بعض غیر دینی علوم و فنون کی تعلیم بھی ہونا چاہئے۔

اس اصول کو صحیح تسلیم کر لینے کے بعد اب ہم کو موجودہ علوم و فنون غیر دینی جو مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں ان کی علمی حیثیت اور ان کی تدریس کے لئے جو کتابیں تجویز شدہ ہیں ان پر ایک نگاہ ڈالنی چاہئے۔

یہ ظاہر ہے کہ منطق، فلسفہ، ہیئت یہ سب علوم عقلی ہیں اور عقل و شعور انسانی یونانیوں کے عہد سے لے کر اب تک ترقی، تجربہ اور فکر کی جو منزلیں طے کر چکی ہے اس کے پیش نظر فلسفہ یونان ہیئت اور اس عہد کے دوسرے علوم صرف ایک تقویم پارینہ بن کر رہ گئے ہیں۔ ان علوم کا جاننا ان علوم کی تاریخ کے طالب علم کے لئے تو اس لئے اب بھی ضروری ہے کہ ان کے بغیر وہ ان علوم کے تدریجی ارتقار کی مختلف کڑیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط و منظم نہیں کر سکتا۔ لیکن صرف اسی پر قناعت کر لینا اور اب ان علوم میں جو ترقی ہوئی ہے اس سے بے خبر رہنا نہ دین کے لئے کچھ مفید ہے اور نہ علمی حیثیت سے اس کی کوئی قدر و قیمت اور اہمیت ہے۔ آج انھیں علوم میں سے ہر علم کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ کو ایک مستقل علم بنا دیا گیا ہے اور پھر ہر حصہ کے لئے معلومات و تحقیقات کا اتنا عظیم الشان ذخیرہ مہیا ہو گیا ہے کہ علم و حکمت یونان کی پوری کائنات سمندر کے سامنے ایک جوئے پایاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ مثلاً قدیم منطق میں قیاس اور استقرار دونوں کو ایک ہی جگہ اور ایک ہی کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔ اور جدید منطق میں دونوں کو فن کی دو مستقل شاخیں قرار دے کر الگ الگ ہر ایک سے متعلق بہت مفصل اور مبسوط بحث کی گئی ہے۔ یہی حال تمثیل کا ہے۔ ہمارے ہاں منطق کی اونچی کتابوں میں علم اور وجود دونوں کی حقیقت سے ایک ہی کتاب میں بحث کی گئی ہے لیکن اب ان میں سے ہر ایک ایک مستقل علم ہے۔ یعنی علم العلم اور علم الوجود جن کو ONTOLOGY اور ONTIMOLOGY کہتے ہیں پھر فلسفہ کا عالم تو اور ہی دگرگوں ہے ہمارے یہاں حکمت نظری اور حکمت عملی دونوں کو اور اُن کے ماتحت جو اقسام داخل ہیں سب کو گڈمڈ ایک ہی جگہ ذکر کر دیتے ہیں اور یہاں ہر قسم مستقل ایک علم ہے اور ہر علم کے الگ الگ ماہرین ہیں جنہوں نے عمریں اسی ایک علم پر صرف کر دی ہیں، علاوہ بریں موجودہ فلسفہ کو یونانی فلسفہ پر اس وجہ سے مزید برتری حاصل ہے کہ یونانی فلاسفہ زیادہ تر عالم خیال میں پرواز کرتے تھے اور اس بنا پر بسا اوقات غلط یا کم از کم غیر واضح نتائج تک ان کی رسائی ہوتی تھی لیکن چونکہ موجودہ فلسفہ کو سائنس کے ساتھ ربط باہمی ہے اور یورپ کے بہت سے فلاسفہ سائنس داں بھی ہیں اس

لئے یہ فلسفہ حقائق کا بالکل صحیح ترجمان نہیں تو حقائق سے بہت زیادہ قریب آگیا ہے، اور اس بنا پر ذہن کو انجلا اور فکر و خیال کو پختگی بخشتا ہے۔ پھر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ آج دنیا کا عظیم الشان فکری و ذہنی انقلاب جہاں صنعت و حرفت اور سائنس کا مرہون احسان ہے۔ اس میں بہت بڑا دخل فلسفۂ جدید کو بھی ہے اور خاص طور پر اس نے اخلاقیات کی دنیا میں تو وہ بحرانِ عظیم پیدا کیا ہے کہ حسن و قبح کا معیار اور اشیا کے اقدار کو بدل کر رکھ دیا ہے۔

منطق اور فلسفہ کو صرف بطور ایک مثال کے بیان کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مدارس عربیہ میں ان دونوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور ایک طالب علم کی عمر کا بڑا وقت ان پر خرچ ہو جاتا ہے ورنہ تاریخ۔ جغرافیہ۔ اقتصادیات۔ سیاسیات۔ ریاضیات وغیرہ وغیرہ کتنے علوم و فنون ہیں جو آج اوجِ کمال کو پہنچے ہوتے ہیں۔ اس بنا پر ظاہر ہے کہ درسِ نظامی میں غیر دینی علوم کے شامل کرنے سے ہمارے بزرگوں کا جو مقصد تھا وہ ہرگز اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم ماضی کے ان نقوش کو چھوڑ کر عہدِ حاضر کی علمی اور فکری ترقیات سے فائدہ نہ اٹھائیں۔

انگریزی زبان کی اہمیت

علومِ جدیدہ پر گفتگو کرتے وقت ذہن خود بخود انگریزی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور ایسا ہونا ناگزیر ہے، کیوں کہ جس طرح ایک زمانہ میں یورپ اور ایشیا دونوں جگہ عربی علمی زبان تھی۔ اسی طرح اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ آج دنیا کی سب سے بڑی علمی زبان انگریزی ہے۔ اس زبان کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ اور تو اور آج خالص اسلامیات کا ایک طالب علم بھی اپنی ریسرچ اس وقت تک مکمل نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ انگریزی زبان سے استفادہ نہ کرے۔

اسلامی فلسفہ، اسلامی تاریخ، عربی زبان کی تاریخ، عربی ادب، اسلامی فقہ، علم الکلام، اصولِ حدیث، علم طب، کیمیا، علم المرایا والمناظر، اسلامی فنِ تعمیر، تصوف، الاسماء والرجال، یہ اور ان کے علاوہ دوسرے اسلامی علوم و فنون، ان سب پر محققین یورپ نے جو دادِ تحقیق دی ہے اور عمریں صرف کر کے ان سے متعلق جو عظیم سرمایہ مہیا کر دیا ہے اور جس میں برابر اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اسلامیات کا کوئی ریسرچ اسکالر ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، اگرچہ یہ سرمایہ فرانسیسی، جرمنی، اطالوی، پرتگالی اور انگریزی ان سب

زبانوں میں بکھرا ہوا ہے لیکن انگریزی ان سب میں زیادہ وسیع اور عالمگیر ہے۔ فرانسیسی اور جرمنی میں اسلامیات پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے متعدد کتابوں کے تراجم خود انگریزی میں ہو چکے ہیں۔

انگریزوں کے ساتھ عناد کے باعث بعض مدارس میں انگریزی بھی نفرت یا کم از کم استکراہ کا برتاؤ کرنا طبعی بات تھی لیکن بہرحال اب وہ دور ختم ہو گیا ہے اور اب کوئی وجہ نہیں ہے کہ انگریزی کے ساتھ علیحدگی کا وہی معاملہ کیا جائے۔

پھر یہ بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ انگریزی زبان آج بین الاقوامی خط و کتابت، اور بین الاقوامی تحریر و تقریر کی زبان ہے اور اس بنا پر کسی قوم کے لئے اپنے نظام فکر، اپنے مذہب اور اپنے کلچر کی بین الاقوامی اشاعت اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ وہ انگریزی زبان کو اشاعت کا ذریعہ نہ بنائے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے برادران وطن کی کتنی ہی سوسائٹیاں ہیں جو بنیادی طور پر مذہبی اور روحانی ہیں اور وہ اپنے مشن کی اشاعت انگریزی ہی کے ذریعہ کر رہی ہیں۔ علمائے حق کے انگریزی سے نابلد اور ناواقف ہونے کا آج نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یورپ اور امریکہ میں اسلام سے متعلق جو کچھ کام ہو رہا ہے وہ ان حضرات کے ذریعہ ہو رہا ہے جن کو طبقۂ علماء میں شمار نہیں کیا جا سکتا اور ان میں اکثریت تو ان لوگوں کی ہے جن کو صحیح عقائد اہل سنت والجماعۃ کا حامل بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ تبلیغ و اشاعت کا اتنا بڑا میدان دوسروں کے حوالہ کر دینا اور خود اس میں دخل نہ دینا کسی درجہ میں بھی قابل برداشت ہو سکتا ہے۔

کسی کو شبہ ہو سکتا ہے کہ عہد حاضر کے علوم میں تو سائنس سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے اور ہے بھی بڑے کام کی چیز۔ اور اس سے خدا کے وجود اور اس کی الوہیت کا یقین بھی کامل ہو جاتا ہے۔ تو کیا اس مضمون کو بھی مدارس عربیہ کے نصاب میں شامل کرنا چاہیے۔ جواب یہ ہے کہ ظاہر ہے کہ کسی کالج یا کسی یونیورسٹی میں بھی دنیا بھر کے تمام مضامین پڑھانے کا انتظام نہیں ہوتا۔ ہر ایک درس گاہ اپنے اپنے خاص مقاصد کے پیش نظر ان سے متعلق مضامین کی ہی تعلیم کا انتظام کرتی ہے۔

مدارس عربیہ کا مقصد ایسے علما پیدا کرنا ہے جو علوم دینیہ اور عربی کے ساتھ وقت کی علمی اسپرٹ اور فکری رجحانات سے بھی باخبر ہوں نہ کہ انجنیئر، ماہرین صنعت و حرفت اور ٹیکنیشین ہوں۔ اس بنا پر ظاہر ہے کہ سائنس کی تعلیم مدارس عربیہ کے مقاصد کے ذیل میں نہیں آتی۔

ہندی: ہندی چونکہ ملک کی سرکاری زبان بن گئی ہے۔ اس لئے مدارس عربیہ کو اس زبان کی تعلیم کا بھی اب خاطر خواہ بندوبست کرنا ہوگا تاکہ ہمارے مدارس کے تعلیم یافتہ ملک کے کاروبار میں حصہ لے سکیں اور شہری زندگی میں درماندہ نہ رہیں۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کو پڑھ کر ممکن ہے کسی صاحب کے دماغ میں یہ خیال گذرے کہ اس تحریر کے مطابق تو ایک طالب علم کو ہر مضمون کے لئے کافی وقت دینا چاہیے تاکہ ایک ہی وقت میں وہ بڑا مفسر ہو اور محدث بھی، ادیب بھی اور فلسفی بھی، چناں بھی ہو اور چنیں بھی، تو گذارش یہ ہے کہ ان سطور کا مقصد صرف یہ بتانا تھا کہ کس فن کی تعلیم کس طرح ہونی چاہئے۔

وجوہ شرف آدم

از

(جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی لکچرر عربی و فارسی یونیورسٹی الٰہ آباد)

تمہید - "انسان اشرفِ مخلوقات ہے" یہ جملہ ایک کہاوت کے طور پر تو ضرور کبھی کبھی ہماری زبان پر آجاتا ہے مگر سچ پوچھئے تو انسان کے صحیح فضل و شرف کو ہم لوگ جانتے ہی نہیں خیر اس گروہ کا تو ذکر ہی چھوڑئے جس نے عجائب پرستی کے جوش میں سانپ - بلّی - دریا - پتھر - جانور کے سامنے سرِ عبودیت خم کر کے انسان کی ساری شرافت، ساری کرامت، ساری خودداری، ساری خودمختاری کو خاک میں ملا دیا اور اس کی فطری سربلندیوں کو ذلت اور پستی، گندگی اور بے تمیزی کی انتہائی گہرائیوں میں دفن کر دیا اگر آپ پڑھے لکھے طبقہ کو بھی لے لیجئے تو آپ پائیے گا کہ وہ بھی انسان کے فضل و شرف کو بطریقِ احسن نہیں پہچانتا اور میں تو یہاں تک کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ خود قرآن پڑھنے اور سمجھنے والی جماعت کے اکثر افراد بھی اس کا پورا اور صحیح علم شاید نہیں رکھتے۔ بس چند روایات و حکایات جو عام طور پر مشہور اور زبان زد ہیں انھیں کو پورا یا ادھورا سن لیا ہے انھیں پر اپنے مذہبی عقیدے کی یا ذہنی واقفیت کی بنیاد اور عمارت کھڑی کر لی ہے۔

معاف کیجئے گا یہ میں نے کسی دوسرے کا نہیں خود اپنا ہی حال صاف صاف لکھ دیا ہے کبھی کبھی جو قرآن پاک کے تلاوت کے ساتھ تفاسیر کے رنگا رنگ پھلواریوں کی سیر کی نوبت آگئی ہے تو باور کیجئے کہ قدم قدم پر اپنے جہل کا علم ہوا اور عجیب عجیب نادر معلومات (یہاں میں انھیں نادر ہی کہوں گا) نصیب وقت ہوئی ہیں بس پڑھتا اور لطف اندوز ہوتا تھا ایسے وقتوں میں کبھی کبھی دل کے کسی گوشہ سے [اور خدا کرے وہ ریا اور حُبّ جاہ کا گوشہ نہ رہا ہو] یہ آواز بھی آتی تھی کہ "تنہا خوری اچھی نہیں" "ان معلومات کو دوسروں تک بھی پہنچاؤ" غرض

ایسے ہی ایک بار مسلسل مطالعہ تفسیر کی برکت سے یہ مضمون تیار ہوا جسے اس وقت پیش کر رہا ہوں یعنی میں وہ تمام وجوہ یکجا اور (انشاء اللہ) صحیح تاریخی و تدریجی ترتیب سے بیان کرنا چاہتا ہوں جو حق تعالیٰ نے حضرت انسانِ اول ابو البشر سیدنا آدم علیہ السلام کی ذات کو عطا فرما کر دراصل پوری نوعِ انسانی کو مکرم و معزز اور دوسری تمام انواعِ مخلوقات کے مقابلہ میں اشرف و ممتاز بنا دیا مجھے قرآنِ پاک میں "تکریم بنی آدم" کے حسب ذیل سات وجوہ ملتے ہیں۔

(۱) تخلیقِ خصوصی و نفخ روحِ خاص۔

(۲) مسجودیتِ ملائکہ بارِ اول۔

(۳) عرض امانت و تمہیدِ خلافت۔

(۴) تعلیمِ اسماء و نصبِ خلافت۔

(۵) مسجودیتِ ملائکہ بار دوم۔

(۶) تلقینِ توبہ۔

(۷) میثاقِ الست۔

اب میں ہر ایک کے متعلق اپنی معلومات کی مختصر تفصیل مع دلائل پیش کرنا چاہتا ہوں۔

شرفِ اول۔ تخلیق و روح خصوصی

انسانی تخلیق کی آغاز کے بارہ میں تصورات کچھ نہ کچھ اہل عالم کے سامنے موجود ہیں چنانچہ

الف۔ سائنس والوں کی دریافت ہے کہ انسان کا مورثِ اعلیٰ بندر یا لنگور تھا اور بعض نے مینڈک کو یا کسی کیڑے کو انسان کی اصل قرار دی ہے۔

ب۔ بعض تو میں اس کی اصل شاید کسی تالاب کے کنول کو بتاتی ہیں۔

یہ اقوال چونکہ غیر انبیاء کے ہیں اس لئے نہ ان میں یہ صلاحیت ہے کہ اس مسئلہ کا صحیح حل بنا سکیں اور نہ یہ طبائع کی تسکین کر سکتی ہیں اور اگر معقولیت کے گلا گھونٹ دینے کا تہیا

نہیں کر لیا گیا ہے تو یاد رکھئے کہ ان سے تو سرے سے خدا، دین۔ اخلاق کی بلندی وغیرہ امور سب کھیل معلوم ہونے لگتے ہیں اور ان سب کی طرف سے بُعد بلکہ ایک طرح کا انکار و عناد ذہنوں میں پرورش پانے لگتا ہے۔

ع شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیر ہا

لیکن اگر اس کے متعلق انبیاء علیہم السلام کے واسطہ سے آپ معلومات حاصل کریں گے تو میں پورے وثوق اور دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پھر کسی قسم کا شبہ بھی طبائع میں نہ پیدا ہو گا چنانچہ سنئے تخلیق کے آغاز کے متعلق خدائی تعلیمات یہ ہیں :۔

۱۔ قرآن پاک میں اس کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔

(الف) إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ

(حجر-۳)

میں ایک بشر (کے پتلے کو) بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی ہوگی پیدا کرنے والا ہوں۔

(بیان القرآن ج ۶ ص ۲۵)

(ب) مَا مَنَعَكَ أَن تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ

(اے ابلیس) جس چیز کو میں نے اپنے ہاتھوں بنایا (یعنی جس کے ایجاد کی طرف خاص عنایت ربانیہ متوجہ ہوئی یہ تو اس کا شرف فی نفسہ ہے اور پھر اس کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم بھی دیا گیا ....) اس کو سجدہ کرنے سے تجھ کو کون چیز مانع ہوئی۔

(بیان القرآن ج ۱۰ ص ۱۴)

۲۔ توراۃ میں ہے :۔

وجبل الرب الالٰہ آدم ترابًا من الارض و نفخ فی انفہ نسمۃ حیوۃ فصار آدم نفسًا حیّۃً

(توراہ سفر تکوین۔ اصحاح دوم آیت ۷)

پروردگار معبود نے آدم کو زمین کی مٹی سے پیدا فرمایا اور ان کی ناک میں ایک خاص زندگی کی جان پھونکی تو آدم زندہ جان ہو گئے۔

۳۔ حدیث میں اس کا ذکر اس طرح آیا ہے :۔

إنّ الله خلق آدم من قبضة قبضها من جميع الارض فجاء بنو آدم على قدر الارض منهم الاحمر والابيض والاسود وبين ذالك والسهل والحزن والخبيث والطيب (ترمذی)

اللہ تعالیٰ نے ساری زمین سے تھوڑی تھوڑی کر کے ایک مٹھی مٹی لے کر اس سے آدم کو پیدا کیا اسی لئے آدمی زمین کی قسموں کی طرح مختلف قسم کے ہوئے کوئی سرخ، کوئی سپید، کوئی کالا، کوئی ان کے درمیان کوئی نرم مزاج کوئی سخت مزاج، کوئی گندا، کوئی ستھرا۔

۴۔ صاحب جلالین لکھتے ہیں :۔ (ص ۶۹۵ مجتبائی)

فخلق تعالیٰ آدم من اديم الارض .... وعجنت بالمياه المختلفة وسواه ونفخ فيه الروح فصار حيوانا حساسًا بعد ان كان جمادًا

تو (فرشتوں کے دعویٰ کو مٹانے کے لئے) اللہ تعالیٰ نے آدم کو ادیم زمین یعنی سطح زمین سے (ہر طرح کی مٹی لے کر) اس طرح پیدا کیا کہ اس مٹی کو مختلف پانیوں میں سانا گیا اور پھر اس نے پتلا بنایا اور اس میں روح پھونکی تو اب وہ ایک حساس جان دار بن گئے حالانکہ پہلے جماد تھے۔

اوپر کی تمام عبارتوں کا خلاصہ ہوا کہ چوں کہ خدا آدم کو اپنا خلیفہ بنانا چاہتا تھا اس لئے اس نے انسان کو اپنے دونوں دستہائے قدرت یعنی پوری عنایت اور خاص اہتمام سے پیدا کیا اور مختلف مٹیوں اور مختلف پانیوں سے سان کر کیچڑ یا گارے کی شکل میں کچھ عرصہ تک رہنے دیا یہاں تک کہ وہ سڑ کر بدبو کرنے لگا پھر یا تو اسی سڑے گلے گیلے گارے سے پہلے انسان کا پتلا نہایت اعتدال اور بہترین سانچے میں بنا لیا پھر اس پتلے کو سوکھنے کے لئے چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ خشک ہو کر ٹھیکرے کی طرح کھن کھن بجنے لگا اور یا اس سڑے اور گیلے گارے کو پہلے ہی سکھلا لیا اور جب وہ ٹھیکرے کی طرح بجنے لگا تب اُس سے انسانی پتلا بنایا۔ [میرا خیال ہے کہ اس قادر مطلق کی قدرت عجیبہ کے لئے جس نے حوا کی تخلیق پسلی کی ٹھوس ہڈی سے کی یہی زیب دیتا ہے کہ اس نے سوکھے

گارے سے پُتلا بنایا ہو جو کسی سے نہیں ہو سکتا۔ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ

بہرحال اب تک تو آدم مرتبہ جمادمیں تھے اس کے بعد اللہ نے اس پتلے کے اندر وہ قوی اور بہتر روح پھونکی جو دوسری مخلوقات سے یقیناً اسی طرح الگ اور ممتاز تھی جس طرح اس کا سانچہ "احسن تقویم" تھا اور یقیناً خلیفہ خداوندی کے لئے کنول کے پھول یا پانی کے مینڈک یا درختوں کے لنگور اور بندر کی پست روحیں کسی طرح موزوں بھی نہ تھیں۔ پس انسان سب سے الگ ایک مستقل نوع کی مخلوق ہے اگر اللہ تعالیٰ نے اس مخلوق کی تخلیق اس عام اندازِ تخلیق سے نہیں کی جو اس نے آسمان و زمین جیسی عظیم و جسیم مخلوق کے لئے برتی کہ ایک لفظ "کن" کہا اور وہ بن گئیں بلکہ اس کی تخلیق میں کوئی ایسا ہی نیا اور خصوصی انداز اختیار کیا گیا جس کی تعبیر "خلقتُ بِيَدَيَّ" جیسی شاندار طرزِ بیان سے ہی ہو سکتی تھی تو یقیناً اسے شکل وصورت سے لے کر اخلاق و روحانیت کی بلندی و پاکیزگی اور صفائی تک میں بھی ان سب سے ممتاز ہونا چاہئے۔

مفسرِ حقانی ؒ نے آیت "اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ" کی تفسیر میں چند جملے اس خلیفۂ الٰہی (آدم) کی تخلیق کے متعلق کتنے اچھے اور کتنے سچے لکھے ہیں جو ہمارے مضمون کے اس مقام کے لئے نہایت موزوں ہیں ذرا سنئے:۔

"یہ نظام عالم اس بات کا مقتضی تھا کہ اس میں ایک شخص ایسا بھی ہو جو تمام عالم کا مجموعہ بن کر اللہ تعالیٰ کی جمیع صفات کا مظہر اور اس کے جمال باکمال کا کامل آئینہ صافی ہو جائے پس وہ آدم ؑ ہیں اسی لئے صحیح بخاری میں ایک حدیث آئی ہے کہ "اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ" اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا صورت سے مراد سیرت ہے .... (تین سطر بعد) .... پس اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آدم میں ہر طرح کی قوتیں ودیعت رکھی ہے قوتِ ادراکیہ۔ قوتِ غضبیہ۔ قوتِ رحمانیہ اور ان قوی کی ترکیب اور ان کی اصلاح سے اس میں وہ صفات پیدا ہوئے کہ نہ آسمان و زمین کو حاصل ہیں نہ جن کو نہ فرشتہ کو .... (۲ سطر بعد) .... ملائکہ نے صرف قوت غضبیہ شہوانیہ پر نظر کر کے بارگاہ کبریائی میں عرض کیا تھا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا چونکہ اس مجموعہ خوبی و گلدستہ محبوبی کے اسرار

کی انھیں خبر نہ تھی جواب ملا کہ تم نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں "۔ حقانی ج ۲ صہ ۱۱۰ و ۱۱۱

پس انسان جو صفاتِ خداوندی کا اعلیٰ ترین مظہر ہے دراصل اپنے مجموعہ خوبی و گلدستہ محبوبی ہونے ہی کی بدولت " عالمِ اصغر " کا درجہ رکھتا ہے کلاک ٹاور (گھنٹہ گھر) کو دیکھئے کہ نہایت نازک رسٹ واچ میں بھی وہ تمام پرزے موجود ہوتے ہیں جو گھنٹہ گھر میں ہوتے ہیں اور یہ اس کے صنّاع کی قدرت کی بہت بڑی علامت اور دلیل ہے کہ اس نے کمال کاریگری سے چھوٹی سی " کلائی گھڑی " میں تمام پرزے چھوٹے کر کے بنائے ایسا انسان جسے خلیفہ بنانے کی نیت ہی سے خاص اہتمام سے پیدا کیا گیا اور جو عالمِ اصغر ہے اس کی یہ کتنی بڑی اہانت و تذلیل ہے کہ اس کی اصل مینڈک گندی نالی کے کیڑے یا لنگور و بندر کو بتایا جائے انسان کا صحیح تعارف کراتے ہوئے ایک مصنّف نے کیا خوب بات لکھی ہے :۔

" یہ نظریۂ ارتقا " آج یورپ کا مایۂ ناز نظریہ اور ایک معرکۃ الآرا مسئلہ بنا ہوا ہے اور انھوں نے اس نادر انکشاف کے بل پر اہلِ مذہب کی تحقیر کے ساتھ ان کو تحدی بھی کر دی ہے لیکن ادنیٰ تامل سے نفسیاتی طور پر بھی اس نظریہ کا غلط ہونا معلوم ہو جاتا ہے جب انسان کو یہ باور کرا دیا جائے کہ وہ اپنی اصل میں ان ذلیل حیوانات کا ہم جنس ہے اور بس تو پھر کیوں وہ اپنے کو ذلیل حیوانات کے مقابلہ میں برتر سمجھے گا اور کیوں وہ اخلاق و سیرت کی پاکیزگی انسانی مطمح نظر کی رفعت کا تخیل و تصور کر سکے گا ؟ پھر تو وہ ذلیل حیوانیت ہی کو اپنا [illegible]

یہ تھی آدم و بنی آدم کے شرف و تکریم کی پہلی وجہ جسے ذرا تفصیل سے اس لئے لکھ دیا گیا ہے کہ اذہان اگر اپنی حقیقتِ رفیعہ اور اپنی اصلیتِ عالیہ سے ممتاز و واقف نہوں گے تو نہ خود اپنی قدر کر سکیں گے نہ خدا کی قدر پہچان سکیں گے اور پھر اس کی بھی امید نہیں کہ وہ اپنے شرف و تکریم کی دوسرے وجوہ کو بھی صحیح طور پر سمجھ سکیں گے ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج تا ثریا می رود دیوار کج

شرفِ دوم۔ مسجودیتِ ملائکہ بار اول

خدا تعالیٰ نے جب اپنے خلیفہ انسانِ اول ابو البشر حضرت سیدنا آدم علیہ السلام کو پیدا

فرمانا چاہا تھا تو پہلے ہی سے اس وقت کی موجودہ مخلوق ملائکہ وجن کو اس ارادہ کی اطلاع بھی دے دی تھی کہ

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (بقرہ - ۴)	ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب (اور اپنے احکامِ شرعیہ کے اجرا و نفاذ کی خدمت اس کے سپرد کر دوں گا) بیان القرآن ج ا ص ۱۸

مقصد اللہ تعالیٰ کا یہ تھا کہ اب تک کی تمام مخلوقات تو عام درجہ کی مخلوق تھیں مگر اب میں ایک خاص مخلوق پیدا کرنے والا ہوں جو مخلوق بھی ہوگا مگر خالق کا نائب بھی ہوگا وہ گو بندہ بھی ہوگا مگر ساری مخلوقات پر افسر اور متصرف بھی ہوگا وہ خدا تو نہ ہوگا مگر میری بخشی ہوئی صلاحیتوں سے سب پر حکومت کرے گا وہ رہے گا بشر تو گو باشر بھی ہوگا لیکن بے شر بھی ثابت ہوگا اور یہ سب میری عطا کی ہوئی صلاحیتوں اور پیدا کی ہوئی صنعتوں کی وجہ سے ہوگا اس لئے ضروری ہے کہ اس کی پیدائش کے موقع پر بھی مخلوقات کی دو اہم انواع یعنی ملائکہ اور جن کو تمام کائنات کا نمائندہ مان کر اس کی کوئی خاص تعظیم و تکریم کرا دی جائے اور پھر اعطائے خلافت کے وقت بھی اس کی تکریم کرا دی جائے گی اس لئے یہ حکم نافذ کیا گیا کہ

فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سَاجِدِیْنَ (حجر - ۳)	سو جب اس کو (یعنی اس کے اعضائے جسمانیہ کو) پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی (طرف سے) جان ڈال دوں تو تم سب اس کے روبرو سجدہ میں گر پڑنا۔ (بیان القرآن ج ۶ ص ۲۶)

چنانچہ جیسے ہی اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص کاریگری اور خاص اندازِ تخلیق سے آدم کا پتلا بنایا اور اس کے اندر زیادہ طاقت والی اور خاص صلاحیتوں والی روح پھونکی تو حسب حکم دونوں جماعتوں نے سجدہ کیا البتہ جنوں میں سے صرف ابلیس عزازیل نے غرور میں آکر سجدہ سے انکار کر دیا یہاں دو باتیں ناظرین کے دل میں بے چینی پیدا کر رہی ہوں گی۔

(الف) جنوں کو حکم سجدہ تھا یا نہیں تو اس کے متعلق تفسیر بیضاوی (طبع نظامی دہلی) صفحہ ۶۲ پر مختلف اقوال کے ساتھ جو ایک قول یہ ہے اسے غور سے مطالعہ کیجئے:-

او الجن ایضا کانوا مامورین مع الملائکۃ لکنہ استغنی بذکر الملائکۃ عن ذکرھم فانہ اذا علم ان الاکابر مامورون بالتذلل لاحد والتوسل بہ علم ان الاصاغر ایضا مامورون بہ انتہی

یا جن بھی فرشتوں کے ساتھ حکم سجدہ میں شامل تھے لیکن فرشتوں کا نام لے دینے کے بعد جنوں کا نام لینے کی ضرورت اس لئے نہیں سمجھی گئی کہ جب یہ سنا دیا گیا کہ بڑے بڑوں کو کسی کے سامنے غلامی کا اقرار کرنے اور اس کو وسیلہ قرب بنانے کا حکم دیا گیا ہے تو یہ بھی از خود سمجھ میں آگیا کہ چھوٹے درجہ کے لوگوں کو بھی سجدہ کا حکم ہے۔

(ب) "غیر خالق کو سجدہ درست ہے یا نہیں" تو اس کے بارے میں بیضاوی ہی میں صفحہ ۶۳ پر یہ سنئے:-

والمامور بہ اما المعنی الشرعی فالمسجود لہ فی الحقیقۃ ھو اللہ تعالیٰ وجعل آدم قبلۃ سجودھم تفخیما لشانہ . . . . واما المعنی اللغوی وھو التواضع لآدم تحیۃ وتعظیما لہ کسجود اخوۃ یوسف لہ" . . انتہی

جس سجدہ کا حکم تھا وہ یا تو شرعی سجدہ (تعبدی) تھا اس صورت میں فی الحقیقت سجدہ اللہ تعالیٰ کو تھا اور آدم کو ملائکہ کے سجدہ کا محض قبلہ اور رخ بنایا گیا تھا تاکہ ان کی شان بڑی معلوم ہو . . . . . اور یا سجدہ سے مراد صرف سجدہ لغوی ہے یعنی (سجدہ تحیت اور) آدم کے سامنے جھک جانا ان کو سلامی دینے اور ان کی عظمت کرنے کے لئے جیسے برادران یوسف نے یوسف کو سلامی دی تھی۔

پس دو بڑی مخلوق کو اس کے سامنے تعظیم میں جھکوا کر گویا ساری مخلوقات کو جھکا دیا اور بتا دیا کہ تم سب کا درجہ اس سے کم ہے۔ اور یہ تم سب کا جامع ہے۔ یہ شرف اعطائے خلافت

نہ تھا صرف اس کی خبر دینے کے لئے تھا کہ اس کو ہم تمہارا حاکم بنائیں گے لیکن چوں کہ اس وقت پیدا ہوا ہے اس لئے اس وقت بھی تم اس کی سلامی دے دو۔ یہ دوسرا شرف تھا جو حق تعالیٰ نے آدم و بنی آدم کو دیا۔

شرفِ سوم۔ عرضِ امانت و تمہیدِ خلافت

ادبیات اردو و فارسی سے واقف شخص شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے بلبل شیراز کا یہ غیر فانی زمزمہ نہ سنا ہو ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید　　قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کبھی ہم نے شاعری یا افراطِ عقیدتمندی سے الگ ہو کر اس امانت کی حقیقت بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے؟ آیئے میں اپنے علم و مطالعہ کا نچوڑ اس وقت آپ کے سامنے پیش کروں۔ یہ لفظ قرآنِ پاک کی سورۂ احزاب میں اس طرح آیا ہے :-

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ (احزاب ۹)	ہم نے اس امانت کو (پہلے تو) آسمانوں اور زمین کے اور پہاڑ کے سامنے بھی پیش کیا (کہ لو تم اس کو قبول اور اس کے حق کو ادا کرو) تو ان سب نے اس بھاری بوجھ کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان تھا کہ جھٹ پٹ اس نے (اس بارِ امانت) کو اٹھا لیا۔

اس امانت کے متعلق تفاسیر میں یہ ہے :-

۱- موضح القرآن شاہ عبدالقادر میں ہے "امانت سے بعضوں نے اشارہ نماز، روزہ حج اور زکوٰۃ کا کیا ہے اور بعضے کچھ اور سمجھے ہیں ص ۲۷۲

۲- ابن کثیر ج ۳ ص ۵۲۲ میں اس کی شرح سے متعلق بہت سے اقوال ہیں اس میں جہاں ایک قول یہ ہے کہ :-

مالك عن زيد بن اسلم قال الامانة ثلاثة الصلوة والصوم والاغتسال من الجنابة

زید بن اسلم سے مالک نے یہ شرح نقل کی ہے کہ امانت سے مراد تین چیزیں ہیں نماز روزہ اور ناپاکی کے بعد غسل۔

وہیں حسب ذیل دو اقوال بھی لکھے ہیں :-

(الف) "إِنَّ الامانة هى الفرائض" یعنی امانت سے مراد جملہ فرائض خداوندی ہیں اور یہ قول مجاہد۔ سعید۔ ضحاک۔ حسن بصری کا ہے لیکن میرے نزدیک سب سے زیادہ جامع قول حضرت قتادہ کا ہے جو یہ فرماتے ہیں " الامانة الدين والفرائض والحدود " یعنی امانت سے مراد تمام ہی دین ہے جو جملہ فرائض و حدود کو شامل ہے۔

۳۔ بیان القرآن از مفسر تھانوی ج ۹ صفحہ میں ہے " ہم نے یہ امانت (یعنی احکام جو بمنزلہ امانت کے ہیں آسمانوں اور زمینوں اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی (... بصورت ماننے کے اس پر انعام و اکرام اور بصورت نہ ماننے کے اس پر تعذیب و ایلام ..... پیش کر کے ان کو لینے نہ لینے کا اختیار دیا ......) اور (جب ان سموات وارض وجبال کے بعد انسان کو پیدا کر کے اس سے یہی بات پوچھی گئی تو انسان نے بوجہ اس کے کہ علم الٰہی میں اس کا خلیفہ ہونا مقرر تھا) اس کو اپنے ذمہ لے لیا (غالباً اس وقت تک اس میں بھی اتنا ہی ضرورت کے قدر شعور ہو گا اور غالباً یہ پیش کرنا اخذ میثاق سے مقدم ہے۔ اور وہ میثاق اس حمل کی فرع ہے۔

پھر نیچے فوائد کے تحت میں لکھتے ہیں " احکام کو امانت سے تشبیہ دینا بنا بر وجوب اور اس کے حقوق کے ہے اور تعذیب و رحمت کا انجام حمل ہونا بواسطہ اضاعت و اطاعت کے ہے اور اس آیت کی جو تفسیر اختیار کی گئی ہے اس پر کلام حقیقت پر محمول ہو کر بھی تمام اشکالات نقلیہ و عقلیہ سے بفضلہ تعالیٰ محفوظ ہے ولله الحمد "

۴۔ جلالین میں بھی مراد امانت سے نمازیں ہیں۔

۵۔ جامع البیان میں اس سے طاعت و فرائض مراد ہیں۔

۶۔ عبداللہ یوسف علی نے اس سے مراد ٹرسٹ (TRUST) لیا ہے جس کا مفہوم ہے ایسا کام جو اعتماد اور وثوق کی بناء پر کسی کے سپرد کیا جائے۔

۷۔ مفسر حقانی نے ج ۶ ص ۱۰۹ پر ترجمہ میں تو امانت ہی کا لفظ رکھا ہے۔ لیکن تفسیر میں کئی اقوال لکھ کر اپنی رائے یہ لکھی ہے "..... وہ امانت یہی دردِ دل ہے" [اس سے میرے خیال میں اسلام کا درجہ احسان مراد ہے]

۸۔ مسندِ امام اعظم کی شرح از ملا علی قاری میں ص ۲۰۹ پر حدیث ۳۹۱ کے ذیل میں حضرت ابوذر کی ایک حدیثِ مرفوع لکھی ہے "الامرة امانة" حکومت (سلطنت و امارت) بھی ایک امانت ہے۔

پھر لکھتے ہیں :-

قال الشارح لعل هذا هو المعنى لقوله تعالى انا عرضنا الامانة الاية ويؤيده قوله عليه الصلوة والسلام كلكم راع الحديث	شارح کہتے ہیں کہ شاید آیت اِنا عرضنا الامانة میں امانت کے یہی معنی ہوں اور اس کی تائید حضور کے اس فرمان سے بھی ہوتی ہے کہ فرمایا "تم میں سے ہر ایک راعی اور بادشاہ ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت (بیوی۔ اولاد۔ نوکر) کے بارہ میں بازپرس ہوگی"

اوپر کی عبارتیں منشائے خداوندی سمجھا دینے کے لئے کافی ہیں اور ان مفسرین کرام نے جہاں اپنی طرف سے بھی تشریح فرمائی ہے وہ بھی نہایت خوب و صحیح ہے اور امام اعظمؒ کی حدیث نے تو حکومت کو امانة کہا یا اس کے مفہوم میں داخل بتایا ہے۔

تحدیث بالنعمة کے طور پر یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اس حقیر نے امانت کی تفسیر اور شرح خود قرآن پاک ہی سے نکالی ہے کہ "القرآن یفسر بعضہ بعضا" مشہور اور صحیح مقولہ ہے فی الواقع قرآن کے ہر لفظ ہر عقیدہ ہر حکم کی تفسیر خود قرآن ہی میں، دوسری جگہ ضرور موجود

ہوتی ہے یہ دوسری بات ہے کہ ہماری کم نگاہی اور قرآن سے کم تعلقی ہم کو نہ معلوم ہونے دے "نصرف الآیات" کی ایک توجیہ یہ بھی ہے سورۃ نساء رکوع ۸ میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں:-

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا (اے اہلِ حکومت ....) بے شک تم کو اللہ تعالیٰ اس بات کا حکم دیتے ہیں کہ اہل حقوق کو ان کے حقوق (جو تمہارے ذمہ ہیں) پہنچا دیا کرو (بیان القرآن ج۲ صفحہ ۱۲۶)

دیکھئے یہاں امانت ہی کا لفظ بولا گیا ہے اور حقوق کے لئے بولا گیا ہے اور حقوق تین قسم کے ہیں - حق النفس، حق اللہ، حق العباد، انھیں کے ادا کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے اور اوپر جو مفسرین کے اقوال نماز - فرائض - حکومت - اطاعت - حدود وغیرہ آئے ہیں وہ انھیں کی تعبیرات ہیں۔

اب علماء کے اقوال سے تابعین و صحابہ کے اقوال سے حدیث نبوی سے بلکہ خود قرآن سے یہ معلوم اور متعین ہو گیا کہ امانت سے مراد حقوق مختلفہ کا علم صحیح - ان کے ادا کرنے کا سلیقہ و طریقہ ارادہ اور حوصلہ آدم اور صرف آدم ہی کو دیا گیا - اس کی صلاحیت نہ پہاڑ اور آسمان و زمین جیسی عظیم و جسیم مخلوقات میں تھی اور نہ ملائکہ جیسی مقدس مخلوق میں - وکفی بہ فخرا

شرفِ چہارم - تعلیمِ اسماء و نصبِ خلافت

تمہید - عرض امانت کے تحت میں مفسر تھانوی کا یہ جملہ غالباً ذہنوں میں محفوظ ہو گا کہ "غالباً اس وقت تک اس (انسان) میں اتنا ہی ضرورت کے بقدر "شعور ہو گا" اس کا مطلب یہ ہے کہ امانت تو اس وقت ادا ہو سکتی ہے جب اس کا صحیح علم اور اس کے وسائل جمع ہوں آدم نے ذمہ داری تو ادائے امانت کی اپنے سر لے لی مگر نہ انھیں اس کی خبر تھی کہ اس خدمتِ عظیم کے لئے میدان کہاں اور مادہ کون ہے یہ نہ معلوم تھا کہ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے آلات و وسائل کیا ہیں ایسی صورت میں عقل کی بات تو یہی تھی کہ زمین آسمان پہاڑ کی طرح آدم بھی اس کی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیتے اور مڑ جاتے مگر وہ بقول

مفسر حقانی مختلف قویٰ اور ان کی ترکیب وتدبیر سے ایک خاص مزاج کے مالک بھی تھے جسے "چاشنیٔ عشق ومحبت" کہنا چاہئے بس اسی کے باعث وہ چپ نہ رہ سکے وہ جوشِ عشق میں اسے برداشت نہ کر سکے کہ حاکم حقیقی جو محبوب بھی ہے وہ ایک امتحانِ وفا اور آزمائشِ محبت کے لئے ایک چیز پیش کرے اور دوسروں کی طرح میں بھی چپ رہوں یا انکار کردوں رقیب اگر "اتینا طائعین" کے بعد بھی عین موقع پر جھجک ظاہر کر رہے ہیں تو کریں اگر کوئی دوسرا مردِ میدان بن کر نہیں نکلتا تو نہ سہی مگر میں کیوں چپ رہوں چنانچہ باوجود جسم میں صغیر ہونے اور وسائل وآلات یا علوم کے نہ ہونے کے خود آگے بڑھے اور پکار اٹھے ؎

چو بعد خاک شدن بازیاں بود یا سود به نقد خاک شوم بنگرم چه خواهد بود

اسی مضمون میں میرے ایک دوست کا شعر ہے جو میرے خیال میں بہت بلند شعر ہے ؎

ڈر گئے ارض وسما بارِ امانت سے مگر مجھ سے دیکھا نہ گیا "حکم" کا رسوا ہونا

یہ چیز عقل کے نزدیک ظلم وجہل سہی مگر مزاجِ عشق کو انجام بینی سے کچھ بیر سا ہے وہ بعض وقت حسن وجمال کی برہمی اور سیاست معلوم کرنے کے بعد بھی مزاجِ حسن کے کچھ مخفی اشارات پا جاتا ہے اور اس کے مقتضا پر عمل کرنے کے لئے "ناکردنی" کام بھی کر گذرتا ہے میدانِ وفا سے بیٹھ پھیرنا اس کی ملت میں کفر ہے اس زبانِ محبوب سے ظلوم وجہول وغیرہ کے لذیذ طعنے سننے ہی میں کچھ مزا آتا ہے ؎

بے دھڑک کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق عقل تھی محو تماشائے لبِ بام ابھی

اس لئے یہ ذمہ داری آدم علیہ السلام نے بے سوچے سمجھے اپنے سر لے لی۔ پھر اس عاشق دیوانہ کی ذرا سر بلندی اور اکرام بھی دیکھئے :-

جب آدمؑ نے اس بارِ عظیم کے اٹھانے کی ہمت کر ڈالی اور امتحانِ وفا میں پورے اترے تو قدرتِ حق نے انھیں امانت یا خلافت کے انصرام کے لئے ضروری تعلیم کا نصاب پڑھانا شروع فرمایا۔ بلا نیتِ تشبیہ جس طرح سول سروس کے مناصب پر کوئی شخص اس وقت تک نہیں

بھیجا جاتا جب تک وہ اس کا کورس نہ پڑھ لے اور اس میں امتحان نہ ہو اور وہ اس میں کامیاب نہ ہو اسی طرح آدمؑ کو بھی "تعلیم اسمار" کا نصاب جو حق تعٰی نے مرتب فرمایا تھا سب پڑھایا اور پھر ساری کائنات کے سامنے اس میں ان کا امتحان بھی لیا گیا جس میں وہ کامیاب ہوئے اس پر ان کو فراغِ تحصیل کی سند عطا کی گئی اور دستار فضیلت ان کے سر باندھی گئی نصب خلافت اور سلامی کی رسمیں ادا کی گئیں شرفِ آدم کی چوتھی وجہ اور پانچویں اسی اجمال کی تفصیلات ہیں۔

چونکہ آدمؑ کو ساری کائنات پر خلافتِ ربانی عطا ہونی تھی اس لئے سچ پوچھئے تو اس کے بڑے زبردست نصاب کے پڑھنے اور ان پر عبور حاصل کرنے کی ضرورت تھی یہ کام مشکل اور دیر طلب ضرور تھا مگر حق تعٰی کو سب آسان تھا حق تعٰی نے آدمؑ کو تمام چیزوں کی شکل وصورت دکھائی اور ان کے قلب میں ان کے نام ان کے خواص القاء ور اسخ کرنے شروع کئے۔ باقی آئندہ

تفسیر مظہری

علمار طلبا اور عربی مدرسوں کے لئے شاندار تحفہ

مختلف خصوصیتوں کے لحاظ سے "تفسیرِ مظہری" تفسیر کی تمام کتابوں میں بہترین سمجھی گئی ہے بلکہ بعض حیثیتوں سے اپنی مثال نہیں رکھتی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس عظیم الشان تفسیر کے بعد کسی تفسیر کی ضرورت نہیں رہتی۔ امام وقت قاضی ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کمالات کا یہ عجیب وغریب نمونہ ہے۔

اس بے مثال کتاب کا پورے ملک میں ایک قلمی نسخہ بھی دستیاب ہونا دشوار تھا۔ شکر ہے کہ برسوں کی جدوجہد کے بعد آج ہم اس لائق ہیں کہ اس متبرک کتاب کے شایع ہونے کا اعلان کرسکیں تقریباً تمام جلدیں زیورِ طبع سے آراستہ ہوچکی ہیں۔

ہدیہ غیر مجلد! ۔ جلد اول سات روپے۔ جلد ثانی سات روپے۔ جلد ثالث آٹھ روپے۔ جلد رابع پانچ روپے۔ جلد خامس سات روپے۔ جلد سادس آٹھ روپے۔ جلد سابع آٹھ روپے۔ جلد ثامن آٹھ روپے۔ جلد تاسع پانچ روپے۔ جلد عاشر پانچ روپے

ہدیہ کامل دس جلد اڑسٹھ روپے۔ رعایتی ساٹھ روپے۔

صرف تاریخ کی روشنی میں

حضرت عثمان رضؓ کا سب سے پہلا امتحان

از
ڈاکٹر طٰہٰ حسین
مترجم
(جناب مولانا عبدالحمید صاحب نعمانی)

سب سے پہلا مقدمہ جو حضرت عثمانؓ کے سامنے خلافت کے پہلے ہی دن پیش ہوا وہ عبیداللہ بن عمرؓ کا مقدمہ تھا، جنہوں نے پہلے ہرمزان، پھر جُفینہ اور اس کے بعد ابولولو کی لڑکی کو قتل کر دیا تھا یہ خونی مقدمہ درحقیقت مسلمانوں کی بڑی سخت آزمائش تھی۔ ابولولو حضرت عمرؓ کا قاتل ہے اس نے فاروق اعظم کو جب کہ وہ نماز کے لئے آگے بڑھ رہے تھے دو نوک والے ایک خنجر سے زخمی کر دیا۔ لوگ قاتل پر ٹوٹ پڑے لیکن اس نے سوال و جواب سے پہلے ہی اپنے آپ کو ہلاک کر دیا بعض لوگوں کا بیان ہے کہ انھوں نے ابولولو، ہرمزان (مسلمان) اور جفینہ (عیسائی) تینوں کو ایک جگہ بیٹھے کانا پھوسی کرتے دیکھا تھا، ان کے ہاتھ میں یہی خنجر تھا جسے وہ الٹ پلٹ کر رہے تھے، اور جب وہ ان کے پاس پہنچے تو سب کے سب کھڑے ہو گئے اور خنجر ان کے ہاتھ سے نیچے گر گیا۔ پھر جب حضرت عمرؓ کا انتقال ہو گیا تو عبیداللہ بن عمر ننگی تلوار لئے نکلے اور ہرمزان تک پہنچ کر اس کو قتل کر دیا۔ راویوں کا بیان ہے کہ عبیداللہ بن عمر نے جب دیکھا کہ تلوار کی کاٹ اپنا کام کر چکی تو کہا لا الٰہ الا اللہ، اور اس کے بعد وہ جفینہ کے پاس پہنچے اور اس کو قتل کر دیا راوی کہتے ہیں کہ عبیداللہ بن عمرؓ نے جب دیکھا کہ جفینہ مر چکا ہے تو اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان تلوار سے صلیب

کی شکل بنا دی پھر ابو لؤلؤ کے گھر پہونچے اور اس کی لڑکی کا خاتمہ کر دیا حضرت صہیبؓ نے جو اس وقت نماز پڑھانے کی خدمت پر مامور تھے خبر پاکر لوگوں کو بھیجا کہ وہ عبید اللہ بن عمر کو مسلمانوں کے قتل سے روکیں چنانچہ سعد بن ابی وقاص پہنچے اور انھیں قابو میں کر لیا پھر جب تک ان کے ہاتھ سے تلوار نہیں لے لیا ساتھ ہی رہے، اس کے بعد وہ مقید کر لئے گئے تاکہ خلیفہ ان کے بارے میں فیصلہ کریں۔

بیعت کے معاملہ سے فرصت پاتے ہی حضرت عثمانؓ نے ان مسلمانوں سے جو عبید اللہ بن عمر کے سلسلے میں آپ کے پاس آئے تھے، مشورہ کیا، عبید اللہ نے خود ہی انتقام لیا اور ڈھیلی بلا دلیل، انھوں نے ناحق ایک مسلمان اور دو ذمیوں کو قتل کر دیا فقہا اور اہل بصیرت نے جن میں خود حضرت علیؓ بھی شامل ہیں عبید اللہ سے قصاص لینے کا خیال ظاہر کیا۔ اس لئے کہ انھوں نے کھلم کھلا اللہ کے ٹھہرائے ہوئے حدود سے تجاوز کیا، لیکن بہت سے مسلمانوں نے یہ کہہ کر کہ "کل تو حضرت عمرؓ کو شہید کیا گیا اور آج ان کا بیٹا مارا جائے؟" مخالفت میں اپنی رائے کا اظہار کیا، کہتے ہیں کہ عمرو بن العاص نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ میاں اللہ نے آپ کو اس قضیہ سے بچا لیا جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، اب آپ اس میں مداخلت نہ کیجئے۔

اس مقدمہ میں حضرت عثمانؓ نے کیا فیصلہ کیا؟ اس میں راویوں کا اتفاق نہیں ہے، کوئی کہتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے قصاص کا فیصلہ کیا اور عبید اللہ کو ہرمزان کے لڑکے کے حوالے کر دیا کہ وہ ان سے باپ کے خون کا بدلہ لے لے، لیکن مورخین کی اکثریت کا خیال ہے کہ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ میں "ہرمزان اور دوسرے مقتولین کا ولی ہوں میں قاتل کو معاف کرتا ہوں اور بیت المال میں رکھے ہوئے اپنے مال سے خوں بہا ادا کرتا ہوں" حضرت عثمانؓ کی افتاد طبع کے پیش نظر یہی خیال ان کی سیرت سے میل کھاتا ہے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی خلافت کا آغاز ایک نوجوان قریشی یعنی فاروق اعظم کے ایک بیٹے کے خون سے ہو، لیکن وہ ایک مسلمان اور دو ذمیوں کے خون سے بھی چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے اسی لئے انھوں نے ایک

طرف عبید اللہ بن عمرؓ کو قتل ہونے سے بچا لیا اور دوسری طرف اپنے مال سے مقتولین کو معاوضہ دے دیا۔ یہ فیصلہ، اگر لوگ معاملے کو صرف سیاسی عینک سے دیکھنا چاہیں ایک مدبرانہ سیاست تھی، اس میں ان حضرات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے جو عام طور پر کہا کرتے تھے کہ کل تو حضرت عمرؓ کو شہید کیا گیا اور آج ان کا بیٹا قتل کیا جائے، اگر حضرت عثمانؓ یہ منظور فرما لیتے کہ عبید اللہؓ کو قصاص میں قتل کر دیا جائے تو عام طور سے بنی عدی کے لوگوں اور خاص طور پر خطاب کے خاندان والوں کے دل آپ کی طرف سے پھر جاتے یہی نہیں بلکہ سارے قریش اور غیر قریش کے لوگ بھی آپ سے برداشتہ خاطر ہو جاتے اور اگر وہ عبید اللہ کو معاف کر دیتے اور مقتولین کی دیت ادا نہ کی جاتی تو اس سے بد نظمی اور بے عنوانی کا ایک ایسا دروازہ کھلتا جس کو بند نہیں کیا جا سکتا تھا۔

لیکن یہ حادثہ محض سیاسی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ اس کی ایک مذہبی حیثیت بھی تھی جو سیاست پر مقدم تھی، خلیفہ کو معاف کر دینے اور در گذر کرنے کے حقوق حاصل ہیں لیکن اس میں یہ شرط بھی ہے کہ اس کی معافی اور در گذر دین کے حدود میں سے کسی حد کو معطل کر دینے کا باعث نہ ہو۔

یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے متشدد مسلمان حضرت عثمانؓ کے فیصلے سے خوش نہیں تھے، چنانچہ انصار میں ایسے لوگ تھے جو عبید اللہ کو ہرمزان کے قتل کی یاد دلاتے رہتے تھے اور دھمکی دیا کرتے تھے کہ وہ اس کا بدلہ ضرور لیں گے، زیاد بن لبید بیاضی جب کبھی راستے میں عبید اللہ کو مل جاتا۔ کہتا

الا یا عبید اللہ مالک مھرب	
ولا ملجاء من ابن اروی ولا خصن	عبید اللہ تم بچ نہیں سکتے حضرت عثمانؓ کی پناہ
اصبت دما واللہ فی غیر حلہ	بھی کام نہ آئے گی ہرمزان کا خون ضرور رنگ لائے گا
حراما وقتل الھرمزان لہ خطر	

زیادہ کی طرف سے جب یہ زیادتی حد سے بڑھ گئی تو عبیداللہ نے حضرت عثمانؓ سے اس کی شکایت کی حضرت عثمانؓ نے زیادہ کو بلایا اور سختی سے منع کیا لیکن اس نے ایک نہ سنی بلکہ خود حضرت عثمانؓ کو خطاب کرتے ہوئے حسب ذیل اشعار کہے۔

ابا عمرو عبید اللہ رھن	ابو عمرو عبیداللہ ہرمزان کے قتل میں ماخوذ
فلا تشکک بقتل الھرمزان	ہے اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔
فانک ان عفرت الجرم عنہ	اگر تم اس کا یہ سنگین جرم معاف کر دو گے
واسباب الخطا فرسا دھان	تو تمہارا یہ فعل سخت نامناسب ہوگا۔
لتعفوا اذ عفوت بغیر حق	تمہارے لئے یہ ممکن نہیں کہ اس کے خون سے
فما لک بالذی تحکی یدان	رنگے ہاتھوں کو نظر انداز کر دو۔

پھر تو حضرت عثمانؓ کو غصہ آگیا اور آپ نے سخت سرزنش کی اور پھر زیاد اپنی حرکت سے باز آگیا، بہرحال مسلمانوں کی ایک جماعت حضرت عثمانؓ کے اس فیصلے سے خوش نہ تھی اور کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ کا تعلق اسی جماعت سے تھا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر عبیداللہ کو حضرت علیؓ اپنے زمانہ خلافت میں پا جاتے تو ان پر قصاص کی حد یقیناً جاری کرتے، لیکن وہ تو صفین کے معرکے میں کام آ چکے تھے۔ ناراض مسلمانوں کو غصہ اس بات کا تھا کہ حضرت عثمانؓ کا فیصلہ کھلی ہوئی نص قرآنی کی رعایت سے خالی ہے، پھر یہ سخت حرج کی بات ہے کہ عبیداللہ کو خلیفہ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے معاف کر دیا جائے اور اس لئے کہ انھوں نے تو ایک عجمی مسلمان اور دو ذمیوں کا خون کیا ہے، اس معافی سے تو امتیاز اور تفریق کی بو آ رہی ہے، اس میں عبیداللہ عربی اور ہرمزان عجمی میں فرق کیا جا رہا ہے حالانکہ خدا نے مسلمانوں کی عزت و آبرو، ان کے مال و دولت اور خون کی حرمت میں کوئی فرق روا نہیں رکھا خواہ وہ کسی نسل اور قوم کے ہوں اور پھر یہ معافی شبہ پیدا کرتی ہے کہ دین میں ذمیوں کے لئے حرمت اور حقوق کے احکام کے باوجود ان کے خون سے بے اعتنائی برتی جا سکتی ہے اب اگر ایسا ہی ہونے لگے اور خلفاء و ہمسران خلفاء کے صاحبزادوں، بڑے بڑے انصار و مہاجرین کے

فرزندوں کو موقع دے دیا جائے کہ من مانا انتقام لے لیا کریں، دربار خلافت میں اپنے معاملات پیش نہ کریں دلائل سے بھی اپنے کو بے نیاز تصور کریں تو پھر خرابیاں عام اور انصاف لا پتہ ہوگا بد نظمی کا دور دورہ اور دین کے آثار ناپید ہوں گے۔

ہاں تو عرض یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ مسلمانوں کے معاملات کے والی تھے، والی ہونے کی حیثیت سے ان کو اس کا حق تھا کہ وہ معاف کر دیتے اور ہم تو ایک قدم آگے بڑھا کر کہنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے عبید اللہ کو معاف کر کے نہ اللہ کے حدود میں سے کسی حد کو معطل کیا اور نہ ہرمزان اور اس کے دونوں ساتھیوں کے خون سے بے اعتنائی برتی اس لئے کہ اپنے مال سے انھوں نے دیت ادا کر دی، لیکن اس قسم کی معافی دین کے معاملات میں شدت برتنے والوں کو مشتبہ کر دیتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ عبید اللہ کو اس کے جرم کی کوئی سزا نہیں ملی، اپنے مال سے معاوضہ ادا کر کے حضرت عثمانؓ نے وہ سزا خود بھگتی جو عبید اللہ کو برداشت کرنا چاہیئے اگر وہ معاوضے کی رقم عبید اللہ اور ان کے گھر والوں پر عائد کر دیتے اور اس طرح ان کو بچاتے اور معاف کرتے تو بلا شبہ صحیح طور پر حد جاری کرتے اور پھر کسی کو ان کے فیصلے پر مجال گفتگو نہ ہوتی اور اگر خطاب کے گھرانے کے ساتھ نرمی اور سلوک کے تقاضے سے دیت کی رقم اپنے مال سے ادا کر دی تھی تو عبید اللہ کو سزا کے طور پر قید خانہ میں رکھنا تھا کہ وہ اپنے گناہ سے خدا کی جناب میں توبہ کرتے، ناحق خون کرنے پر نادم ہوتے، نیز عہد جاہلی کی کینہ پروری کے ماتحت دربار خلافت کی جس طرح انھوں نے توہین کی اس پر شرمندہ ہوتے۔ اگر حضرت عثمانؓ یہ کرتے تو اس خارزار سے دامن بچا سکتے اور عبید اللہ جیسے قریشی نوجوان کو بتاتے کہ مسلمانوں اور ذمیوں کا خون اللہ کے نزدیک اتنی حرمت کا مالک ہے کہ اسے بغیر حق بہایا نہیں جا سکتا، اس کی عظمت اس سے کہیں بڑھ کر ہے کہ قاتل بلا خوف و خطر زندگی کے دن چین و آرام سے گذارنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے۔

بہر حال حضرت عثمانؓ نے خلافت کا استقبال جس سیاسی مسلک سے کیا اس میں آپ کی تصویر ایک ایسے شخص کی تصویر نظر آتی ہے جو رحم دل اور نرم طبیعت کا ہے، صلح پسند ہے، دلوں میں اور وہ بھی عربوں کے دلوں میں اور خاص طور پر ممتاز مہاجرین اور ان کی اولاد کے دلوں میں جو رنجشیں پنہاں

تھیں ان سے وہ بچنا چاہتا ہے اس سیاست کا لازمی نتیجہ تھا کہ کچھ لوگ اس سے خوش اور کچھ ناراض ہوں اور یہی وجہ تھی کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کا آغاز ایک ایسے ماحول میں ہوا جو شکوک اور اختلافات سے گھرا ہوا تھا اگر حضرت عثمانؓ کی جگہ حضرت عمرؓ ہوتے اور ان کے سامنے کسی نوجوان قریشی کا مقدمہ پیش ہوتا پھر وہ کیسے ہی خاندان کا فرد اور کیسے ہی باپ کا بیٹا ہوتا وہ ایک پختہ کار کی طرح اپنا فرض انجام دیتے ان کو خدا کے حدود جاری کرنے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت متاثر نہیں کر سکتی تھی، بس اس میں کچھ شک نہیں کہ حضرت عثمانؓ کے اس فیصلے نے ان کی خلافت کو حضرت عمرؓ کی خلافت سے جدا کر دیا، اس جدائی کے دامن پر ہم کو نرمی، نرم دلی کے نقوش ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے متعلق رائے قائم کرنے میں عجلت سے کام نہیں لیا اور پھر عجلت کا کیا موقع؟ فاروق اعظم کا جو نقشہ دلوں میں تھا اس کے پیش نظر لوگ عبید اللہ بن عمر کے قضیے سے متعلق خود ہی دو گروہوں میں تقسیم ہو چکے تھے، نبیؐ کا فرمان ہے کہ "شبہات سے حدود کی مدافعت کرو"۔ یعنے شک کا فائدہ مجرم کو ملنا چاہیے، شاید حضرت عثمانؓ نے عبید اللہ ابن عمر کی سزا کا دفاع اس شبہ میں پایا کہ وہ والد کے غم میں مغلوب الغضب ہو چکے تھے، اور خدا نے مسلمانوں کو عفو و درگذر کے لئے غیر معمولی رغبت دی ہے جب کہ وہ قدرت رکھتے ہوں،

حضرت عثمانؓ کے فرمان

موزخین روایت کرتے ہیں کہ عنانِ خلافت سنبھالتے ہی حضرت عثمانؓ نے اپنے عاملوں اور سپہ سالاروں کے نام خط لکھے، بعض خطوط میں عوام کو بھی خطاب کیا ان خطوط سے وہ پالیسی واضح ہو جاتی ہے جس پر حضرت عثمانؓ مسلمانوں کو چلانا چاہتے تھے اور جس پر اپنی خلافت کے ابتدا میں بقول مورخین آپ عمل پیرا رہے، یہ خطوط اس قابل ہیں کہ ان کو پیش کیا جائے اور ان پر غور فکر کے چند لمحات صرف کئے جائیں تا کہ ان کی روشنی میں یہ معلوم کیا جا سکے کہ جو خاکہ آپ نے اپنے لئے تیار کیا تھا اس کی کہاں تک تکمیل ہو سکی،

۲۷ھ ہجری کے واقعات میں طبری نے ان مکتوبات کو نقل کیا ہے جو حضرت عثمانؓ نے اپنے عاملوں کے نام لکھے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں "حمد و صلوٰۃ کے بعد معلوم ہو کہ اللہ نے خلفاء کو حکم دیا ہے کہ وہ محافظ رہیں محصّل نہ بنیں، اس امت کے صدر نشین حفاظت کرنے والے رہے وصول کرنے والے نہیں بنے، تمہارے امام نگرانی اور محافظت سے دور اور تحصیل داری سے قریب ہوتے جارہے ہیں اگر یہی حالت رہی تو حیا، امانت اور وفاداری کا خاتمہ ہو جائے گا، یاد رکھو سب سے زیادہ منصفانہ روش یہ ہے کہ مسلمانوں کے معاملات اور ان کے فرائض پر گہری نظر ڈالو ان کے حقوق پورے کرو اور ان پر جو کچھ واجب ہے اس کا مواخذہ کرو، ذمہ داریوں کو تصویر کے دورخوں میں بانٹ دو ان کا جو کچھ حق ہے انھیں دو، ان پر جو کچھ ہے ان سے لو۔ اور پھر دشمنوں پر غلبہ حاصل کرو لیکن وفا کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔"

یہ مختصر فرمان جو تکلف سے خالی، تصنع سے دور اور زیادتی کے تصور سے بالکل پاک ہے عاملوں کو چار خصلتوں کا حکم دیتا ہے، پہلی خصلت یہ کہ عامل چرواہوں کی طرح محافظ اور نگہبان ہوں، ٹیکس وصول کرنے والے افسر نہ بنیں، مطلب یہ ہے کہ حکومت کرنے سے ان کا مقصد رعایا کے ساتھ ہمدردی اور نرمی کا سلوک ہونا چاہئے نہ کہ حکومت کا خزانہ بھرنا یا حاکموں کی حاجت کا رُخ دولت و ثروت کی طرف پھیر دینا، حضرت عثمانؓ اس خصلت کے پیدا کرنے پر پوری شدت کے ساتھ زور دیتے ہیں "رعاۃ" اور "جباۃ" کے الفاظ کی بار بار تکرار بتاتی ہے کہ آپ کی نگاہ میں اس کی کس قدر اہمیت ہے اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے اس لئے کہ آپ اس بنیادی مقصد کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں جو عربوں کے فتوحات کی طرف متوجہ ہو جانے پر اسلام کے پیش نظر تھا، یعنی اصلاح اور صرف اصلاح اس لئے اسلامی فتح جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بتایا ہے غلبہ اور قبضہ کی فتح نہیں ہے بلکہ اخوت، ہمدردی اور اصلاح کی فتح ہے،

پھر حضرت عثمانؓ اعلان کرتے ہیں کہ اس امت کے امام ابتداءً میں محافظ تھے محصّل نہ تھے اور یہ امام اللہ کے نبیؐ، ابوبکرؓ اور عمرؓ تھے، حضرت عثمانؓ ڈر رہے ہیں کہ اس کے بعد کے امام

محافظ نہ رہ سکیں گے محصل بن جائیں گے اس وقت حیا جاتی رہے گی اس کی جگہ بے حیائی کا
کا دور دورہ ہو گا جس کے نتیجے میں حق پامال کیا جائے گا اور باطل پر اصرار ہو گا، بے غیرتی کی رسوائیاں
گناہوں سے ہم آغوش، اس وقت امانت نہ ہو گی امانت کی جگہ فریب اور مکاری لے گی، جو
خلفا اور رعایا دونوں کے حقوق کا خاتمہ کر دے گی، اس وقت شکوک اور شبہات کا دور ہو گا۔
لوگ ایک دوسرے سے بدگمان ہوں گے، صفائی اور اخلاص کی جگہ معاملات کی بنیاد فریب
کاری اور مکاری پر رکھی جائے گی اس وقت وفا کا سلسلہ ختم ہو کر بدعہدی کا آغاز ہو گا اور لوگ ایک
نہ ختم ہونے والی خرابی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ شرمناک خود غرضی لوگوں میں پھیل جائے گی نہ
کوئی کسی کی عزت کرے گا نہ کسی کے لئے کوئی وقار اور احترام جاہے گا، اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ
سب ہدایتیں وہی ہیں جس کی تلقین نبی کریمؐ، صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظم فرماتے تھے،

دوسری خصلت درحقیقت اس اجمال کی تفصیل ہے جو حضرت عثمانؓ نے عمال کے
فرمان میں کیا ہے، یعنی عام مسلمانوں اور خلفا اور امرا کے تعلقات میں انصاف کی رعایت رکھی جائے
پس ہرگز ہرگز حکومت کو خوش کرنے کے لئے مسلمانوں پر کوئی زیادتی نہیں کرنی چاہئے اسی طرح عام
مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے حکومت پر کوئی زیادتی نہ ہونی چاہئے، جو کچھ مسلمانوں پر واجب ہے
وہ ان سے لیں اور ان کے جو حقوق ہیں انھیں دئے جائیں حکومت ظلم نہ کرے اور صدقات کی وصولی
اور خراج کی تحصیل میں حدود سے متجاوز نہ ہو لوگوں کے کسی معاملے میں بھی جبر اور زبردستی روا نہ رکھی
جائے، ایک ایسا انصاف ہو جو نہ حاکم کے لئے مضر نہ رعایا کے لئے تکلیف دہ،

تیسری خصلت درحقیقت دوسری ہی خصلت ہے البتہ اس میں ان ذمیوں کا ذکر ہے جن
سے معاہدہ ہو چکا ہے، ایسے ذمی انصاف کا استحقاق رکھنے میں بالکل مسلمانوں کی طرح ہیں، جو
حق ایک مسلمان کا ہے وہی بلا کم و کاست ایک ذمی کا ہے ہاں شرط یہ ہے کہ وہ خیر خواہ، مخلص،
اور وفاداری کے ساتھ معاہدے کا پابند ہو، پس مقررہ مقدار سے زیادہ وصول کر کے نہ ذمیوں پر
دست درازی کی جائے اور نہ کوتاہی کر کے مسلمانوں کو زیر بار کیا جائے۔

چوتھی خصلت دشمن سے متعلق ہے جو مسلمانوں کا مقابلہ کرتے رہتے ہیں، اس سلسلے میں خلفا کی ہدایات حیرت انگیز ہیں، لیکن اس میں ایک بات بھی حضرت عثمانؓ کی طبعزاد یا ایجاد نہیں اور نہ وہ اپنی طرف سے جدت پسند فرماتے تھے، جیسا کہ ناظرین آگے چل کر معلوم کرلیں گے، حضرت عثمانؓ نے سورۂ برأت اور دوسری سورتوں میں نازل شدہ آیات کی اتباع کرتے ہوئے اپنے عمال کو ہدایت کی کہ وہ دشمنوں پر فتح اور غلبہ ضرور حاصل کریں لیکن پاسِ وفا کے ساتھ، دشمنوں سے بھی غداری کسی طرح جائز نہیں ان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اپنی دعوت ان پر پیش کریں اگر انھوں نے منظور کرلیا تو ٹھیک ہے ورنہ مصالحت کی تجویز پیش کریں اگر قبول نہ کریں تو مقابلہ ہو،۔

یہ سیاست جس کا نقشہ حضرت عثمانؓ نے اپنے عمال کے سامنے پیش کیا ہے، بعینہٖ قرآن مجید کا پیش کردہ نقشہ ہے جو حضرت عثمانؓ سے قبل کے خلفاء اور مسلمانوں کا بھی دستور العمل رہا ہے۔

خراج کے سلسلے میں حضرت عثمانؓ اپنے عاملوں کے نام فرمان میں لکھتے ہیں:-

"حمد و صلوٰۃ کے بعد اللہ نے تمام مخلوقات کو برحق پیدا کیا اور وہ حق ہی کو قبول کرتا ہے، بس حق دو اور حق لو، بڑی بات امانت ہے امانت تم اپنے اندر امانت کے جوہر پیدا کرو، خلافِ امانت کارروائی میں پہل نہ کرو کہ بعد والوں کی کارروائیوں میں شریک گنے جاؤ گے، اور ہاں وفا کا خیال رکھو وفا کا، یتیموں اور ذمیوں پر زیادتی نہ کرو اگر یہ مظلوم ہوں گے تو اللہ تعالیٰ خود مقابل ہوگا۔"

یہ مختصر سا فرمان ہے جس میں نہایت دل کش اجمال کے ساتھ انھیں باتوں کی تاکید کی گئی اور ان کی طرف رغبت دلائی گئی جن کا ذکر پہلے فرمان میں آچکا ہے البتہ اس میں ایک قسم کی شدت اور تیزی ہے جس سے پہلا فرمان خالی ہے، فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کو برحق پیدا کیا اور وہ حق ہی کو قبول کرتا ہے اس لئے خلفا اور عاملوں کو چاہئے کہ وہ اللہ سے قربت حاصل کرنے کے لئے ایسے ہی اعمال کریں جسے وہ قبول کرتا اور پسند کرتا ہے، پس وہ لوگوں سے حق کی مقررہ مقدار ہی حاصل کریں اس میں کمی بیشی ہرگز منظور نہ کریں اور لوگوں کو واقعی حق دیں،

اس سے انحراف یا اس میں اضافہ نہ کریں، اگر اس طرح حق کی پابندی ہو تو ان کا سب سے بڑا فرض یہ ہوگا کہ وہ رعایا سے رقموں کی وصولی میں، اپنے مصالح پر خرچ کرنے میں نیز اس رقم میں جو وہ مصالح عامہ پر خرچ کرنے کے لئے خلیفہ کو سپرد کرتے ہیں سب میں امانت اور صداقت کو پیش نظر رکھیں، حضرت عثمانؓ خراج وصول کرنے والے افسروں کو متنبہ کرتے ہیں کہ وہ امانت کی راہ چھوڑ دینے میں پیش قدمی نہ کریں ورنہ وہ بعد کے خیانت کرنے والوں کے شریک جرم ہوں گے، امانت کے بعد حضرت عثمانؓ وفاداری اور پاس عہد کا حکم فرماتے ہیں اور اس میں بھی اتنی ہی شدت فرماتے ہیں جتنی امانت کے لئے فرمائی تھی، پھر ذمیوں اور یتیموں پر زیادتی سے منع فرماتے ہیں اور خدا کے عذاب سے ڈراتے ہیں جو ایسے ظالموں کے بالمقابل ہوگا،

یہ سیاست بھی قرآن مجید ہی کی سیاست ہے جس پر اللہ کے نبیؐ اور ان کے دونوں ساتھیوں کا عمل رہا ہے، حضرت عثمانؓ اپنے پہلے فرمان کی طرح اس میں بھی کوئی بات اپنی طرف سے پیش نہیں کرتے اور اپنے اس عہد کا پوری طرح خیال رکھتے ہیں جو اپنی بیعت کے موقع پر عبدالرحمٰن بن عوف سے کیا تھا کہ قرآن و سنت اور اتباع شیخین سے سرمو تجاوز نہیں کروں گا،

حضرت عثمانؓ نے سرحد کے محافظوں اور سپہ سالاروں کو فرمان بھیجا جس میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"حمد و صلوٰۃ کے بعد آپ لوگ مسلمانوں کے حامی اور ان کی طرف سے مدافعت کرنے والے ہیں، حضرت عمرؓ نے آپ کے لئے جو نظم مرتب کیا وہ ہم پر مخفی نہیں، اس کی ترتیب ہماری ایک جماعت کی موجودگی میں ہوئی ہے، ہرگز ہرگز مجھ تک یہ اطلاع نہ آنے پائے کہ تم نے اس نظم میں کوئی تبدیلی کر دی ہے یاد رکھو کہ خدا تم کو بدل دے گا اور تمہاری جگہ کسی اور کو دے دے گا بس سوچو کہ تمہارا طرز عمل کیا ہو؟ میں ان تمام معاملات پر نظر رکھوں گا جس کی نگرانی خدا نے مرے ذمے کی ہے"

غور کیجئے کہ اس فرمان میں کس قدر تدبر اور پھر کس قدر شدت سے کام لیا گیا ہے اور یہ دونوں باتیں جنگی افسروں اور دفاع کے ذمہ داروں کے لئے کس قدر موزوں اور ضروری ہیں، اور خاص طور پر توجہ کیجئے کہ حضرت عثمانؓ حضرت عمرؓ کے مقرر کردہ نظام کی پابندی کو کتنے زور کے ساتھ

لازمی قرار دیتے ہیں اس لئے کہ فاروق اعظم نے اس نظام کا خاکہ انصار اور مہاجرین کی ایک جماعت کی موجودگی میں بنایا تھا، خود حضرت عثمانؓ اس نظام کی تیاری میں بحث اور مشورے کے ساتھ شریک تھے، وہ سپہ سالاروں کو تاکید کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے مرتبہ نظام میں کوئی تبدیلی نہ کریں اور اگر انھوں نے کچھ ردو بدل کیا تو دھمکی دیتے ہیں کہ وہ معزول کر دئے جائیں گے یا سزا کے مستحق ہوں گے، بس حضرت عثمانؓ نظامت میں، مالیات میں، اور جنگ میں غرض تینوں شعبوں میں اسی مسلک کے محافظ ہیں جو حضرت عمرؓ کا تھا، پھر جس طرح حضرت عمرؓ مسلمانوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرماتے تھے سنن کی طرف راغب اور بدعات سے دور رہنے کی تاکید کرتے تھے، حضرت عثمانؓ کا بھی یہی حال تھا مختلف شہروں اور صوبوں کے عوام کے نام آپ نے جو فرمان بھیجا ہے اس کا ترجمہ پڑھئے،

"حمد وصلوۃ کے بعد اتباع اور فرماں برداری کی بدولت آج تم اس درجے پر پہنچے ہو خبردار کہیں دنیا تم کو تمہارے اصل کام سے غافل نہ کر دے اس لئے کہ یہ امت بدعات کی طرف جھک جائے گی۔

(۱) وہ خوش حالی اور فارغ البالی کی انتہا کو پہنچ جائے گی۔

(۲) قیدی لونڈیوں سے پیدا ہونے والی ان کی اولاد جوان ہو چکی ہو گی۔

(۳) دیہاتی عرب اور عجمی لوگ قرآن پڑھ چکیں گے۔

اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کفر عجمیوں میں ہے جب کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی وہ تکلف اور جدت سے کام لیں گے"

اس فرمان سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عثمانؓ سنت کی حفاظت اور تکلفات اور بدعات کے روکنے میں کسی طرح بھی حضرت عمرؓ سے کم کوشاں نہ تھے، انھوں نے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ آج فتوحات اور اقتدار کے جس درجہ پر وہ ہیں یہ اتباع اور اطاعت ہی کی برکت ہے، آپ نے مسلمانوں کو تنبیہ کی کہ دنیا کہیں ان کی توجہ کو اصل کام سے ہٹا نہ دے پھر ان کو خطرات کے تین مواقع سے ڈراتے ہیں۔

(۱) یہ عیش و عشرت کی پرلطف اور لذت بھری زندگی جو روز بروز ترقی کرتی جاتی ہے ان کو برباد کردے گی۔

(۲) قیدی لونڈیوں سے جو اولاد جوان ہوگی وہ ان کے لئے خرابیوں کا باعث ہوگی یہ نئی پیدا ہونے والی نسل جس کا خون خالص عربی خون نہیں ہوگا بلکہ اس میں غیر ملکی ماؤں کے خون کی آمیزش ہوگی، اتباع اور اطاعت کی جگہ اپنی طرف سے اضافہ اور تجدید پسند کرے گی۔

(۳) دین میں وہ باتیں داخل کی جائیں گی جو دین نہیں ہیں اور سادہ اور آسان علم کو جمیل اور تکلف میں الجھا دیا جائے گا جب کہ دیہاتی عرب اور عجم کے لوگ اسلام میں داخل ہوں گے اور قرآن پڑھ لیں گے اور آیات کا صاف اور سادہ مطلب نہ سمجھ کر اس میں اپنی طرف سے اضافے اور بناوٹ کی باتیں داخل کریں گے، فتوحات کے بعد مسلمان جن آفات میں مبتلا ہوئے اس کی حضرت عثمانؓ نے جو تصویر اپنے اس فرمان میں کھینچی ہے میں نہیں جانتا کہ کسی اور نے اس کا نمونہ پیش کیا ہو، مال و دولت کی کس قدر بہتات اور نعمت و معیشت میں کیسی فراوانی ہوئی اور مسلمانوں کے لئے کس طرح عیاشی اور حرص ہوس کا باعث بنی پھر ایک نئی نسل پیدا ہوئی جس نے بڑے بڑے اقدامات کئے، بیجا تکلفات اور دور از کار جدتیں پیدا کیں قرآن مجید کو اس کے طریقوں سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہیں بالکل ڈھیل چھوڑ دی اور کہیں حد سے زیادہ سختی برتی چنانچہ حق انتہائی سخت گیریوں اور حد سے زیادہ سہل انگاریوں کے درمیان گم یا تقریباً گم ہوگیا۔ (باقی آئندہ)

حضرت عمرؓ کی آخر زندگی کے چند واقعات

از

جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق ایم۔ اے استاد ادبیات عربی

(دہلی یونی ورسٹی)

ان واقعات سے میری مُراد ہے۔ (۱) حضرت عمرؓ کی خلافت سے بیزاری، ممتاز صحابہؓ کی اہلیت کے بارے میں اُن کی رائے اور اُن کے قتل کی روئداد۔ اِن اُمور پر عربی تاریخوں میں مواد ہے مگر اس میں متعدد خامیاں ہیں، ایک یہ کہ کوئی ایک تاریخ ان تمام امور پر روشنی نہیں ڈالتی۔ بلکہ کسی ایک حصّہ کا ذکر کرتی ہے، دوسرے یہ کہ ان امور کے بارے میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ کہیں مجمل ہیں، کہیں مبہم اور کہیں ادھوری ہیں، تیسرے یہ کہ ان امور کو اس ترتیب کے ساتھ نہیں پیش کیا گیا ہے جس ترتیب سے یہ واقع ہوتے تھے[1]۔

ان خامیوں کو ایک قدیم تاریخ نے بڑی حد تک دور کر دیا ہے، اس کے مصنّف کا نام اَعثم کوفی ہے جس نے ۲۰۴ھ میں تاریخ فتوح کے نام سے ایک کتاب لکھی جو حضرت ابوبکرؓ کی خلافت سے کربلا، تک کے حالات پر مشتمل ہے۔

[1] اس سلسلہ میں میرے پیش نظر جو کتابیں ہیں ان کے نام یہ ہیں:۔ تاریخ الامم والملوک، طبری، مصر۔ طبقات ابن سعد، لیدن۔ شرح نہج البلاغۃ، ابن ابی الحدید، مصر۔ مروج الذہب، مسعودی، مصر۔ تاریخ کامل، ابن اثیر، مصر، الاخبار الطوال، دینوری لیدن، الامامۃ والسیاسۃ، ابن قتیبہ، مصر، تاریخ ابن خلدون، مصر، تاریخ الخلفاء، سیوطی، مصر، اصابہ، ابن حجر، مصر، استیعاب، ابن عبدالبر، مصر، تذکرۃ الحفّاظ، ذہبی، حیدرآباد، ہند، عمر بن الخطاب، ابن جوزی، مصر، ناسخ التواریخ، محمد تقی، بمبئی، العقد الفرید، ابن عبد ربّہ، مصر۔ تاریخ یعقوبی، لیدن۔

یاقوت نے ارشاد الاریب میں لکھا ہے کہ کتاب بہت بڑی تھی اور اس کا دائرہ خلافتِ رشید (۱۹۳ھ) تک وسیع تھا۔ سخت افسوس ہے کہ مطبوعہ شکل میں ہم تک ۶۱ھ کے بعد کا حصہ نہیں پہنچا۔ ۶۰۰ھ کے لگ بھگ ایک ایرانی فاضل نے سلطانِ وقت کی تحریک پر اس کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا جو میرے سامنے ہے۔

حضرت عمرؓ کی آخری زندگی سے متعلق امور زیر بحث جو اسی کتاب میں بیان کئے گئے ہیں وہ اُن تمام تواریخ کی تصریحات سے زیادہ جامع، مربوط اور بصیرت افروز ہیں جو میری نظر سے گذری ہیں۔ یہاں بغیر کسی تصرف کے ان کو پیش کیا جاتا ہے، ایسا کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مطبوعہ کُتُبِ عربی کی سب سے جامع اور مستند کتاب تاریخ الرسل والملوک میں طبری نے جو تفصیلات اس باب میں پیش کی ہیں ان کو بیان کرتا چلوں تاکہ اعثم اور طبری کے مقابلہ سے دونوں کے فرقِ مواد اور امتیازی شان کا اندازہ ہو سکے۔

طبری کا بیان

ایک دن (۲۳ھ میں) حضرت عمرؓ بازار کا گشت کر رہے تھے کہ مغیرہ بن شعبہ کا نصرانی غلام ابولؤلؤ[1] ان کو ملا اور کہنے لگا: "امیرالمومنین مجھ کو پناہ دیجئے، مغیرہ بن شعبہ نے میرے اوپر بھاری ٹیکس لگایا ہے۔"

حضرت عمرؓ:۔ تمہارا ٹیکس کتنا ہے؟

ابولؤلؤ:۔ ہر روز دو درہم (تقریباً ۸؍)۔

حضرت عمرؓ:۔ تم کیا کام کرتے ہو؟"

[1] مسعودی اور کئی دوسرے مؤرخوں نے لکھا ہے کہ ابولؤلؤ مجوسی تھا اور قرائن سے بھی اس کا مجوسی ہونا ہی درست معلوم ہوتا ہے۔

ابولولوٗ :- نجار ہوں ، نقاش ہوں ، حداد (لوہار) ہوں ۔"

حضرت عمرؓ :- تب تو تمہارا ٹیکس زیادہ نہیں ہے ، میں نے سنا ہے تم کہتے ہو اگر میں چاہوں تو ایسی چکی بنا سکتا ہوں جو ہوا سے چلے ۔"

ابولولوٗ :- جی ہاں ، یہ صحیح ہے ۔"

حضرت عمرؓ :- اچھا تو میرے لئے ایک ہوائی چکی بنا دو ۔"

ابولولوٗ :- اگر میں جیتا رہا تو آپ کے لئے ایسی چکی بناؤں گا جس کا چرچا مشرق سے مغرب تک ہوگا ۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا ۔

حضرت عمرؓ نے کہا :- اس غلام نے مجھ کو دھمکی دی ہے ۔" پھر وہ بھی چلے گئے ۔

دوسرے دن صبح کو کعب الاحبار آئے اور کہنے لگے : امیرالمومنین آپ کو جو عہد و وصیت کرنا ہے کر لیجئے ، کیوں کہ آپ تین دن میں وفات پا جائیں گے ۔"

حضرت عمرؓ :- تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا ؟"

کعب :- خدا کی کتاب توراۃ میں لکھا ہے ۔"

حضرت عمرؓ :- کیا واقعی عمرؓ کا ذکر توراۃ میں ہے ؟"

کعب :- نہیں ، اس میں آپ کا ذکر تو نہیں ، ایک ایسے شخص کا ہے جس کی صورت اور سیرت آپ سے مشابہ ہے ، آپ کا وقت آگیا ہے ۔"

حضرت عمرؓ کو اس خبر سے نہ کوئی افسوس ہوا نہ فکر ۔ دوسرے دن کعب پھر آئے اور کہا : "امیرالمومنین ایک دن ختم ہو گیا ، اب آپ کی زندگی کے صرف دو دن باقی ہیں ۔"

اگلی صبح کو کعب پھر آئے اور کہا : "امیرالمؤمنین دو دن ختم ہوئے اب ایک دن اور ایک رات باقی ہے ۔"

جب فجر کا وقت ہوا تو عمرؓ نماز کے لئے مسجد گئے ، انھوں نے صفیں درست

کرنے پر کئی آدمی مامور کر رکھے تھے، جب صفیں سیدھی ہوگئیں وہ آتے اور نماز کے لئے تکبیر کہی، ابو لؤلؤ ہاتھ میں دو دھارا خنجر لئے نمازیوں کے درمیان تھا، حضرت عمرؓ نے جب نیت باندھی تو اس نے پیا پے چھ وار اُن پر کئے، ایک زخم ان کی ناف کے نیچے لگا اور مہلک ثابت ہوا، حضرت عمرؓ کے پیچھے کُلَیب بن اَبی بُکیر نامی ایک شخص تھا اس کو بھی ابو لؤلؤ نے قتل کیا۔ حضرت عمرؓ گر پڑے اور عبدالرحمٰن بن عوف سے نماز پڑھوائی، جتنی دیر لوگوں نے نماز پڑھی حضرت عمرؓ زمین پر پڑے رہے۔ نماز کے بعد ان کو اٹھا کر گھر لے گئے۔ حضرت عمرؓ نے عبدالرحمٰن بن عوف کو بلایا اور کہا: "میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں"۔

عبدالرحمٰن:- فرمایئے، مگر آپ کو خدا کی قسم دیتا ہوں کہ خلافت مجھ کو نہ سونپئے گا۔

حضرت عمرؓ:- ایسا نہیں ہے"۔

عبدالرحمٰن:- خدا کی قسم میں کبھی خلافت کی ذمہ داری نہیں لوں گا"۔

حضرت عمرؓ:- ذرا متوجہ ہو کر میری بات سنو، خلافت کا معاملہ میں اُن لوگوں کے سپرد کرتا ہوں جن سے مرتے وقت رسول اللہ خوش تھے: علیؓ، عثمانؓ، زبیرؓ سعدؓ کو بلاؤ اور طلحہ کا (جو شہر سے باہر تھے) تین دن انتظار کرو، اگر اس اثنا میں وہ آجائیں، فبہا، ورنہ خلیفہ منتخب کر لو۔ اے علیؓ تم کو خدا کی قسم، اگر کوئی عہدہ تمہیں مل جائے تو بنو ہاشم کو لوگوں کی گردن پر سوار نہ کرنا، اے عثمانؓ تم کو خدا کی قسم، اگر کوئی عہدہ تمہیں مل جاتے تو ابو مُعَیط کی اولاد کو لوگوں کی گردن پر سوار نہ کرنا، اے سعدؓ تم کو خدا کی قسم، اگر کوئی عہدہ تم کو مل جائے تو ہرگز ہرگز اپنے عزیزوں کو لوگوں کی گردن پر سوار نہ کرنا، جاؤ مشورہ کر کے خلیفہ منتخب کرو، اس اثنا میں صہیب لوگوں کی امامت کریں گے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے ابو طلحہ انصاری کو بلوایا اور کہا: "اصحابِ شوریٰ جس گھر میں جمع ہیں اس کے دروازہ پر پہرہ دو اور کسی

کو ان کے پاس نہ جانے دو، میں اپنے جانشین خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں کہ انصار کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے، ان میں جو نیکوکار ہیں ان کو نوازے، جو خطاکار ہیں ان کو معاف کرنے، عربوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرے کیوں کہ اسلام کا قیام ان کی ذات پر منحصر ہے، ان میں جو مالدار ہوں ان سے زکوٰۃ لی جائے اور ان میں جو نادار ہوں ان پر تقسیم کی جائے، اپنے جانشین خلیفہ کو ذمیوں کے ساتھ حسن سلوک کی بھی تاکید کرتا ہوں، ان کے ساتھ جو عہد کیا گیا ہے اس کی پوری پابندی کی جائے۔ عبداللہ (ابن عمر) جاؤ معلوم کرو مجھے کس نے قتل کیا ہے؟

عبداللہ:۔ امیر المؤمنین، مُغیرہ کے غلام ابولؤلؤ سے یہ فعل سرزد ہوا ہے؟

حضرت عمرؓ:۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے ایسے شخص نے نہیں مارا جس نے خدا کے سامنے کبھی سجدہ کیا ہو۔ عبداللہ عائشہ کے پاس جاؤ اور ان سے درخواست کرو کہ مجھے رسول اللہؐ اور ابوبکرؓ کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت دیں، اور دیکھو اگر اصحاب شوریٰ میں جھگڑا ہو تو اس پارٹی کا ساتھ دینا جو زیادہ ہو اور اگر دونوں پارٹیاں برابر ہوں تو اس پارٹی کا ساتھ دینا جس میں عبدالرحمٰن بن عوف ہوں، اب لوگوں کو اندر آنے کی اجازت دے دو۔ جیسے جیسے مہاجر اور انصار داخل ہوتے اور سلام کرتے حضرت عمرؓ ان سے کہتے: کیا تمہارے تعاون سے یہ کام ہوا؟ وہ کہتے: معاذ اللہ، ہم کو اس کا بالکل علم نہ تھا؟ لوگوں کے ساتھ کعبُ الاحبار بھی آئے، ان کو دیکھ کر حضرت عمرؓ نے دو شعر پڑھے: (ترجمہ)

تین دن تک کعب مجھ کو خطرہ سے ڈراتے رہے اور کعب کا کہنا بالکل ٹھیک نکلا مجھے مرنے کا ڈر نہیں، کیوں کہ مرنا بہر حال ہے، ڈر اپنے گناہوں کی سزا کا ہے۔

لوگوں کے کہنے پر طبیب بلایا گیا جو حارث بن کعب کے قبیلہ سے تعلق رکھتا

تھا۔ اس نے نبیذ پلائی، وہ خون آلود نکل آئی، پھر دودھ پلایا گیا وہ بھی جوں کا توں نکل آیا، یہ دیکھ کر حاضرین نے کہا: "امیر المومنین اب عہد وصیت کیجئے آپ کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے"

حضرت عمرؓ:۔ میں وصیت کرچکا۔" اس کے بعد حضرت عمرؓ بدھ کی رات کو جب کہ ذوالحجہ کے ختم ہونے میں تین دن باقی تھے دنیا سے کوچ کر گئے۔ جمعرات کی صبح کو ان کا جنازہ نکلا اور حضرت عائشہ کے کمرہ میں رسول اللہ اور حضرت ابوبکرؓ کے پاس دفن ہوئے صُہیب نے نمازِ جنازہ پڑھائی، صُہیب سے پہلے حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ نماز کے لئے بڑھے، اس پر عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا لا الٰہ الا اللہ تم دونوں خلافت کے لئے کس قدر بے تاب ہو، کیا تم کو یاد نہیں کہ امیر المومنین نے (خلیفہ منتخب ہونے تک) صُہیب کو نماز پر مامور کردیا ہے۔ حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ یہ سُن کر ہٹ گئے[1]

اَعثم کا بیان

حضرت عمرؓ جب حج کرچکے (اور یہ آخری حج تھا ۲۳ھ) تو مصر کے ایک باشندے نے کہا: امیر المومنین میری فریاد سُنئے اور ظالم سے میرا انصاف کیجئے

حضرت عمرؓ:۔ کیا بات ہے؟

مصری:۔ ایک دن محمد (صاحبزادہ عمرو بن عاص، گورنر مصر) اور میں نے بازی لگا کر گھوڑ دوڑ کی اور میرا گھوڑا بازی لے گیا، محمد نے بے قصور میرے ایک کوڑا مارا اور اس پر وہ تقہ لوگ جو وہاں موجود تھے شاہد ہیں، میں نے اس زیادتی کی شکایت ان کے والد سے کی تو انھوں نے اُلٹا مجھے قید میں ڈلوا دیا

---

[1] طبری ۵/ ۱۲-۱۳

اور چار ماہ کی سزا دی، جب حاجیوں کا قافلہ حج کے لئے روانہ ہوا میں ان کے ساتھ یہاں آگیا اور چاہتا ہوں کہ آپ اس ظلم کا انصاف کریں۔" حضرت عمرؓ نے محمد اور عمرو بن عاص کو طلب کیا اور مصری کی شکایت کا ان سے تذکرہ کیا انھوں نے کہا مصری بالکل جھوٹا ہے۔ تب حضرت عمرؓ نے مصری سے گواہ مانگے۔ مصر کے کچھ لوگ آئے اور انھوں نے مصری کے حق میں گواہی دی۔ حضرت عمرؓ نے مصری سے کہا: "محمد کے کوڑا مار کر اپنا حق لے لو۔" مصری نے کوڑا مار کر بدلہ لے لیا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے کہا: "اب گنجے کے لڑکے (یعنی عمرو بن عاص) کو لاؤ۔"

مصری:۔ امیر المؤمنین عمرو نے مجھ کو مارا نہ تھا قید کیا تھا۔"

حضرت عمرؓ:۔ اگر کہو تو میں ان کو قید کر دوں اور اگر معاف کرنا چاہو تو تمھاری خوشی۔"

مصری:۔ امیر المؤمنین میں نے ان کو معاف کر دیا، آپ بھی کر دیجیے

عمرو بن عاص کو اس کارروائی پر سخت غصہ آیا اور انھوں نے حضرت عمرؓ سے کہا: "آپ نے میری بہت توہین کی ہے آپ جب تک خلیفہ ہیں میں آپ کا کوئی منصب نہیں رکھوں گا۔"

حضرت عمرؓ: "تمھاری خوشی، جہاں چاہو جاؤ، ہمیں تم سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔" اس واقعہ کے بعد حضرت عمرؓ نے تقریر کی اور کہا:۔ صاحبو۔ جب سے میں خلیفہ ہوا ہوں دین اسلام اور فرائض و سُنن کو آپ کے سامنے پیش کرتا رہا ہوں، اور جہاں تک مجھ سے ہو سکا آپ کو راہ راست پر چلاتا رہا ہوں، خدا سے ڈریئے اور اس کی نعمتوں کا شکر کیجیے، مجھے اس وقت یہ کہنا ہے کہ میں ناتوان ہو گیا ہوں، میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں، میرا خیال ہے یہ میری آخری تقریر ہے، ایسے کام کیجئے جن سے خدا خوش رہے، اور ہر کام کے وقت یقین رکھئے کہ خدا آپ کو دیکھ رہا ہے۔"

اس کے بعد حضرت عمرؓ مدینہ لوٹ آئے۔

اس اثناء میں کوفہ کے گورنر مغیرہ بن شعبہ مدینہ آئے، ان کے ساتھ ان کا غلام فیروز تھا جس کی کنیت ابولؤلؤ تھی، اس کو کئی ہنر آتے تھے۔ ایک دن حضرت عمرؓ کے پاس آکر اس غلام نے کہا: "مالک نے میرے اوپر بھاری ٹیکس لگا رکھا ہے ہر ماہ مجھ سے سو درہم (تقریباً چھپن روپئے) لیتے ہیں[1]۔ اور میں یہ رقم ادا کرنے سے قاصر ہوں، ان سے کہہ کر اس میں کمی کرا دیجئے۔"

حضرت عمرؓ:- تم کیا کام جانتے ہو؟" فیروز نے کہا میں ہوائی چکی بنا سکتا ہوں اس کے علاوہ اس نے کئی اور ہنر بھی بتائے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت مغیرہ کو بلایا اور کہا: "اس غلام کے معاملہ میں خدا سے ڈرو اور اس کی طاقت سے زیادہ ٹیکس نہ لو، وہ غیر مسلم سہی، مگر میرے پاس داد خواہی کے لئے آیا ہے اور میں اس کی سفارش کرتا ہوں۔" حضرت مغیرہ نے ٹیکس کم کرنے کا وعدہ کیا مگر کوئی تخفیف نہیں کی۔ فیروز پھر حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور اپنے مالک کی شکایت کی۔ حضرت عمرؓ نے کہا: "اتنے ہنروں کی موجودگی میں جو تم کو آتے ہیں میں سمجھتا ہوں تمہارا ٹیکس زیادہ نہیں ہے، ہم کو ایک چکی کی ضرورت ہے بیت المال کا غلہ پیسنے کے لئے، اگر تم نے چکی بنا دی تو تم کو بہت انعام دوں گا۔" فیروز نے خفگی سے کہا: "آپ کے لئے ایسی چکی بناؤں گا جس کا شہرہ ساری دنیا میں ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا حضرت عمرؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "جانتے ہو اس غلام نے کیا کہا، اس نے قتل کی دھمکی دی ہے، وَاللہ بالغ امرہٖ (جو خدا کو منظور ہے پورا ہوگا)۔"

---

[1] اس ٹیکس کی مختلف شرحیں بیان کی گئی ہیں: طبری - دو درہم یومیہ، استیعاب ایک دینار یومیہ (تقریباً ساڑھے پانچ روپئے) تاریخ الخلفاء سیوطی - چار درہم یومیہ، مسعودی - چار درہم یومیہ، طبقات ابن سعد - چار درہم یومیہ، بروایت اخریٰ، سو درہم ماہوار، عقد الفرید، تین درہم یومیہ، ابن جوزی - سو درہم ماہوار۔

دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد حضرت عمرؓ نے تقریر کی: "دوستو۔ میری موت کا وقت قریب آگیا ہے، رات میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک مرغا میرے پاس آیا اور دو یا تین بار میرے جسم پر چونچیں ماریں، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرغا کوئی عجمی ہے جو مجھے مارنا چاہتا ہے اور میرے دو یا تین زخم لگائے گا۔ اگر یہ حادثہ پیش آیا اور میرے ہوش و حواس بجا رہے تو میں ایسا خلیفہ منتخب کروں گا جو مجھ سے بہتر ہوگا اور اگر میں اس قابل نہ رہوں تو ان چھ آدمیوں میں سے جو ممتاز صحابہ ہیں اور جن سے رسول اللہ خوش تھے کسی ایک کو خلیفہ چن لینا: "عثمانؓ، علیؓ طلحہؓ، زبیرؓ، سعد بن ابی وقاص، عبدالرحمٰن بن عوف"۔ یہ کہہ کر حضرت عمرؓ منبر سے اتر آئے اور عبداللہ بن عباس کا ہاتھ پکڑ کر مسجد سے باہر چلے گئے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد حضرت عمرؓ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور رونے لگے، حضرت ابن عباس نے اس کا سبب دریافت کیا تو حضرت عمرؓ نے کہا: "میرا خیال ہے کہ موت کا وقت آگیا ہے، میں موت سے نہیں ڈرتا، آدمی کو بہرحال مرنا ہے، لیکن اپنے بعد خلیفہ کی طرف سے مجھے فکر ہے، سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں"۔

ابن عباس نے پوچھا: "علیؓ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ مہاجرین اولین میں ہیں، رسول اللہ کے قریبی عزیز ہیں، ان کی خدمات، لیاقت اور شجاعت کا حال آپ کو معلوم ہے"۔

حضرت عمرؓ:- علیؓ میں یہ سب باتیں ہیں بلکہ اس سے زیادہ صفات موجود ہیں اور اگر خلافت ان کے سپرد کر دی جائے تو وہ راہ راست پر لوگوں کو چلا بھی سکیں گے مگر ان کی طبیعت میں ظرافت ہے اور وہ خلافت کے سخت خواہشمند ہیں اور جو شخص خلافت کا خواہش مند ہو اس منصب کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا"۔

حضرت ابن عباس: "عثمانؓ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

حضرت عمرؓ: "وہ خلافت کی لیاقت رکھتے ہیں مگر مجھے اندیشہ ہے کہ وہ خلیفہ ہو کر ابو مُعَیط کے خاندان کو لوگوں پر مسلط کر دیں گے۔" اور تمہارے ساتھ کچھ بدعنوانیاں کریں گے اور تم ان کے ساتھ۔"[1]

ابن عباس: "طلحہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

حضرت عمرؓ: "خدا نہ کرے کبھی وہ خلیفہ ہوں، نہایت مغرور اور خود پسند آدمی ہیں۔"

حضرت ابن عبّاس: "زبیر بن عوّام کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

حضرت عمرؓ: "وہ بہادر اور چست سوار ہیں مگر ان کے مزاج میں بخل ہے ایک صاع گیہوں، یا ایک مُدّ جَو کے لئے صبح سے شام تک بقیع میں کھڑا رہنا اور لوگوں سے جھگڑنا اور بدزبانی کرنا اُن کے لئے آسان ہے، خلافت کے لئے ایسا آدمی چاہئے جو فیاض منش ہو، ایک وقت ایثار و احسان کرے اور دوسرے وقت ضرورت کے لئے کچھ بچالے، جو فیاضی و جزرسی میں حد سے تجاوز نہ کرے اور راہِ اعتدال پر قایم رہے۔"

حضرت ابن عباس: "آپ کی رائے سعد کے بارے میں کیا ہے؟"

حضرت عمرؓ: "سعد مرد میدان ہیں فنِ جنگ میں ماہر، مگر اس کام کے لئے مناسب نہیں۔"

حضرت ابن عباس: "آپ کی رائے عبدالرحمٰن بن عوف کے بارے میں کیا ہے؟"

حضرت عمرؓ: "نیک مرد ہیں، سیرت بھی خوب ہے مگر کمزور ہیں خلافت کے لئے ایسا آدمی چاہئے جو قوی ہو مگر تشدد پسند نہ ہو، نرم ہو مگر کمزور نہ ہو، آمد و خرچ پر منظر رکھے مگر بخل نہ کرے۔" اے بھائی اگر مُعاذ بن جَبَل زندہ ہوتے تو خلافت

---

[1] وہ تمہارے ساتھ کچھ بدعنوانیاں کریں گے اور تم ان کے ساتھ، اس عبارت کی جگہ ناسخ التواریخ ۲/۴۲۹ میں یہ لفظ ہیں: آخرکار تمہارے ہاتھوں ان کا خاتمہ ہوگا۔

کے لئے ان سے بہتر آدمی نہ تھا، میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ معاذ ایسے امین ہیں کہ قیامت کے دن ان کے اور خدا کے درمیان سوائے پیغمبروں کے اور کوئی حائل نہ ہوگا، اور اگر حذیفہ کے آزاد کردہ غلام سالم زندہ ہوتے تو خلافت ان کے سپرد کرتا کیوں کہ رسول اللہ نے ان کے حق میں فرمایا تھا سالم کو خدا اور صرف خدا کی خوشنودی محبوب ہے اور خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، اور اگر ابوعبیدہ بن جرّاح زندہ ہوتے تو وہ بھی اس کام کے لئے ہر طرح اہل تھے کیوں کہ رسول اللہ نے ان کے متعلق فرمایا ہے: ہر قوم کا ایک امین ہوا ہے اور اس قوم کے امین ابوعبیدہ ہیں۔"[1]

اس گفتگو کے بعد حضرت عمرؓ گھر لوٹ آئے اور رسول اللہ کے ممتاز ترین صحابہ کو بلاکر اپنے پاس بٹھایا، پھر آدمی بھیج کر جاثلیق کو طلب کیا[2] اور کہا: "عقل و دانش میں تمہارا مرتبہ عیسائیوں میں بہت بلند ہے اس کے علاوہ انجیل بھی تم کو یاد ہے اگر تم سچ بتاؤ تو ایک بات تم سے پوچھوں"۔ جاثلیق نے کہا جو کچھ مجھے معلوم ہے آپ سے سچ بیان کروں گا۔

حضرت عمرؓ: "ہمارے پیغمبر کا ذکر تمہاری انجیل میں ہے یا نہیں؟

جاثلیق: "ہماری انجیل میں آپ کے پیغمبر کا نام فارلقیط بیان ہوا ہے اور یہ ایسے شخص کو کہتے ہیں جو حق اور باطل میں امتیاز کرتا ہے"۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ اور اکابر صحابہ نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کو ایسے شخص کی امت میں کیا جو حق و باطل میں امتیاز کرتا ہے۔

---

[1] الامامۃ والسیاسۃ اور شرح نہج البلاغۃ میں بھی اصحاب شوریٰ کے بارے میں اس سے ملتی جلتی رائے حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کی گئی ہے [2] یہ جاثلیق کون تھا معلوم کرنا دشوار ہے۔ بقول صبح الاعشیٰ مصر جاثلیق عیسائی مذہب میں اس شخص کا لقب تھا جو نماز پڑھاتا تھا، گمان غالب ہے کہ جاثلیق سے مراد کعب الاحبار ہیں جو ایک عیسائی عالم تھے جنہوں نے حضرت عمرؓ کی ہاتھ پر فلسطین میں اسلام قبول کیا تھا۔"

حضرت عمرؓ نے پوچھا: "کیا انجیل میں اس کے جانشینوں کا بھی کوئی ذکر ہے؟"
جاثلیق: "انجیل میں ہے کہ فارقلیط کا جانشین ایسا شخص ہوگا جو کارہائے خوب انجام دے گا"۔ حضرت عمرؓ نے کہا ابوبکرؓ پر خدا کی رحمت ہو وہ ایسے ہی شخص تھے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا اس کے بعد کس کا ذکر ہے؟
جاثلیق: "انجیل میں ہے کہ اس کے بعد ایک آہنی شخص ہوگا (یعنی قوی) جو احکام دین پر سختی سے عامل ہوگا"۔
حضرت عمرؓ: اس کے بعد؟"
جاثلیق: "اس کے بعد ایک خلیفہ ہوگا جو اپنے عزیز و اقارب کو دوسرے مسلمانوں پر ترجیح دے گا"۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ کی طرف دیکھا اور پھر پوچھا: اس کے بعد؟"
جاثلیق: "اس کے بعد ایک شمشیر برہنہ کے ہاتھ میں خلافت آئے گی جس سے خون خرابہ ہوگا"۔ حضرت عمرؓ نے جب یہ سنا تو افسوس سے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور حضرت عثمانؓ سے مخاطب ہو کر بولے: "اگر تم خلیفہ بنو تو خدا سے ڈرتے رہنا اور ابو معیط کے خاندان کو مسلمانوں کے سر پر مسلط نہ کرنا"۔ پھر حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے: "ابوالحسن ایسا معلوم ہوتا ہے تم خلیفہ بنو گے اور تمہارے عہد میں مسلمان آپس میں لڑیں گے"۔ اس کے بعد مجلس برخاست ہوئی یہ جمعہ کا دن تھا۔

چند دن بعد چہارشنبہ کی صبح کو ابولولو ہاتھ میں دو دھارا خنجر لئے کچھ پریشان سا سر اور منہ پر کپڑا لپیٹے مسجد میں داخل ہوا اور ایک کونہ میں بیٹھ گیا۔ جب حضرت عمرؓ نماز پڑھانے کے لئے محراب میں آئے، ابولولو صف اول میں آکر کھڑا ہو گیا اور جوں ہی خلیفہ نے نیت باندھی اور ان کے ساتھ دوسرے لوگوں نے،

ابولولو بڑھا اور حضرت عمرؓ پر خنجر کے تین وار کئے۔ ایک پہلو میں، دوسرا زیرِ ناف تیسرا اینڈلی پیر، اور صفوں کو چیرتا ہوا مسجد سے نکل بھاگا۔ حضرت عمرؓ کے زخم کاری لگا اور ان میں نماز پڑھانے کی طاقت نہ رہی، انھوں نے عبدالرحمٰن بن عوف کو آگے بڑھایا، عبدالرحمٰن نے پہلی رکعت میں قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ اور دوسری میں قُلْ ھُوَاللّٰہُ اَحَدٌ پڑھ کر جلد نماز ختم کی، لوگ ابولولو کو پکڑنے بھاگے اور چیختے جاتے: پکڑنا اس خونی چور کو، پکڑنا اس خونی چور کو۔ ایک شخص نے اس کو جالیا ابولولو نے اس پر حملہ کیا اور یکے بعد دیگرے تیرہ آدمیوں کو گھائل کر دیا جن میں سے چھ بعد میں مر گئے بالآخر ایک شخص نے اس پر کمبل ڈال کر حراست میں لے لیا۔ ابولولو نے یہ جان کر کہ اس کو مار ڈالا جائے گا اسی حالت میں خودکشی کر لی۔

حضرت عمرؓ کو اٹھا کر گھر لائے، ان پر غشی طاری تھی، لوگ جمع ہو گئے، ان کا حال پوچھتے اور روتے، ان کو جب ہوش آیا تو انھوں نے پوچھا: "مجھے ابولولو نے مارا یا کسی اور نے؟ جب ان کو معلوم ہوا کہ ان کا قاتل ابولولو ہے تو انھوں نے کہا: "خدا کا شکر ہے کہ مجھے مارنے والا مسلمان نہ تھا جس سے قیامت کے دن میں جھگڑتا" یہ کہہ کر وہ بے ہوش ہو گئے اور جب ظہر کا وقت ہوا تو لوگوں نے ان کو ہلایا اور کہا کہ نماز کا وقت فوت ہو رہا ہے، حضرت عمرؓ کے حواس بجا ہوتے، انھوں نے کہا: "بے شک نماز پڑھنا ضروری ہے، جو شخص نماز نہیں ادا کرتا وہ اسلام سے بے بہرہ ہے" جس طرح ہو سکا نماز ادا کی، ساتھیوں نے طبیب بلایا اس نے زخم کا اندازہ کرنے کے لئے دودھ دیا، دودھ زخم سے ہو کر بہ نکلا، طبیب نے کہا: امیرالمومنین عہد و وصیت کیجئے، آپ کا زخم التیام پذیر نہیں ہے؛ حضرت عمرؓ نے کہا طبیب ٹھیک کہتا ہے، پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ حضرت ابن عباسؓ نے ان کی رقت آمیز حالت دیکھ کر کہا: "خدا آپ کو نہ رلائے اور بہشت میں آپ کو جگہ

دنے، خدا کی قسم آپ کے اسلام سے اسلام کو عزت حاصل ہوئی، آپ کی ہجرت ایک بڑی فتح تھی، آپ کی خلافت ایک رحمتِ عام تھی، آپ اس وقت اسلام لائے جب دوسرے اسے چھوڑ رہے تھے، آپ اس جماعت سے ہیں جن کے بارے میں خدا نے کہا ہے: "لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ، وَالْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ۔ رسول اللہ کی خدمت میں آپ نے ایسی باادب زندگی گذاری کہ انھوں نے خوش ہوکر آپ کو جنت کی بشارت دی، ایک دو بار نہیں بلکہ بہت دفعہ، اور جب آنحضرتؐ دنیا سے تشریف لے گئے تو آپ سے خوش تھے، ان کے بعد آپ نے آنحضرتؐ کے خلیفہ کی مدد کی اور ہر مشکل میں اُن کا ہاتھ بٹایا اور اُن کے ساتھ پورا تعاون کرتے رہے، جب وہ رخصت ہوئے تو وہ بھی آپ سے خوش تھے، پھر آپ خلیفہ ہوئے تو آپ نے خلافت کے فرائض اس خوبی سے انجام دئے کہ اس سے زیادہ ممکن نہ تھا، خدا نے آپ کے ذریعہ اسلام کو مضبوط اور معزز کیا، اور دین کے دشمنوں کو سرنگوں، آپ نے بڑے بڑے ملکوں اور شہروں کو فتح کیا، بتکدوں کو ویران اور مسجدوں کو تعمیر فرمایا، آپ نے حکومت کی بنیاد راست بازی پر رکھی اور رعیت کے ساتھ عدل وانصاف کا برتاؤ کیا، خدا آپ کو ان تمام خدمات کی جزائے خیر دے گا۔"

یہ سُن کر حضرت عمرؓ نے کہا: "کیا قیامت کے دن میرے حق میں اِن خدمات کی گواہی دو گے؟"

ابن عباس نے کہا: "جی ہاں۔"

حضرت عمرؓ رونے لگے اور کہا: "اگر ساری دنیا میری ہوتی تو قیامت کے ہول وبیم سے بچنے کے لئے میں اس کو دے ڈالتا، اے کاش جب میں دنیا سے جاتا تو میرا حساب برابر ہوتا، نہ مجھے کوئی انعام ملتا نہ کوئی عذاب!" اس کے بعد لوگوں سے مخاطب ہوکر کہا: بھائیو، جب میں مرجاؤں تو تین دن تک طلحہ کی واپسی کا انتظار کرنا،

اس کے بعد ان چھ افراد میں سے جن کو میں نے نام زد کیا ہے کسی ایک کو جو خلافت کا زیادہ اہل ہو امیر بنالینا، اور جب اس معاملہ پر مشورہ کرنے بیٹھو تو میرے لڑکے عبداللہ کو بھی شریک کرلینا، لیکن خلافت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے خلیفہ کے انتخاب تک صہیب امامت کریں گے، انتخاب کے بعد اگر کوئی شخص خلیفہ کی بیعت یا اس کو امیر ماننے سے انکار کرے تو اس کا سر کاٹ لینا، میں اپنے جانشین خلیفہ کو تاکید کرتا ہوں کہ

(۱) مہاجر و انصار کی خدمات و مرتبہ کا لحاظ رکھے اور ان کی حق تلفی نہ ہونے دے ان میں جو نکوکار ہوں، ان کو نوازے اور جو خطاکار ہوں ان کو معاف کرے۔

(۲) رعایا کو خوش و خرّم رکھے کہ انھی پر حکومت کی آمدنی کا انحصار ہے اور وہ حکومت کے وفادار ہو چکے ہیں۔

(۳) جب کسی دشمن ملک سے مال غنیمت آئے تو مساویانہ تقسیم کرے۔

(۴) ذمی لوگوں کے ساتھ نرمی اور انصاف کا برتاؤ کرے کوئی زیادتی ان پر نہ ہونے دے اور ان کی طاقت سے زیادہ ان سے کچھ وصول نہ کرے، اور جو عہد ان سے کئے گئے ہیں، ایمانداری سے ان کی پابندی کرے، کہ وہ خدا اور رسول کی امان میں آچکے ہیں۔

(۵) عربوں کے ساتھ بھی حسن سلوک سے پیش آئے کہ وہ اسلام کے جوہر اور بزرگ ہیں، اور جو زکاۃ ان پر واجب ہو بغیر کسی ظلم کے وصول کرے اور اس کو غریب عربوں پر انصاف کے ساتھ تقسیم کرے۔"

یہ کہہ کر اپنے لڑکے عبداللہ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: "بیٹے میرا سر تکیہ سے اٹھا کر زمین پر رکھو، شاید خدا مجھ پر ترس کھا کر رحم فرمائے۔ پھر کہا: عائشہ کے پاس جاؤ اور کہو کہ مجھ کو رسول اللہ اور ابوبکرؓ کے پہلو میں دفن ہونے

کی اجازت مرحمت کریں، اگر اجازت مل جائے فبہا ورنہ مسلمانوں کے قبرستان میں داب دو۔ عبداللہ حضرت عائشہؓ کے پاس گئے اور اجازت طلب کی۔ حضرت عائشہؓ نے کہا: امیرالمومنین سے میرا سلام عرض کرنا اور کہنا کہ زمین کا وہ ٹکڑا جو میرے والد کے پہلو میں بچ رہا ہے اور ایک قبر سے زیادہ وسعت نہیں رکھتا، میں نے اپنے لئے رکھا تھا، مگر میں آپ پر قربان کرتی ہوں، عبداللہ نے جاکر حضرت عائشہؓ کا یہ پیام سنایا تو حضرت عمرؓ بہت خوش ہوئے۔ چہار شنبہ کے دن بعد نماز مغرب مطابق ۲۶ ذوالحجہ ۲۳ھ کو انھوں نے وفات پائی۔ علمائے تاریخ نے کہا ہے اس وقت ان کی عمر تریسٹھ ۶۳ سال تھی۔

علمائے تاریخ نے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کو نہلانے کا کام ان کے غلام افلح کے سپرد کیا، افلح نے غسل دیا، حنوط لگایا اور کفن پہنا کر تختہ پر لٹایا، پھر لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا: لوگو، یہ ہیں عمرؓ بن خطاب جو دنیا چھوڑ گئے اور خدا کی رحمت سے مل گئے، محمدؐ کی امت کے ایک رکنِ عظیم تھے، حق و باطل میں فرق کرتے تھے، کسی کی ملامت ان کو راہِ حق پر چلنے سے باز نہ رکھتی تھی، مومنوں پر مہربان تھے، مسلمانوں پر شفیق، کافروں کے ساتھ سخت، درویشوں، یتیموں اور بیواؤں کی پناہ تھے، خود نہ کھاتے مگر بھوکوں کو کھلاتے، خود نہ پہنتے مگر ننگوں کو پہناتے، دنیا میں رہے مگر دل نہ لگایا، خدا کے احکامات نافذ کرنے میں کوتاہی نہ کرتے تھے جو کہتے کر ڈالتے، گویا خدا نے ان پر کوئی فرشتہ مامور کر دیا ہو جو ان کو صحیح کام کرنے اور حق بات کہنے پر قایم رکھتا تھا، ان پر خدا کی رحمت ہو۔" یہ کہہ کر افلح نے صہیب سے کہا: "آیئے نماز جنازہ پڑھایئے، عمرؓ نے نماز پڑھانے کی آپ کو ہدایت کی ہے۔" صہیب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ کا تابوت رسول اللہؐ کے مزار کی طرف اٹھالے چلے۔ مدینہ کے سب لوگ جنازہ دیکھ کر روتے تھے، ہر طرف سے رونے کی آوازیں اٹھ رہی تھیں، لوگ بے انتہا غمگین تھے۔[1]

---

[1] فتوح صفحہ ۴۲

ترکوں میں مذہبی احساسات کی بیداری

از

(ہاورڈ، اے، رِیڈ، ناظر ادارۂ مطالعات اسلامی، میک گل یونی ورسٹی)

مترجم

(کپتان محمد قطب الدین احمد صاحب بی۔ اے)

کچھ عرصہ سے ترکی میں عام طور پر اسلام کے ساتھ ایک دل چسپی پیدا ہو گئی ہے۔ اب اس بات میں شاید ہی کسی کو شبہ ہو کہ ترکی کی غالب اکثریت مسلمان باشندوں پر مشتمل ہے۔ اور انھیں اپنی اس حیثیت پر فخر و ناز ہے۔ اس صورتِ حال نے اربابِ حل و عقد کو چند در چند مسائل سے دوچار کر دیا ہے۔ وہ اس امر کے لئے کوشاں ہیں کہ مذہب کے ان فطری جذبات کو ترکی کے دنیادارانہ، ترقی پسند اور انقلابی سرگرمیوں کے ساتھ ہم آمیز کر دیں تاکہ یہ آئندہ کسی ظلمت پسند ردِ عمل کی صورت اختیار نہ کرنے پائے۔ اگر یہ اس سیاسی و ثقافتی گتھی کے سلجھانے میں کامیاب ہو جائیں، تو ان کی یہ کامیابی نہ صرف ترکی کے لئے بلکہ تمام عالم اسلامی پر اس کے دور رس نتائج مترتب ہوں گے۔

ترکانِ آلِ عثمان کے اسلامی روایات

بحیثیت ایک قوم اور حکومت کے ترک ہمیشہ سے ایک راسخ العقیدہ، حنفی المذہب، سنی رہے ہیں۔ اسلام کے ساتھ ان کا اندازِ فکر ہمیشہ آزادانہ رہا ہے۔ وہ اپنے حکمرانوں سے بھی اس بات کے آرزومند تھے کہ ایسے قوانین جو اصلاً دنیوی یا عرفی نوعیت کے حامل ہوں، ان کا وضع و نفاذ شرعی قوانین کے پہلو بہ پہلو کیا کریں، خواہ ان میں سے کوئی شریعت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس خصوص میں ان کے سلاطین نے کسی طرح مایوس ہونے نہ دیا۔ سلطان محمد فاتح اور سلیمان اعظم جیسے سلاطین کی قانون سازیاں اگرچہ کہ ابتداءً اراضیات اور انتظامی معاملات تک

محدود تھیں، لیکن ان کی زد میں شریعت پر بھی پڑتی رہیں، اور بعض اوقات تو خود شریعت کو ان کے لئے اپنی جگہ خالی کرنی پڑی۔ ۱۸۵۰ء اور خاص کر ۱۸۳۹ء کے بعد والے دور میں ترکوں کی توضیعات قانون نے شریعت کو اپنا تابع کر لیا، اور ۱۹۲۶ء کے بعد سے تو ان قوانین نے شریعت کو بالکل پس پشت ڈال دیا۔ دائرۂ قانون میں ایک عرصہ سے ترکوں کا اندازِ فکر یک گونہ آزادی کی طرف مائل رہا ہے

دوسری قابلِ لحاظ یہ حقیقت ہے کہ دولت عثمانیہ کے برسرِ عروج آنے کے بعد سے غیر مقلدانہ، متصوفانہ، اور درویشانہ تنظیمات نے، جو بعض اوقات کھلے طور پر ایران کی صفوی سلطنت سے دوستی کا دم بھرتے تھے، ترکی کی مذہبی زندگی، علی الخصوص دیہات وقریات کی آبادیوں پر اپنا گہرا اثر ڈالا ہے۔ یہاں صرف ینی چری بکتاشی گروہ بندی اور فتوت تنظیمات یا سلطان سلیم کی ان سخت گیریوں کو پیش کرنا کافی ہوگا جو اس نے اناطولیہ میں ایک شیعہ سازشی گروہ کو ختم کرنے میں کام میں لائی تھیں تاکہ اس قسم کی بدعقیدہ جماعتوں کی طاقت واہمیت کا اندازہ ہو سکے۔ ان باتوں سے ہمیں اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ خالص مذہبی معاملات میں بھی ترک کس قدر آزاد خیال اور جدت پسند واقع ہوئے تھے۔

جب ہم اپنے قریبی دور پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالبًا مسلمانوں میں پہلا روشن خیال طبقہ، ترکوں کی وہ جماعت تھی جو انقلاب فرانس کے تصورات سے اولاً متاثر ہوئی اور انیسویں صدی میں اسلام کے ساتھ وابستہ رہ کر مغربی طریقوں کو اپنے ملک میں رواج دینا چاہا۔ نامق کمال اس گروہ کا ایک سربرآوردہ رکن تھا۔ اس کی شہرت وناموری کا زمانہ وہ تھا جب کہ جمال الدین افغانی ترکی میں قیام پذیر تھے لیکن اسلام کے ان دو پرجوش حامیوں میں باہم کسی قسم کے تعلق کا پتہ نہیں چلتا۔ ان کی کوششیں یہ تھیں کہ مغربی اصول وآدابِ فن کے ذریعہ نئی قوتِ حیات اور جوش وسرگرمی کے حصول کے ساتھ مشرق کے مسلم علاقوں کو سیاسی آزادی دلائیں۔

اس صدی کے اوائل میں ہم ترکی میں اربابِ دانش کے تین مکتبِ خیال سے دوچار

ہوتے ہیں۔ یہ تمام کے تمام اس کام پر وقف ہو چکے تھے کہ اپنے ملک کو عروج و ترقی کے بلند سے
بلند زینوں پر پہنچائیں۔ ان میں سے ایک جماعت کا سرگروہ محمد عاکف تھا جو ایک زبردست مذہبی شاعر
اور سر محمد اقبال کا بے انتہا دوست تھا۔ اس کی یہ کوشش تھی کہ اسلام کی نشاۃِ جدید خود اسلام
ہی کے ذریعہ حاصل کی جائے، دوسری ایک جماعت احمد رضا اور عبداللہ جودت سے منسوب،
اور روایاتی مذہب کا مضحکہ اڑایا کرتی تھی۔ یہ یا تو منکرِ دین و مذہب تھے یا اس بات پر اعتقاد
رکھتے تھے جسے ہم دنیا پرستی سے موسوم کر سکتے ہیں۔ تیسرا ایک ایسا گروہ تھا جو اس بات کا
آرزومند تھا کہ ترکی بولنے والی تمام ہم نسل قوموں کو ایک قسم کی ہمہ تورانی مملکت میں متحد،
اور مغربی اصول آدابِ فن کو انتخابی طریق پر اختیار کرے۔ ضیاء گوک آلپ، (Zia Gokalp)
ماہر فلسفہ اجتماع۔ ترکیت اور اسلامیت کو باہم سمونے کا حامی تھا۔ اس کا شمار اصل و روح
کے اعتبار سے اس تیسرے گروہ میں کیا جاتا ہے۔ ترکوں کی نوجوان نسل ۱۹۰۸ء کے بعد جب
برسرِ اقتدار ہوئی تو ان ہر سہ جماعتوں کی باہمی مجادلت، اور خود اپنے متلون و متناقض تصورات
قومیت، عثمانیت، اور دستوریت کے نرغے میں پھنس گئی۔

نوجوان ترکوں کی یہ چند سری حکومت نے بہت جلد ایک انقراض پذیر سلطنت کو
جنگ عظیم اول کی آگ میں جھونک دیا۔ خلیفہ کا اعلانِ جہاد خود اسی پر پلٹ پڑا جب کہ
ہندوستان اور عرب کے مسلمان، باوجود غیرت و حمیتِ اسلامی کے دعوؤں کے، ترکی کے خلاف
صف آرا ہو گئے۔ تاہم اس جنگ سے یہ اہم نتیجہ برآمد ہوا کہ آزادیِ نسواں کی تحریک کو اس سے
بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ مساعیِ جنگ میں ان کی روز افزوں تعداد نے ان مردوں کی جگہ
پر نرسوں، محرروں، معلموں اور کارخانے کے مزدوروں کی حیثیت سے عملی طور پر کام کرنا شروع
کیا جو اس وقت مصروفِ کارزار تھے۔ ۱۹۱۶ء میں سیول میرج (Civil Marriage)
کو چند مناسبِ حال ترمیمات کے ساتھ جاری کیا گیا جس میں فوری علیحدگی یا طلاق کے خلاف
بہت سے تحفظات رکھے گئے تھے۔ کثرتِ ازدواج پر بھی سخت پابندیاں عائد کی گئیں جو اس

وقت کے تعلیم یافتہ طبقہ کے عین موافق تھیں۔ اس میں یہ گنجائش رکھی گئی تھی کہ ایک سے زیادہ شادی بلا زوجہ اول کی تحریری اجازت کے عمل میں نہ لائی جائے۔ اسی سال تعلیم نسواں کے سلسلہ میں ایک قدم اور آگے بڑھایا گیا، اور استنبول یونیورسٹی میں لڑکوں اور لڑکیوں کی یکجائی تعلیم کا آغاز ہوا۔ ۱۹۱۷ء میں شرعی قانون کی عدالتیں وزارت عدالت دیوانی کے تحت کر دی گئیں

اتاترک کا دور

اتاترک نے انقلاب کے سلسلہ میں جو اصلاحی کام انجام دئے، ان کی کامیابی بہت کچھ ترکوں کے طرز و روش کی تغیر پذیری اور ان روایات کی رہینِ منت ہے جو ان میں ایک عرصہ دراز سے اسلام کی بابت آزادانہ رہی ہیں۔ انقلابی اصلاحات جو یکے بعد دیگرے اتاترک کی طرف سے عمل میں لائے گئے، ان کی ترتیب حسب ذیل تھی:۔

(۱) ملوکیت کا خاتمہ ۱۹۲۲ء؛

(۲) جمہوریت کا قیام ۱۹۲۳ء؛

(۳) خلافت کی برخاستگی، مدرسوں، مکتبوں کی مسدودی، اور حکومت کی نگرانی میں ایک متحدہ تعلیمی نظام کا اجرا ۱۹۲۴ء؛

(۴) درویشی نظامات کی موقوفی، اور ان کے متعدد زاویوں اور تکیوں کی مسدودی، مشاہیر اولیاء کی درگاہوں کو بند کرنا اور اس کے ساتھ یورپی لباس اور ہیٹ (Hat) کا استعمال ۱۹۲۵ء؛

(۵) مغربی آئین و قوانین کی طرف رجوع، (جن کی طرف اشارہ عہدِ تنظیمات اور ترک نونہالوں کی قانون سازی میں پایا جاتا ہے)، مغربی بین الاقوامی تقدیم اور اوزان و پیمانہ جات کا استعمال ۱۹۲۶ء؛

(۶) ابتدائی و ثانوی مدارس میں عربی و فارسی تعلیم کی موقوفی ۱۹۲۹ء؛

(۷) عورتوں کو رائے دہی کا حق اور سرکاری خدمات عطا کرنا ۳۵-۱۹۳۰ء؛

(۸) خطیبوں اور پیش اماموں کے مدرسوں کی موقوفی اور استنبول یونیورسٹی سے شعبۂ دینیات کی برخاستگی، (حالانکہ ان سب کو ۱۹۲۴ء کے جدید تعلیمی نظام میں برقرار رکھا گیا تھا) ۱۹۳۳ء

(۹) اور آخر میں غیر مذہبیت اور انقلابیت کو ترکی دستور کے دو اساسی اصولوں کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا، ۱۹۳۷ء

اتاترک کے پندرہ سالہ دور قیادت میں اجتماعی عبادات، اور مذہبی رسوم و اعیاد کی مقبولیت میں نمایاں طور پر انحطاط واقع ہوا۔ حکومت کی طرف سے نہ صرف عام مذہبی امور سے بے اعتنائی برتی گئی بلکہ مسلمانوں کے معاملات پر بھی سختی سے نگرانی کی جانے لگی۔ ۱۹۲۴ء میں ایک انتظامی محکمہ قایم کیا گیا، لیکن اس کو بعد میں نظارت امور مذہبی کی باقاعدہ حیثیت دے کر وزارت عظمیٰ سے وابستہ کر دیا گیا۔ یہ اس لئے قایم کیا گیا تھا کہ ترکوں کی قومی مذہبی زندگی کی رہنمائی کرے اور اس کو جزوی طور پر اپنے اختیار میں رکھے: اماموں، مفتیوں، متولیوں، اور اس قسم کے دیگر اہل خدمات کو صداقت نامے عطا کرے اور نیز ان کی تنخواہوں کی ادائی کا بندوبست کرے۔ اماموں اور مفتیوں کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ سرکاری اجازت یافتہ ہوں۔ بجز دیہات کے ان سب کی حیثیت فی الحقیقت سرکاری ملازمین کی سی تھی۔ ترکی میں مذہبی معاملات کی ذمہ داری نظارت امور مذہبی، نظامت اوقاف، اور وزارت تعلیم میں منقسم ہے۔ اس کے سبب کسی ایک محکمہ کے لئے یہ دشوار ہو گیا ہے کہ وہ ان پر بالکلیہ قابو و اختیار پا سکے۔ سابقہ غیر ذمہ دار اور سیاسی طور پر ذی اثر طاقتوں کو قابو میں رکھ کر یہ نگرانی اس غرض سے ضروری سمجھی گئی کہ اسلام اور حکومت میں بلا شائبہ ایک کھلا امتیاز قایم رکھا جائے۔ مگر اس پر یہ نکتہ چینی ہوتی رہی کہ یہ ایک بالکل غیر اصولی چیز ہے، اور مشکل سے اس پر غیر مذہبی ہونے کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ ان کاموں کے جواز و عدم جواز میں خواہ کوئی بھی استدلال پیش کیا جائے، لیکن اس کا اثر ترکوں کی زندگی میں ایک جذباتی، ذہنی، اور روحانی خلاء کی صورت میں ظاہر ہوا جس کی تلافی اس وقت مذہب کے ساتھ ایک والہانہ جوش اور سرگرمانہ دلچسپی سے کی جا رہی ہے۔

۱۰ر نومبر ۱۹۳۸ء کو اتاترک کی موت نے قوم کو رنج و غم میں مبتلا کر دیا، اور اسی گریہ ماتم
کے دوران میں مساجد میں نمازیں ادا کی گئیں، جن کی پابندی سالہا سال سے موقوف ہو چکی تھی۔
پندرہ سال کے بعد نومبر ۱۹۵۳ء میں جب ان کی لاش عجائب گھر سے اینت تپے (Anit Tepe)
کے شاندار مقبرہ میں منتقل کی گئی تو پچاس ہزار آدمیوں کے اژدحام سے یہ مقام کھچا کھچ بھرا ہوا تھا
جس کے سبب کچھ حادثات بھی واقع ہوئے۔ بہت سے لوگ ریلوں، بسوں اور پا پیادہ اناطولیہ
کے دور دراز علاقوں سے یہاں پہنچے تھے تاکہ اپنے محبوب و محترم قائد کی خدمت میں نذرِ عقیدت
پیش کریں۔ ناظرین کا بیان ہے کہ ترکی کی تاریخ میں یہ موقع اپنی اثر انگیزی اور عبرت پذیری کے
لحاظ سے اپنی آپ نظیر تھا۔

اتاترک کا جانشین عصمت انونو ایک سپاہی منش و موقع شناس شخص تھا۔ یہ مذہبی معاملات
میں اتاترک کے مقابلے میں کہیں زیادہ اعتدال پسند واقع ہوا تھا۔ چنانچہ اس کے برسرِ اقتدار
آتے ہی فضا میں تبدیلی رونما ہوئی۔ ممکن ہے حالات سے وقوف و آگہی کی محض یہ ایک تدبیر
ہو، مگر یہ چیز پیشِ نظر رہے کہ پہلے ہی سال عصمت انونو اور ترکی کی وزارت تعلیم نے استنبول یونیورسٹی
کے شعبۂ دینیات کی نگرانی میں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے ترکی زبان میں ترجمہ کرنے اور
اس پر نظرِ ثانی کرنے کی منظوری عطا کی۔ اس کی ادارت پر مشہور اہلِ علم، طبیب، اور مؤرخِ
علوم، عبدالحق عدنان آدیور (Adnan Adivar) کو مامور کیا گیا، جو حال ہی میں خود اختیار کردہ جلاوطنی
سے اپنے وطن کو واپس ہوا تھا۔ اسی زمانہ میں وزارت تعلیم کی سرپرستی میں دنیا کے ادبیاتِ
عالیہ کا ترکی زبان میں ترجمہ بڑا معنی خیز ہے، کیونکہ جن ادبیاتِ عالیہ کا انتخاب کیا گیا تھا ان میں
سے ایک زائد حصے کا تعلق مغربی ممالک سے تھا۔ یہ کام ۱۹۵۲ء تک شرمندۂ عمل نہ ہو سکا اس وقت
ایک کمیشن نے اپنی یہ تجویز پیش کی کہ جدید ترکی میں اسلامی ادبیات عالیہ کے ترجمہ و اشاعت کا
انتظام کیا جائے جو اصلاً عربی، عثمانی ترکی، اور دیگر زبانوں میں موجود ہیں۔ ۱۹۳۸ء اور دوبارہ
۱۹۴۲ء میں واقفلار درگیسی (Vakiflar Dergisi) کی شاندار اشاعتیں منظرِ عام

پرآئیں۔ یہ ایک جدید رسالہ تھا جو اس محکمہ کی طرف سے شائع کیا جاتا تھا جس کے تحت مذہبی اوقاف تھے

مابعد جنگ کے رجحانات

جنگ عظیم ثانی کے نازک دور میں یہ ایک فطری تقاضہ تھا کہ ترک اپنی بقا و سلامتی کے لئے خالقِ کائنات کی طرف صدق دل سے رجوع ہوں، لیکن نئی نسل کی ایک کثیر تعداد مذہبی رسوم اور طریقہائے عبادت سے یکسر ناآشنا تھی کیوں کہ خاندان اور حکومت کی طرف سے تقریباً نصف صدی کی غفلت نے انھیں دینی تعلیم سے محروم کر رکھا تھا۔ اگرچہ کہ ۱۹۴۱ء میں ہر فوجی جماعت کے لئے ایک امام دوبارہ مقرر کیا گیا تھا، مگر چند ہی تعلیم یافتہ مذہبی پیشوا دستیاب ہو سکے تھے۔ تاہم بہت سے اصحاب خیر ایسے تھے جو اس نیک کام پر کثیر رقم خرچ کرنے پر آمادہ تھے۔ ان میں پیش پیش دہی کورج (Dehi Koc) کی شخصیت تھی، جو ایک متمول تجارت پیشہ طبقہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے مساجد کی تعمیر و ترمیم، عبادات پر تحریص و ترغیب اور مذہبی تعلیم کے انتظام پر ایک معتدبہ رقم صرف کی اور ترکوں کو اپنے عظیم اسلامی ورثہ سے روشناس کرایا۔ ۱۹۴۵-۴۹ء میں سالہا سال کے بعد پہلی مرتبہ پارلیمان میں مذہبی تعلیم کی بابت سوالات کئے گئے اور ان پر نہایت توجہ و دل جوئی کے ساتھ غور و تامل کیا گیا۔

۱۹۴۵ء کے بعد مخالف سیاسی پارٹیوں کے فروغ پانے نے مذہب کے ساتھ دل چسپی کو اولیں حیثیت عطا کی۔ حریف امیدوار جو پہلے کسی سیاسی اساس پر مذہب سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کرتے تھے، اس روش کو بالکل بدل ڈالا، اور سیاسی جدوجہد میں مذہب کے نام پر خوش آئند وعدوں سے عوام کو اپنی طرف راغب کرنا شروع کیا۔ مارشل فوزی چقماق، جو جنگ آزادی کا بطل حریت اور ایک باخدا مسلمان ہے۔ ۱۹۴۸ء میں اس نے ملت پارٹی کی بنا ڈالی، اس میں بہت سے قدامت پسند اور وہ لوگ جو روایاتی اسلام میں ایک نئی روح پھونکنے کے آرزومند تھے، اس کے گرد جمع ہو گئے ایک دوسری نہایت اہم چیز ان سیاسی پارٹیوں کے فروغ پانے

سے یہ رونما ہوتی کہ اسلام کے تعلق سے زیادہ سے زیادہ آراء حاصل کرنے کی جو جدوجہد جاری تھی اس میں تمام پارٹیوں اور خاص کر عمومیت پسندوں نے اس طبقہ کی طرف رجوع کیا جو دیہاتی آبادی پر مشتمل تھا اور جس کو لمبا اوقات نظر انداز کیا جاتا رہا تھا۔ اصحاب سیاست کو جب اس بات کا پتہ چلا کہ صوبوں کے مرکزوں اور بڑے شہروں سے زیادہ قصبات میں اسلام کے ساتھ وابستگی پائی جاتی ہے، تو انھیں اس پر یک گونہ استعجاب ہوا، تاہم یہ چیز جلال بایار اور پروفیسر فواد کوپرلو (Koprulu) جیسے ماہرین کے لئے باعث حیرت نہ تھی۔ انھیں نئے سرے سے اس امر کا احساس ہوا کہ دیہاتی زندگی میں اسلام کو خاص اہمیت، عزت اور قوت حاصل ہے، اور ان کے نزدیک یہ بے انتہا عزیز ہے۔ اہل سیاست نے فطری طور پر ان کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے اسلام پر زیادہ توجہ دینے کے وعدے کئے اور اپنے سیاسی مقاصد کے حصول میں ان کے ان مذہبی جذبات سے کھیلنا چاہا۔

ان سیاسی اغراض و مقاصد کے تحت پیدا شدہ حالات کے پہلو بہ پہلو ہم ایک مستقل انداز پر ایسے کاموں اور خدمات کا ایک سلسلہ پاتے ہیں جنھیں عامۃ الناس کی سرپرستی حاصل ہے، اور جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مذہب کے ساتھ محبت و دل چسپی نے پھر سے ایک نئی زندگی حاصل کر لی ہے۔ اس کے ثبوت میں مندرجہ ذیل واقعات کو پیش کیا جا سکتا ہے:- خانگی طور پر مسجدوں کی تعمیر اور رقمی اعانت، ؛ مذہبی تعلیم کا خانگی انتظام ؛ فریضۂ حج کی ادائی اور مقامی درگاہوں کی زیارت ؛ جمعہ و جماعات کا قیام اور ماہ صیام میں روزوں کی پابندی ؛ نماز جماعت کے لئے کثیر تعداد کی حاضری بلکہ بعض دفعہ اژدھام ؛ مذہبی لباس پہننے والوں کا احترام ؛ روزمرہ کی بول چال میں مذہبی فقروں اور دعائیہ کلمات کی مقبولیت ؛ پبلک مقامات، لبسوں اور ٹیکسیوں پر آیات قرآنی اور طغروں اور نقشوں کا استعمال ؛ مذہبی نظامات کی روز افزوں ہر دلعزیزی، (اگرچہ درویشی نظامات پر ہنوز قانونی امتناع عائد ہے) ان مطبوعات کی کثرت جو خالصاً دینی ذوق کی تکمیل پذیری کرتے ہیں ؛ اخبارات و رسائل

کے زائد حصہ کا دیگر اسلامی ممالک کے واقعات سے مملو ہونا، نوری دلمی راغ (Demirağ) اور رؤف آر بے (Resul Rauf) جیسے سربرآوردہ اشخاص کا بیرون ملک اسلامی موتمروں میں شرکت کے لئے جانا، مذہبی پیشواؤں اور مبلغوں کی تعلیم و تربیت کے لئے عوام کی طرف سے سرکاری مدارس کو رقمی امداد، طلبار کی کثیر تعداد کا ان اداروں اور انقرہ یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات میں داخل ہونا، چودھویں صدی کے ترکی شاعر سلیمان چلپی کی مشہور نظم مولود شریف کا مذہبی مجلسوں اور تقریبی جلسوں میں پڑھا جانا، ہر شعبۂ زندگی میں مذہبی معاملات پر بحث و گفتگو کا عوام میں شدید ذوق و میلان، اور ان پر نقد و تبصرہ کی ان میں حقیقت پسندانہ و ناقدانہ صلاحیت، دیہات و قصبات میں مناسب قابلیت رکھنے والے پیش اماموں کا مطالبہ، اور آخر میں کھلے طور پر اس بات کا عام اقرار کہ بہت سارا وقت ان معاملات پر کافی توجہ دئے بغیر گذار دیا گیا اور اب ملت اور اس کے افراد پر یہ لازم ہے کہ اپنے اس روحانی ورثہ کو دوبارہ جانچیں اور خود کو اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر دیں، اس کامل انقیاد اور مخلصانہ اطاعت کا اسے ہر طرح کا حق حاصل ہے۔

حکومت کی جانب سے انتظامات و تدابیر

ایک حد تک اپنے طور پر اور عام مطالبہ سے مجبور ہو کر حکومت نے اسلام کی طرف توجہ دینے اور گذشتہ کوتاہیوں کی تلافی کرنے کے لئے اس سلسلے میں کئی اقدامات کئے ہیں۔

۱۹۵۰ء میں عربی اذان پر سے پابندی اٹھا دی گئی، چنانچہ اب عربی یا ترکی میں ہر طرف اذان سنی جاتی ہے جو بالعموم عربی میں ہوتی ہے حکومت کی نشریات میں تلاوت قرآن کا ایک مقرر پروگرام رہتا ہے مئی ۱۹۵۵ء تک واقعہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی اختیار نہیں کی گئی جو کھلے بندوں غیر آئینی مذہبی لباس زیب تن کئے پھرتے ہیں، جن کا استعمال عورتوں اور مردوں کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ تاہم اس رجعت پسندانہ میلان کی طرف اخبارات میں تشویش کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے، اس بنار پر حفاظتی دستوں کے نام یہ عام حکم جاری کیا گیا کہ رمضان

میں عوام لباس سے متعلق آئین شکنی کے مرتکب ہو رہے ہیں اور بلا چھجے کی ٹوپی اوڑھے ہوئے باہر نکلتے ہیں، ایسے خلاف ورزی کرنے والوں کو قید و جرمانہ کی سزا دی جائے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد کئی ایک مقبروں کی مرمت کی گئی اور انھیں عوام کے لئے کھول دیا گیا۔ ان میں سے بعض حسب سابق مرکزِ عقیدت و زیارت بنے ہوئے ہیں۔

نوجوان نسل میں عام جہالت و لاعلمی کو دور کرنے کی تعمیری جدوجہد کے تحت ۱۹۴۹ء میں ابتدائی مدارس میں زائد از اوقات مذہبی تعلیم کی رضاکارانہ اجازت دی گئی بشرطیکہ والدین اپنے بچوں کے لئے اس بات کی درخواست کریں اور اس خدمت کے لئے رضاکارانہ طور پر کام کرنے والے معلمین فراہم ہو جائیں۔ ۱۹۵۰ء میں یہ شرائط بالکل منقلب کر دئے گئے۔ اب تمام مدارس میں مذہبی تعلیم، نصاب کا ایک لازمی جزء ہے۔ جو والدین اپنے بچوں کو اس کی تعلیم دینا نہیں چاہتے انھیں اس سے مستثنیٰ رکھنے کی درخواست دینی پڑتی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ چند بیرونی غیر مسلم طالب علم جو ترکی کے ابتدائی مدرسوں میں شریک ہیں وہ اپنے والدین کے علم کے بغیر باقاعدہ مذہبی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ایک ولندیزی بچہ نے انقرہ میں اپنے خاندان کو حیرت و استعجاب میں ڈال دیا جب کہ اس نے مجھ سے یہ بات کہی کہ وہ اسلام کی بابت کافی واقفیت رکھتا ہے اور اسلام سے متعلق اس کے اتنے ہی معلومات ہیں جتنے کہ اس کے دوسرے ترکی ساتھی رکھتے ہیں۔

باقی

ادبیات

غزل

از

(جناب آلم مظفرنگری)

بدل گیا ہے خودی سے مذاقِ رندانہ
حریمِ عشق نظر آرہا ہے مے خانہ

یہ بزمِ شوق کی تنظیم اے معاذ اللہ
سبھی ہیں سوز بدل شمع ہو کہ پروانہ

سمجھ رہے ہیں جسے رند آج دامنِ تر
یہی بنے گا کسی روز ابرِ مے خانہ

ہر ایک گوشہ ہستی بفیضِ حسنِ مجاز
بنا ہے اہلِ نظر کے لئے صنم خانہ

سکوتِ شمع سر بزم کو خبر ہی نہیں
تڑپ رہا ہے ازل سے مذاقِ پروانہ

ہے رشکِ محفلِ بادہ مقامِ خلوتیاں
ہر ایک سمت چھڑا ہے سرودِ مستانہ

زبانِ حال سے ہے گرمِ نالہ ہر ذرّہ
ہے کائنات کسی کے ستم کا افسانہ

بہارِ گلشنِ ہستی کا اعتبار نہیں
برنگِ سبزہ یہاں پھول بھی ہیں بیگانہ

تسلط اس پہ نہ کرلیں کہیں چمن والے
جنوں طراز نہیں ہے یہاں جو ویرانہ

نظر میں اس کی سوائے ہدف کچھ اور نہیں
خدنگِ حسیت کی پرواز ہے حکیمانہ

رموزِ عقل سے واقف نہیں آلم شاید
ہر ایک بات ہے اس کی حدیثِ رندانہ

غزل

(سعید احمد اکبرآبادی)

کلکتہ کے ایک مخصوص مشاعرہ منعقدہ ۳۱ر دسمبر ۵۴ء کی ایک طرحی غزل؛

جہاں میں قدرِ کمال و ہنروری نہ رہی
نیازِ عشق کو حاصل وہ سروری نہ رہی

غرورِ حسن کا ہرگز نہیں گلہ تم سے
ملال یہ ہے کہ توقیرِ بندگی نہ رہی

حجابِ ضبط اٹھا داغِ دل ہوا ظاہر
چراغِ طور بجھا دو کہ تیرگی نہ رہی

فریبِ قلب و نظر ہے وصال و ہجر کا فرق
شکایتِ غمِ ہجراں رہی کبھی نہ رہی

وہ نشترِ نگہِ ناز کیا ہوا اے دوست
دل و جگر میں بہم صلح و آشتی نہ رہی

بلاکشانِ محبت ارے معاذ اللہ
ہوئی اب ان کی وہ حالت کہ گفتنی نہ رہی

جگر کے پار ہوا تیرِ نیم کش تیرا
وہ دل لگی ہی سہی یہ تو دل لگی نہ رہی

وہ سن کے حالِ تبہ مسکرا دیے شاید
کہ شامِ غم میں وہ پہلی سی تیرگی نہ رہی

زہے نصیب بالطافِ یک نگاہِ کرم
حیاتِ عشق کبھی درد سے بری نہ رہی

ہوا ہے رنگِ پریدہ جمالِ خود آرا
حدیثِ دردِ محبت شنیدنی نہ رہی

کہاں چلے ہو سراسیمہ و پریشاں ہو
مریضِ عشق کی حالت تو دیدنی نہ رہی

ہر ایک گام پہ جلوے بہر قدم سجدے
جبینِ شوق کو درکار رہبری نہ رہی

یہ کیا ہوا ترے گلشن کو باغباں آخر
وہ رنگ و بو نہ سہی گل میں تازگی نہ رہی

پڑے ہیں قبر میں آسودۂ سکوں ہو کر
پہنچ گئے سرِ منزل تو خستگی نہ رہی

انھیں کے دم سے تھی رنگینیِ خیال و نظر
وہ کیا گئے کہ کسی شے میں دل کشی نہ رہی

ہزار شکر کہ آئے تو تم سرِ بالیں
مرا نصیب کہ آنکھوں میں روشنی نہ رہی

سعید زار ہے اب رہینِ جور و جفا
جہاں میں کیا رہ و رسمِ رفوگری نہ رہی

تبصرے

مذکرات سائح فی الشرق العربی

از مولانا سید ابوالحسن علی الندوی، تقطیع کلاں، ضخامت ۳۱۴ صفحات۔ ٹائپ جلی اور روشن۔ قیمت درج نہیں پتہ:۔ مکتبہ وہبہ نمبر ۱۴ شارع ابراہیم پاشا نجابدین قاہرہ۔

کئی سال ہوتے مولانا سید ابوالحسن علی نے مصر و شام کا سفر کیا تھا۔ چونکہ اس سفر کا مقصد خالص دینی اور تبلیغی تھا اس لئے موصوف نے ان دونوں ملکوں کے مذہبی اداروں کو دیکھا، اسلامی انجمنوں کے کارکنوں سے ملاقات کی، علما اور مشائخ سے، ارباب قلم و اصحاب علم سے دینی اور تبلیغی مباحث پر تبادلہ خیالات کیا۔ آج کل اسلامی ممالک کی جو حالت ہے وہ باخبر حضرات پر پوشیدہ نہیں ہے لیکن اگر ان ممالک کے لوگوں کو صحیح الخیال، پُرجوش اور باعمل علما کے مواعظ حسنہ سننے اور ان کے فیوض سے مستفید ہونے کا موقع ملتا رہے تو بہت کچھ اصلاح کی توقع کی جا سکتی ہے۔ مولانا موصوف تو اپنا مشن ہی یہ لے کر گئے تھے۔ چنانچہ جگہ جگہ انھوں نے تقریریں کیں اور ایک نہایت واضح اور غیر مبہم الفاظ میں اسلام اپنے ان علمبرداران اولین سے اس زمانہ میں جس چیز کا مطالبہ کرتا ہے اس کو ان کے سامنے پیش کیا۔ جو بات کہی گئی وہ حق تھی اور گفتگو بھی انھیں کی زبان میں تھی اس لئے اس کا خاطر خواہ اثر ہوا جو لوگ خواب غفلت میں سرشار تھے وہ کچھ چونک پڑے ہیں اور جو شکستہ خاطر و مایوس تھے ان میں کچھ گرمی پیدا ہو گئی ہے۔ مولانا موصوف نے زیرِ تبصرہ کتاب میں جو رشیق اور متداول عربی میں سفر کے روزنامچہ کے طور پر لکھی گئی ہے اپنے اسی سفر کی روئداد قلمبند کی ہے جو دلچسپ بھی ہے اور معلومات آفریں بھی۔ امید ہے کہ علماء اور طلبا خصوصاً اور مشرق وسطیٰ کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والے عموماً اس

کتاب کی قدر کریں گے۔

حضرت غوث الاعظم کے مواعظ حسنہ | مترجمہ مولانا عاشق علی میرٹھی مرحوم تقطیع کلاں ضخامت ۵۱۲ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت درج نہیں پتہ :- ادارۂ ایمان ویقین بمبئی ۸۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اکابر اولیا میں سے تھے اور فیوض وبرکات اور کمالات وحسنات کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی زبانِ حق ترجمان میں بڑی تاثیر رکھی تھی آپ کا وعظ اس قدر موثر ہوتا تھا کہ سامعین پر دیر تک وجد وکیف اور جزع وفزع کا عالم طاری رہتا تھا اور بعض اوقات تو ایک دو کا دم بھی نکل جاتا تھا۔ یہ کتاب حضرت کے ہی مواعظ حسنہ کا اردو ترجمہ ہے۔ ترجمہ بہت صاف، سلیس اور موثر ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ مواعظ دراصل حضرت شیخ کے ہیں بھی یا نہیں ؟ تو ایک ان مواعظ پر ہی کیا موقوف ہے اکابر اولیاء اللہ کے جو ملفوظات، مکتوبات یا اور تحریریں ان کی طرف منسوب ہیں آج ان میں سے اکثر کی حیثیت محققین کے نزدیک مشتبہ سمجھی جاتی ہے۔ تاہم اس کتاب میں رموزِ شریعت وطریقت اور غوامض ودقائقِ احکامِ الٰہی سے متعلق جو اشارات ملتے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر سب نہیں تو مواعظ کا ایک بڑا حصہ حضرت شیخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ضرور ہے۔ اس کا مطالعہ آنکھوں میں نور اور دل میں سرور کا باعث ہوگا۔

(۱) دار العلوم دیوبند کی تعلیمی خصوصیات
(۲) دار العلوم دیوبند ایک نظر میں
از جناب سید محبوب رضوی تقطیع متوسط کتابت وطباعت بہتر ضخامت ۳۲ صفحات قیمت ۶/ پتہ :- ادارۂ تاریخ دیوبند - دیوبند (یوپی)۔

جناب رضوی صاحب دیوبند اور دار العلوم کی تاریخ نگاری کا کام برسوں سے کر رہے ہیں، یہاں تک کہ انھوں نے ایک ادارہ ہی مستقل تاریخ دیوبند کے نام سے قائم

کردیا ہے یہ کام نہایت اہم اور عظیم الشان ہے اور لائق مرتب کے حسنِ ذوق سے توقع قوی ہے
کہ یہ تاریخ دیوبند کے شایانِ شان ہوگی۔ زیرِ تبصرہ دونوں رسالے بھی اسی سلسلہ کی دو کڑیاں
ہیں۔ ان میں سے پہلے رسالہ میں دارالعلوم کا نصاب۔ طریقِ تعلیم اور اس تعلیم کے ہمہ گیر اثرات
و نتائج پر گفتگو کی گئی ہے اور دوسرے رسالہ میں دارالعلوم کی عمارتوں۔ درس گاہوں۔ اقامت
خانوں اور دوسرے اداروں اور دفتروں کی عمارتوں کا مفصل اور واضح بیان ہے۔ دارالعلوم
دیوبند جو عالمِ اسلام کی اپنی نوعیت میں سب سے بڑی درسگاہ ہے اس سے متعلق یہ معلومات
ان حضرات کے لئے باعثِ مسرت و بصیرت ہوں گی جنھوں نے صرف دارالعلوم کا نام
سنا ہے اور اس سے براہ راست واقف نہیں ہیں۔

خلاصۂ فسانۂ آزاد از ابو تمیم صاحب فرید آبادی تقطیع متوسط ضخامت ۲۰۰ صفحات
کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد تین روپیہ پتہ:۔ کتب خانہ انجمن
ترقی اردو جامع مسجد دہلی۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد اردو زبان کا ایک ایسا شاہکار ہے کہ جواب
تک لاجواب اور اپنی شان میں بے نظیر ہی ہے، لیکن چونکہ چار ضخیم جلدوں میں ہے اس لئے
اول تو تاجروں کو اس کے چھاپنے میں زرِ کثیر صرف کرنا ہوتا ہے اور اگر وہ چھاپ بھی دیں تو
اب اتنی طویل کہانی کو پڑھنے کی فرصت کسے ہے۔ ابو تمیم صاحب فرید آبادی نے اسی بنا
پر فسانۂ آزاد کا خلاصہ کر دیا ہے جس میں ساری عبارت سرشار کی ہی ہے اور فسانہ کی جو اہم
خصوصیات ہیں یعنی لکھنؤ اور اس کی مختلف سوسائٹیوں کی تہذیب، ان کے طور طریق،
ان کی زبان اور محاورات۔ یہ سب چیزیں اس خلاصہ میں آگئی ہیں۔ فسانۂ آزاد نے سینکڑوں
کو اردو کا ادیب اور زباندان بنا دیا، اسی طرح امید ہے کہ اس کا یہ خلاصہ بھی نئی نسل کے ارباب
قلم کے ذوقِ ادب کو پختہ و ہموار کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوگا۔

پیامِ انسانیت | از مولانا سید ابو الحسن علی تقطیع خورد ضخامت ۱۰۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۰ ؍ پتہ :- مرکز اصلاح وتبلیغ لکھنؤ۔

یہ مولانا سید ابو الحسن علی کی ان پانچ تقریروں کا مجموعہ ہے جو موصوف نے جنوری ۵۴ء میں یوپی کے مختلف شہروں کے پبلک جلسوں میں کی تھیں۔ فاضل مقرر نے ان تقریروں میں جو موجودہ انسانی سوسائٹی کے فساد واختلال کے اسباب کا تجزیہ کرکے مذہب کی ضرورت اور خدا پرستی کی اہمیت پر حکیمانہ انداز اور دل نشین پیرایہ بیان میں کلام کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ موجودہ فساد کا اصل سبب انسانی مزاج کا فساد ہے، اس لئے جب تک خدا پرستی کے زبردست انجکشن کے ذریعہ اس کی اصلاح نہیں کی جائے گی ہمارا کوئی اقتصادی، سیاسی یا معاشرتی نظام خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کرسکتا۔ اصل جڑ کی جب تک اصلاح نہیں ہوگی محض شاخوں کی کاٹ چھانٹ مفید نہیں ہو سکتی۔ جیساکہ یہ تقریریں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے مخلوط مجمعوں میں کی گئیں اور دلچسپی اور عبرت آموزی کے کانوں سے سنی گئیں اسی طرح ان کا مطالعہ ہر شخص کو کرنا اور ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

حیاتِ انور

امام العصر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کے حالات وکمالات پر ایک نظر

"حیاتِ انور" میں اس صدی کے بے مثال محدث ومحقق امام العصر حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری کے حالات وکمالات پر مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد طیب صاحب مولانا اعزاز علی صاحب، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا محمد میاں دیوبندی، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا سید ابو ظفر ندوی، مولانا محمد انوری، مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے مبصرانہ مضامین تحریر فرمائے ہیں جس میں حضرت شاہ صاحب کے علوم وکمالات اور اخلاق وکردار کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب علوم قرآن وسنت کا ایک قیمتی ذخیرہ ہے جس کا مطالعہ عوام وخواص کے لئے مفید ہے ۲۰×۳۰/۱۶ سائز، ضخامت ۳۶۰ صفحات، کتابت وطباعت بہتر، مجلد مع ڈسٹ کور کی قیمت چار روپے للعہ،

ملنے کا پتہ :- **مکتبہ برہان اردو بازار دہلی**

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

بُرہان

جلد ۳۴ شمارہ ۲

فروری ۱۹۵۵ء مطابق جمادی الثانی ۱۳۷۴ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

پرانی نسل اور آج کل کی نئی نسل میں وضع داری - مروت - شرم و حیا - اپنی قومی اور ملی روایات کا پاس و احترام ان چیزوں کے اعتبار سے جو ایک نمایاں فرق ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ پرانی نسل کے لوگوں نے خواہ انگریزی اور علوم و فنونِ جدیدہ کے وہ کتنے ہی ماہر اور تہذیب و تمدنِ مغرب کے کتنے ہی فیض یافتہ ہوں - اپنی ابتدائی تعلیم مکتبوں میں حاصل کی ہے جہاں انھوں نے مذہب اور اخلاق کا درس لیا ہے - اپنے بزرگوں کے اخلاقی کارناموں اور ان کے سوانح حیات کو پڑھا یا سنا ہے اور ان سب نے مل جل کر ان کے دماغ میں بلند اخلاقی زندگی کی عظمت و بزرگی کا ایسا گہرا نقش پیدا کر دیا ہے کہ یورپ اور امریکہ وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم اور وہاں کا ماحول بھی اس نقش کو مٹا نہیں سکا ہے - اس بنا پر یہ مکتبی تعلیم کہنے کو پرائمری تعلیم تھی لیکن اس کے خاص نظام اور ماحول کے اثرات عمر بھر رہتے تھے اور اُن کو کیرکٹر اور کردار کی تعمیر میں بڑا دخل تھا - ان مکاتب کے نظام میں جوں جوں اختلال و زوال آتا رہا ہماری جدید نسلوں کے طور طریق اور اُن کی فکر و نظر کے سانچے بھی بدلتے رہے اور چند برسوں میں ہی حالات کچھ سے کچھ ہو گئے -

---

اس بنا پر تعمیر و تشکیلِ جدید کے اس مرحلہ پر ضرورت تھی کہ ان مکاتب کی از سر نو تنظیم کی جاتی - اُن کو ترقی دی جاتی - اور ان کے اثرات کو اور زیادہ وسیع اور ہمہ گیر بنانے کی کوشش کی جاتی - لیکن حکومت کے سیکولر ہوتے اور جبری تعلیم کی اسکیم کے نفاذ کے باعث ان مکاتب کا وجود ہی سرے سے خطرہ میں پڑ گیا ہے اور ان کا قائم رہنا ہی مشکل ہو گیا ہے - انگریزوں کے زمانہ میں جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے شکایت یہ تھی کہ ان کا نظامِ تعلیم ہماری قومی ضرورتوں کی

تکمیل نہیں کرتا۔ لیکن آج جب کہ ملک آزاد ہے اور وہ اپنی صوابدید کے مطابق خود اپنی تعلیم کا انتظام کر رہا ہے۔ ہماری قومی تعلیم ہر پہلو سے وسیع ہو رہی ہے اور ترقی کر رہی ہے۔ لیکن اس کی موجودہ شکل و صورت اس طرح کی ہے کہ اس میں مذہبی تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں کیا گیا ہے۔ اس لئے اگر صرف اسی قومی تعلیم پر قناعت کر لی گئی اور اس میں جو خلا ہے اس کو پُر کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تو بے شبہ مسلمانوں کے حق میں جن کی زندگی ان کی مذہبی تعلیم کے بغیر کوئی معنی ہی نہیں رکھتی اس کے نتائج بہت خطرناک اور تباہ کن ہو سکتے ہیں اس بنا پر سخت ضرورت تھی کہ اس مسئلہ پر توجہ کی جاتی اور اس صورت حال کو سلجھانے کی طرف قدم اُٹھایا جاتا۔

اسی مقصد کے پیشِ نظر گذشتہ ماہ کی ۸ ر اور ۹ ر کو جمعیۃ علمائے ہند کی زیر قیادت بمبئی میں مسلمانانِ ہند کا ایک دینی تعلیمی کنونشن منعقد ہوا جس میں ملک کے ہر گوشہ سے مسلمانوں کے تمام فرقوں اور طبقوں اور مختلف اداروں کے نمائندوں نے شرکت کی اور بڑی سرگرمی، خلوص اور یک جہتی کے ساتھ کنونشن کی تمام کارروائیوں میں عملی حصہ لیا۔ جیسا کہ اخبارات سے معلوم ہوا ہو گا۔ کنونشن میں ایک سنٹرل بورڈ بنا دیا گیا ہے جو تمام ہندوستان میں مسلمان بچوں اور بچیوں کے لئے دینی تعلیم کا بندوبست اور اس کی نگرانی کرے گا اور دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کی بھی نگرانی کرے گا کہ مسلمان بچوں اور بچیوں کے اخلاق و عادات اور ان کا کردار اسلامی طرز زندگی سے محروم نہ ہونے پائے۔ اس میں شک نہیں کہ اس مرحلہ پر اس معاملہ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب اس بورڈ کو کامیاب بنانا جو ہر مکتب خیال کے مسلمان زعماء پر مشتمل ہے مسلمانوں کی عملی ہمدردی اور ان کے تعاون پر اور خود ارکان بورڈ کی بیدار مغزی اور ان کی عملی صلاحیت پر موقوف ہے اور مستقبل ہی اس کا فیصلہ کرے گا کہ مسلمان اپنے ایک اہم ملی مسئلہ کو حل کرنے میں کہاں تک کامیاب رہے ہیں۔ بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جمعیۃ علماء ہند کی آواز پر تمام اسلامی فرقوں کا مذہبی تعلیم کے نام پر اس طرح

ایک دوسرے کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھ جانا جہاں مسلمانوں کے مستقبل کے لئے ایک اچھا شگون اور فالِ نیک ہے۔ جمعیۃ علماء کی ملی خدمات کی روشن تاریخ میں ایک نئے اور سنہرے باب کا بھی اضافہ کرتا ہے اس موقع پر اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے بھی بڑی مسرت ہوتی ہے کہ اس کنونشن کے موقع پر بمبئی کے مسلمانوں نے عموماً اور مجلس استقبالیہ کے عہدہ داروں اور ممبران نے خصوصاً جس بیدار مغزی۔ خلوص۔ خوش سلیقگی۔ فیاضی۔ مہمان نوازی۔ حسن انتظام اور زندہ دلی کا ثبوت دیا ہے اُس پر وہ سب شرکائے کنونشن کی طرف سے دلی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ واقعی عروس البلاد کے مسلمانوں کو جیسا ہونا چاہئے تھا انھوں نے ویسا ہی کر دکھا کے دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کے لئے ایک لائقِ تقلید نمونہ پیش کیا ہے اجزاھم اللہ عنا جزاء خیراً۔

افسوس ہے پچھلے دنوں سر شانتی سروپ بھٹناگر اور پنڈت کشن پرشاد کول۔ ملک کی دو نامور شخصیتوں نے وفات پائی اور ملک ان کی خدمات سے محروم ہو گیا۔ اول الذکر ہندوستان کے نامور سائنٹسٹ تھے۔ کیمسٹری اور فزکس میں بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے آزادی کے بعد سے ملک میں جو صنعتی ترقی ہوئی ہے اور سائنس نے جو فروغ پایا ہے اس میں سر شانتی سروپ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ پھر بڑی بات یہ ہے کہ وہ مرزا غالب کے محبوب شاگرد اور دوست منشی ہرگوپال تفتہ جن کو مرزا نوشہ محبت میں مرزا تفتہ کہا کرتے تھے ان کے نواسے تھے اور انھوں نے اردو شعر و شاعری کا ذوق ورثہ میں پایا تھا۔ چنانچہ وہ اُردو کے صاحب دیوان شاعر بھی تھے۔ مشاعروں کی صدارت بھی کرتے تھے اور اپنے دوست احباب کو جن میں شامل ہونے کا فخر راقم الحروف کو بھی تھا اپنے اشعار بڑے مزے میں سناتے تھے۔ سائنس اور شاعری کے لطیف امتزاج اور خاندانی روایات کے باعث وہ ہماری گذشتہ تہذیب اور کلچر کے سچے حامل اور علم بردار تھے۔ اب ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہے۔

پنڈت کشن پرشاد کول لکھنؤ کے رہنے والے اور لکھنؤ کی پرانی تہذیب و روایات کی بڑی حسین یادگار تھے۔ اردو زبان کے نکتہ سنج و نکتہ شناس۔ بلند پایہ ادیب اور بڑے صحیح الخیال اور نیک دل بزرگ تھے۔ اردو زبان اور اس کے ساتھ وابستہ کلچر اور تہذیب کے ساتھ اُن کو عشق تھا۔ یوپی میں اردو کو علاقائی زبان بنانے کے لئے دستخطی مہم کی کامیابی زیادہ تر انھیں کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اردو سے متعلق ہر تحریک میں وہ سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ چنانچہ وفات سے کچھ دن پہلے ہی انھوں نے بہار میں اردو کانفرنس کی صدارت کی تھی اور اس میں بڑا اچھا خطبہ پڑھا تھا۔ اگرچہ وہ اب خود دنیا میں نہیں ہیں لیکن اپنے کردار و عمل اور اپنے اخلاق کا ایک ایسا نقش چھوڑ گئے ہیں کہ نئی نسلیں اُن سے بہت کچھ سبق حاصل کر سکتی ہیں۔

مدارسِ عربیّہ کے لئے ایک لمحۂ فکر

از

(سعید احمد)

(۶)

گذشتہ قسط میں جو وعدہ کیا گیا تھا اس کے مطابق ذیل میں ایک نصاب پیش کیا جاتا ہے جو مغربی بنگال کے مدارسِ عربیہ کے لئے بنایا گیا ہے۔ اگر اس نصاب سے اصولاً اتفاق ہو تو اپنے مقامی حالات اور مالی استطاعت و وسعت کے مطابق تھوڑی بہت ترمیم و تنسیخ اور ردّوبدل کے ساتھ ہر مدرسہ اس کو اپنا سکتا ہے۔

نصاب

(۱) مدارسِ عربیہ میں مدت تعلیم ۱۶ (سولہ سال) ہوگی اور یہ مدت تین حصوں میں تقسیم ہوگی۔

(الف) جونیر مدرسہ	مدت تعلیم چھ سال
(ب) ہائی مدرسہ	مدت تعلیم چار سال
(ج) مدرسہ کالج	مدت تعلیم چھ سال

(۲) جونیر مدرسہ کے ابتدائی چار سالوں میں حسب ذیل مضامین کی تعلیم ہوگی اور مادری زبان اور حساب اور تاریخ وجغرافیہ کا نصاب بیسک ایجوکیشن اسکیم کے مطابق ہوگا۔

(الف) دینیات

(ب) مادری زبان

(ج) حساب

(د) تاریخ وجغرافیہ

(۵) ورزشِ جسمانی

(۶) عربی (صرف سال چہارم میں)

(۳) جونیئر مدرسہ کے سال پنجم و ششم میں حسب ذیل سات مضامین کی تعلیم دی جائے گی۔ ہر مضمون کا ایک پرچہ ہوگا اور چھٹے سال کے ختم پر پبلک امتحان ہوگا۔

پہلا پرچہ :- دینیات

دوسرا پرچہ :- عربی ادب

تیسرا پرچہ :- مادری زبان

چوتھا پرچہ :- ہندی - اُردو یا ہندی اور مادری زبان بحیثیت ثانوی زبان کے

پانچواں پرچہ :- ریاضی

چھٹا پرچہ :- تاریخ و جغرافیہ

ساتواں پرچہ :- انگریزی

(۴) ہائی مدرسہ کے سال ہفتم و ہشتم میں حسب ذیل مضامین کی تعلیم ہوگی - ہر مضمون کا ایک پرچہ ہوگا اور مادری زبان کے دو پرچے ہوں گے -

پہلا پرچہ :- دینیات

دوسرا پرچہ :- عربی ادب

تیسرا پرچہ :- مادری زبان (نظم و نثر)

چوتھا پرچہ :- مادری زبان (صرف و نحو املاء و انشاء)

پانچواں پرچہ : ریاضی

چھٹا پرچہ :- انگریزی

ساتواں پرچہ :- مضامین ذیل میں سے کوئی ایک مضمون

(الف) انگریزی (ب) دینیات (ج) فارسی

(۵) باقی مدرسہ کے سال نہم و دہم میں حسب ذیل مضامین کی تعلیم ہوگی۔ ہر مضمون کا ایک اور مادری زبان کے دو پرچے ہوں گے اور دسویں سال کے ختم پر پبلک امتحان ہوگا۔

لازمی مضامین :۔

پرچۂ اول :۔ دینیات

پرچۂ دوم :۔ عربی ادب

پرچۂ سوم :۔ انگریزی

پرچۂ چہارم :۔ مادری زبان (نظم و نثر)

پرچۂ پنجم :۔ مادری زبان (صرف و نحو وغیرہ)

پرچۂ ششم :۔ ریاضی

پرچۂ ۷، ۸ اور ۹ انتخابی مضامین پر مشتمل ہوں گے۔ مندرجۂ ذیل انتخابی مضامین میں سے کسی تین مضمونوں کا لینا ضروری ہوگا۔

(الف) دینیات و عربی ادب۔

(ب) منطق

(ج) فارسی

(د) ریاضی

(ہ) تاریخ و جغرافیہ

(و) انگریزی

(ز) سائنس

(ح) بلدیات (Civic)

(۶) مدرسہ کالج میں تین جماعتوں کی تعلیم ہوگی (۱) عالم (۲) فاضل (۳) کامل، ہر جماعت میں مدتِ تعلیم دو سال ہوگی اور ہر دوسرے سال کے ختم پر پبلک امتحان ہوگا۔

۱

(۱) عالم

اس میں مضامین ذیل کی تعلیم ہوگی۔

۱۔ دینیات ۲۔ عربی ادب ۳۔ منطق و فلسفہ ۴۔ فارسی یا انگریزی ۵۔ مادری زبان اور عالم کے امتحان میں دس پرچے ہوں گے۔

(الف) دینیات۔ پہلا پرچہ تفسیر و عقائد دوسرا پرچہ حدیث و اصولِ حدیث و تاریخ اسلام، تیسرا پرچہ فقہ، اصولِ فقہ، فرائض۔

(ب) عربی ادب۔ چوتھا پرچہ نظم، بلاغت پانچواں پرچہ نثر قواعد چھٹا پرچہ ترجمتین و انشاء

(ج) منطق و فلسفہ۔ ساتواں پرچہ منطق و حکمت

(د) فارسی یا انگریزی۔ آٹھواں پرچہ فارسی یا انگریزی نظم و نثر، نواں پرچہ فارسی یا انگریزی گرامر ترجمہ و انشاء۔

(ھ) مادری زبان۔ دسواں پرچہ مادری زبان۔

(۲) فاضل میں حسب ذیل مضامین کی تعلیم ہوگی۔

۱۔ دینیات، ۲۔ عربی ادب، ۳۔ منطق و فلسفہ، ۴۔ فارسی یا انگریزی، ۵۔ مادری زبان اور فاضل میں دس پرچے ہوں گے۔

(الف) دینیات۔ پہلا پرچہ تفسیر اصول تفسیر عقائد۔ دوسرا پرچہ حدیث اصولِ حدیث و تاریخ اسلام تیسرا پرچہ فقہ، اصولِ فقہ۔

(ب) عربی ادب۔ چوتھا پرچہ نظم۔ عروض والقوافی۔ پانچواں پرچہ نثر۔ بلاغت۔ چھٹا پرچہ ترجمتین و انشاء۔

(ج) منطق و فلسفہ۔ ساتواں پرچہ منطق و فلسفہ

(د) فارسی یا انگریزی۔ آٹھواں پرچہ نظم و نثر نواں پرچہ گرامر و انشاء و ترجمہ

(ھ) مادری زبان۔ دسواں پرچہ مادری زبان

(۸) کامل کے تین شعبے ہوں گے کامل دینیات، کامل ادب، کامل تاریخ اور کامل کے ہر شعبے میں آٹھ پرچے ہوں گے۔

(الف) کامل دینیات - پہلا پرچہ تاریخ القرآن، تاریخ علم التفسیر
دوسرا پرچہ اصول تفسیر و علم بلاغتِ قرآن
تیسرا پرچہ حدیث - چوتھا پرچہ حدیث - پانچواں پرچہ حدیث -
چھٹا پرچہ اصولِ حدیث و تاریخِ حدیث] یا مقالہ تحقیقیہ
ساتواں پرچہ فقہ اصولِ فقہ و تاریخ الفقہ
آٹھواں پرچہ علم العقائد و اسرار الشریعۃ

(ب) کامل ادب - پہلا پرچہ نظم قدیم دوسرا پرچہ نثر قدیم
تیسرا پرچہ نظم و نثر جدید
چوتھا پرچہ علم نقد و العروض و القوافی
پانچواں پرچہ علوم البلاغۃ - چھٹا پرچہ تاریخ ادب عربی
ساتواں پرچہ علم الالسنہ آٹھواں پرچہ انشاء و مقالہ نگاری

(نوٹ) پانچویں اور آٹھویں پرچے کی جگہ ایک تحقیقی مقالہ لکھنے کا حق ہوگا!

(ج) کامل تاریخ - پہلا پرچہ عرب قبل از اسلام و دورِ نبوت
دوسرا پرچہ خلافتِ راشدہ و عہد بنی اُمیہ
تیسرا پرچہ عہدِ بنی عباس و بنو فاطمہ
چوتھا پرچہ تاریخ مغرب و اندلس و صقلیہ
پانچواں پرچہ تاریخ ہند و ایران و ترکی
چھٹا پرچہ تاریخ چین و جزائر شرق
ساتواں پرچہ تاریخ سیاسیات و اقتصادیاتِ اسلامی } تحقیقیہ
آٹھواں پرچہ فلسفۂ تاریخ و تاریخ تمدنِ اسلامی } یا مقالہ

وجوہ شرفِ آدمؑ

از

(جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی ۔ لکچرر عربی و فارسی یونیورسٹی الٰہ آباد)

(۲)

(۱) صاحب جامع البیان "علم الاسماء" کے معنی لکھتے ہیں "خلق فی قلبہ علماء" اللہ نے ان کے دل میں ایک خاص علم لدنی پیدا فرمایا۔

(۲) صاحب جلالین "الاسماء کلھا" کے تحت میں لکھتے ہیں "اسماء المسمیات کلھا حق القصعۃ والقصیعۃ والفسوۃ والفسیۃ والمعرفۃ" "تمام چیزوں کے نام یہاں تک بڑے پیالہ اور چھوٹی پیالی اور آواز ریح تک اور چمچہ تک کا نام" مطلب یہ کہ ہم کہاں تک ان کے نام گنائیں اشیاء غیر محدود ان کے نام بے انتہا"

چنانچہ جملہ علوم، جملہ مختلف زبانیں، جملہ معدنیات، جمادات، نباتات، حیوانات جو زمین پر یا زمین میں یا سمندر میں یا جو فضا میں یا آسمانوں میں ہیں سب کی ماہیت اور پہچان نام اور خواص ان کو بتائے۔

(۳) قاضی بیضاوی ص ۶۱ پر لکھتے ہیں:-

والمعنی انہ تعالیٰ خلقہ من اجزاء مختلفۃ وقوی متباینۃ مستعدا لادراک انواع المدرکات من المعقولات والمحسوسات والمتخیلات والموھومات	مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا کیا مختلف اجزاء سے اور متضاد قوتوں سے اور جلد سمجھنے والا جو ہر قسم کی عقل حسی، خیالی، وہمی باتیں فوراً سمجھ جائے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو الہام سے تمامی اشیاء کی ذات، خاصیات، نام اور جملہ علوم کے اصول

وَالْهَمَهٗ مَعْرِفَةَ ذَوَاتِ الْاَشْیَاءِ وَخَوَاصِّهَا وَاَسْمَاءِهَا وَاُصُوْلِ الْعُلُوْمِ وَقَوَانِیْنِ الصِّنَاعَاتِ وَکَیْفِیَّةِ آلَاتِهَا (بیضاوی صلا)

اور تمام ہی ہنروں اور دستکاریوں کے قاعدے اور ان کے اوزاروں یا کل پرزوں کی کیفیت تعلیم فرما دی۔

اس کے متعلق مفسر تھانوی کی دو عبارتیں اور پڑھ لیجئے تو پیدا ہونے والے خلجانات دور ہو جائیں، مفسر مذکور بیان القرآن میں لکھتے ہیں :۔

(الف) اگر یہاں کسی کو خلجان ہو کہ جس طرح آدمؑ کو تلقین فرما دینے سے ان کو وہ علم خاص اور صلاحیتِ خلافت حاصل ہو گئی اگر ملائکہ کو تعلیم فرما دیتے تو اُن کو بھی وہ علم اور اس کے ساتھ صلاحیتِ خلافت میسر ہو جاتی۔ سو آدم پر اس کا ظاہر کرنا اور فرشتوں سے پوشیدہ کرنا آدمؑ کو ترجیح دینے کے لئے کافی نہیں ہو سکتا . . . . (جواب) سو جس علم کی یہاں بحث ہے اس کے حصول کے لئے ایک استعدادِ خاص کی ضرورت ہے . . . . لذتِ جماع کے لئے استعدادِ رجولیت کی شرط ہے عنین مادرزاد کو اس کی قدرت حاصل ہونا عادۃً ممتنع ہے سو اس علمِ خاص کی استعداد آدمی میں تو پیدا کی گئی اور ملائکہ میں نہیں، . . . . سو آدمؑ کی تعلیم کے وقت ملائکہ سے اس علم کے پوشیدہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ اس دعوی کی کوئی دلیل ہے جب اُن میں اس علم کی استعداد ہی نہیں تو اگر تعلیمِ آدم کے وقت اول سے آخر تک وہ حاضر بھی رہے تو اس کا ان کو حاصل ہونا کب ممکن ہے۔ / ج ا صنہ۲۰

(ب) اس گفتگو سے فرشتوں کو اپنے عاجز ہونے کا مشاہدہ ہو گیا اب حق سبحانہٗ کو منظور ہوا کہ آدم میں اس علمِ خاص کی قوت و مناسبت کا ہونا بھی ملائکہ عیاناً دیکھ لیں اس لئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے آدم تم بتلا دو ان کو ان چیزوں کے اسماء مع حالات یعنی ان کے روبرو اس کا اظہار اور بیان کر دو گو بوجہ مناسبت نہ ہونے کے اس کو نہ سمجھ سکیں، فائدہ یہ تو ہوا کہ ملائکہ اس قدر سمجھ گئے کہ آدمؑ ضرور اس علم کے ماہر ہو گئے (ج ا صا۲)

مفسرین نے اسماء کی جو تشریح و تفصیل کی ہے، آپ مجملاً ہی سہی ملاحظہ فرما چکے۔ میرے ایک دوست نے اسی اسماء کی تشریح میں ایک عجیب بات کہی ہے وہ ایک غیر مطبوعہ نظم میں شیطان کی زبانی کہلاتے ہیں ذرا اسے بھی ملاحظہ فرمایئے :-

حق نے تعلیم نہیں بتائی تھیں — خاصیت ۔ نام ۔ صورتِ اشیا
ملک ۔ آدم ۔ ابلیس کے بھی خواص — کھُلے دورانِ "عَلَّمَ الْاَسْمَاءَ"
لانا تھا تجربہ میں فطری علم — اپنے نائب کو پختہ کرنا تھا
سب نے دکھلائی اپنی استعداد — جس میں جو مادہ تھا وہ اُبھرا
تھا کوئی خیر محض ۔ میں شر محض — ادراک خیر و شر کا جامع تھا
ہر طرح کی عبادت اور نیکی — ہر فرشتہ مجھے سکھاتا تھا
میں ملائک کو گو وہ بھکے نہیں — معصیت اور شر بتاتا تھا
میں خطا پر جما بھی اور اُس نے — ایک لغزش میں بول دی توبہ

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب اسماء کلھا تو آدم بھی ایک اسم ہے جو ایک مسمّٰی رکھتا ہے اور اس مسمّٰی کے کچھ جداگانہ خواص بھی ہیں اسی طرح ملک اور ابلیس بھی اسماء ہیں اور مسمیات رکھتے ہیں اور ان کے کچھ جداگانہ خواص بھی ہیں پس ابلیس کا سجدہ سے انکار، آدمؑ کی وہ لغزش مشہور (شجر ممنوعہ کا پھل کھانا) وغیرہ دراصل تعلیم اسماء ہی کا ایک درس تھا اور آدم و ابلیس کی خاصیتوں کا عملی تجربہ و مشاہدہ کرانا تھا کیوں کہ القار (لکچرر) کے ساتھ ساتھ تجربہ (اکسپریمنٹ) بھی تو ایک طریقہ تعلیم ہے چونکہ اس کا علم اشد ضروری تھا اس لئے اس کو تجربہ کر کے دکھا دیا گیا اور اسی تجربہ میں ابلیس نے ملائکہ کو بھی کچھ سکھانا پڑھانا چاہا۔ تاکہ اس کی مقتضائے طبع اور اصل فطرت (اضلال اور گمراہ کرنا) ظاہر ہو سکے گو اس کی کوشش بے کار گئی۔ پس اگر اس شہرت کی کہ "ابلیس معلم الملکوت اور فرشتوں کا استاد تھا" کوئی معقول توجیہ ہو سکتی ہے تو وہ یہی اور صرف یہی ہو سکتی ہے۔ کہ اس نے فرشتوں کو بھی معصیتوں

کے گر۔ نافرمانیوں کے طریقے سکھانے چاہئے مگر ان کو ابلیس کا علم نہ آسکا ورنہ ابلیس تو معلم الملکوت یعنی فرشتوں کا شاگرد تھا اُن کا معلم اور استاد ہرگز ہرگز نہیں تھا۔ بہرحال کائنات کا یہ اجمالی علم حاصل ہونا۔ اشیا کی صورت پہچاننا۔ جذبات کی ماہیت و کیفیت سمجھنا۔ ان کے نام جاننا۔ ان کے خواص کا ادراک ہونا جیسا کچھ شرف ہے ظاہر ہے یہ چوتھی وجہ تھی شرف آدم و بنی آدم کی۔ وللہ الحمد۔

شرف پنجم۔ مسجودیت بار دوم

اس شرف پر شاید اکثر لوگ چونکیں اور چونکہ عام طور پر مشہور ایک بار کی مسجودیت (وہی خلقت آدمؑ کی بعد والی) ہے نیز اکثر تفاسیر مثل موضح القرآن صـ۷ و صـ۲۶۴ اور حقانی ج ۲ صـ۱۵۰ اور ج ۵ صـ۶ پر بھی ایک ہی بار کا سجدہ بتایا گیا ہے اس لئے ان کا چونکنا بھی کچھ بے جا نہیں ہے لیکن میں معتبر تفاسیر کی عبارتیں پیش کرتا ہوں، بیان القرآن میں ہے

۱۔ جب دلائل سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ صلاحیتِ خلافت کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے وہ آدمؑ میں سب مجتمع ہیں اور ملائکہ کو ان میں سے صرف بعض علوم حاصل ہیں اور جنوں کو تو بہت ہی کم حصہ ان علوم کا حاصل ہے . . . . اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ . . . . ان غیر کاملوں سے "اس کامل" (آدمؑ) کی کوئی ایسی تعظیم کرائی جائے کہ عملاً بھی یہ امر ظاہر ہو جائے کہ یہ ان دونوں سے کامل اور جامع ہیں جب تو یہ دونوں ان کی تعظیم کر رہے ہیں۔ . . . اس کے لئے جو عملِ تعظیمی تجویز فرمایا گیا اس کی حکایت ذکر فرماتے ہیں کہ "اور جس وقت ہم نے فرشتوں کو (اور جنوں کو بھی جیسا کہ روایات میں آیا ہے . . . . غرض اس سب کو) یہ حکم دیا کہ سجدہ میں گر جاؤ آدمؑ کے سامنے سو سب سجدہ میں گر پڑے بجز ابلیس کے کہ اس نے کہنا نہ مانا اور غرور میں آگیا اور ہو گیا کافروں میں سے (بیان القرآن ج ۱ صـ۲۱ و ۲۲)

۲۔ تفسیر مظہری میں قاضی ثناء اللہ صاحبؒ صـ۲۷ پر فرماتے ہیں:۔

قلت لعلھم انما اُمِروا بتعظیم آدم — میرے نزدیک ان کو آدمؑ کی تعظیم کرنے کا حکم اس

شکرا له واداء لحقه فی التعلیم   لے دیا گیا تھا کہ انھوں نے جو ملائکہ کو تعلیم دی تھی تو ان (استاد) کا شکریہ اور حق ادا ہو سکے۔

۳۔ قاضی بیضاوی ص۶۳ میں فرماتے ہیں:۔

لما انبأهم بالاسماء وعلّمهم مالم یعلموا امرهم بالسجود له اعترافاً بالفضله اداءً لحقه اعتذاراً لما قالوا فیه وقیل امرهم به قبل ان یُسَوِّیَ خلقه لقوله فاذا سوّیته الخ امتحاناً لهم واظهار الفضله"

یعنی جب آدمؑ نے فرشتوں کو اسماء (خواص اشیاء) کی اطلاع دی اور اُن کو وہ باتیں بتائیں جو وہ نہیں جانتے تھے تو اللہ نے ان کے آگے جھکنے کا حکم دیا کہ آدمؑ کے فضل کامل کا اعتراف اور اُن کے حق کی پوری ادائگی اور اپنی غلطی رائے کی معذرت ہو سکے اور بعض کا خیال ہے کہ اللہ نے فرشتوں کو ان کی پیدائش سے قبل ہی سجدہ کا حکم دیا تھا کیوں کہ حکم تھا کہ جب میں اسے بنا چکوں اور اس میں جان ڈال چکوں تو تم سب سجدہ میں گر پڑنا اس حکم سے ملائکہ کو جانچنا اور آدمؑ کی فضیلت کا دکھانا منظور تھا انتہی۔

دیکھو قاضی بیضاوی نے اگرچہ دونوں قول نقل کر دئے ہیں مگر ترجیح اس قول کو دی ہے کہ تعلیم اسماء کے بعد بھی سجدہ کرایا گیا (یعنی سجدہ کا حکم دو بار ہوا اول پیدائش آدم کے بعد ہی، دوم تعلیم اسماء اور اعطائے خلافت کے بعد) چنانچہ اس قول کو ذکر میں مقدم کیا اور دوسرے قول کو (کہ سجدہ کا حکم ایک ہی بار ہوا) "قیل" کے لفظ سے بیان کیا جو تحریض کے لئے موضوع ہے اور اس کو ذکر میں موخر بھی کیا بہر حال تین معتبر تفاسیر سے ظاہر ہو گیا کہ حضرت آدمؑ کو دوبارہ سجدہ کرایا گیا اور خلیفہ کی خلافت کو بہتم بالشان ہونے کی وجہ سے دوبار منوایا گیا شاید اسی نکتہ کے باعث حضرت سیدنا علیؓ نے بھی سیدنا ابو بکر صدیقؓ کی خلافت کی دوبار تصدیق کی اور دوبار بیعت کی اور خود سنت ملائکہ کی اتباع کر کے خلافت صدیقی کے منکر کے لئے "مقام شیطنت و ابلیسی" کو متعین فرمایا۔ یہاں دو باتیں اور عرض کر دوں:۔

اول یہ کہ اگر بفرض محال آسمان و زمین و پہاڑ میں سے کوئی مخلوق اس امانت کو قبول کر لیتا تو بقول مفسر تھانویؒ وہ اگر وہ اپنے ذمہ رکھ لیتے تو مثل انسان کے ان کو بھی عقل دی جاتی جو تفصیل احکام و مثنویات و عقوبات کے سمجھنے کے لئے موقوف علیہ ہے (بیان القرآن ج ۹ ص)

دوسرے یہ کہ آدم کو تعلیم اسماء جو دی گئی وہ گو آدم کے قلب میں علم کو خلق یا القاء فرما دی گئی مگر اس کو تعلیم کے دو مروجہ طریقوں القا و تدریس (لکچر اور ٹیچنگ) کی اصل سمجھئے یعنی یہ اسی کی نقل ہیں پھر آدمؑ سے کہا گیا کہ فرشتوں کو اپنے ماہرِ علم ہونے کی اطلاع دینے کے لئے سارا کورس ان کے سامنے دہراؤ تو آج جو امتحانات لئے جاتے ہیں ان کی اصل خدا کے اس فعل کو سمجھئے پھر "الم اقل لکم" کا فرمانا گویا آدمؑ کی دستارِ فضیلت باندھنا یا اعطائے سند (کانوکیشن) کی اصل تصور کیجئے پھر سجدہ کرانے کو منصبِ خلافت دے کر ان کی سلامی کا قائم مقام خیال فرمایئے۔ اور آدمؑ کی لغزش۔ ابلیس کا تمرد۔ ملائکہ کا بے چون و چرا انقیاد کو آدمؑ۔ ابلیس۔ ملائکہ کے اسماء و خواص ہی کی تعلیم بذریعہ تجربہ و مشاہدہ مانئے اور پھر غور کیجئے کہ کس کس طرح اس انسان نے حدیث "خلق اللہ آدم علی صورتہٖ" کا صحیح ہونا اپنے عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ جائز اور معقول بات جو بھی یہ انسان دنیا میں کرتا ہے وہ اس لئے کرتا ہے کہ خدا نے بھی ایسا ہی کیا ہے اور انسان اس کا پرتو ہونے کے باعث اس کی نقل کے سوا کچھ اور کر ہی نہیں سکتا کیوں کہ خدا نے آدمؑ کو اپنی صورت پر اور اپنا مظہر بنایا ہے تعمیری کام یہ جو کچھ بھی کرتا ہے وہ خدا کی نقل ہی میں کرتا ہے۔

شرفِ ششم۔ تلقینِ توبہ

یہ شرف بظاہر کوئی خاص شرف و فضل معلوم نہ ہو گا لیکن احقر کی تحریر دیکھنے کے بعد سمجھ میں آجائے گا کہ یہ کتنا بلند شرف ہے دوسرے شرفوں میں اگر انعام و تکریم کی شان ہے تو اس میں شفقت و رحمت کا پہلو نمایاں ہے۔

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب دشمنِ آدم۔ منکرِ خلافت ابلیس عزازیل جذبۂ حسد و غضب

سے مغلوب ہو گیا اور اس نے آدمؑ معصوم کو دھوکہ دے کر جھوٹی قسمیں کھا کر گیہوں کھلا دیا۔ عام
تخیل یہی ہے کہ آدمؑ معصوم بربنائے بشریت اور بمقتضائے کرمِ نفس و صفاءِ قلب اس کے
فریب میں آ گئے اس کا چکمہ نہ سمجھ سکے اس پر حق تعالیٰ ناخوش ہوئے اور ان سے حلۂ بہشتی چھین لیا
گیا آخر آدمؑ و حواؑ کو ننگے جسم سے شرم خجالت اور معصیت سے ندامت ہوئی تو ڈر کر رونے
لگے حق تعالیٰ نے باز پرس کی تو شرم سے بول نہ سکے تو حق تعالیٰ نے توبہ کے الفاظ سکھائے کہ کہو اے
اللہ قصور ہو گیا معاف کیجئے ورنہ ہم بڑے خسارہ میں پڑ جائیں گے تو دونوں نے یہ کلمات سیکھ
کر عرض کئے اس پر حق تعالیٰ نے معاف فرما دیا۔

واقعات فی الحقیقت ہوئے بھی یہی اور ان کے متعلق مذکورہ بالا تخیل غلط بھی نہیں ہے
لیکن جی چاہتا ہے کہ انھیں واقعات کو جس طرح احقر سمجھا ہے اسے بھی ناظرین کی خدمت میں
پیش کر دے کہ ؎ "عندلیب آشفتہ تر می گوید ایں افسانہ را" اس دشمنِ انسان نے جب
ان دونوں سے خدا کی قسم کھا کر بزور اور اہتمام سے کہا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں اس درخت
کا پھل کھا لو تمہارا فائدہ اسی میں ہے تو انھوں نے خدا کا نام اور اس نام کی قسم سننے کے بعد
اپنے سابق طرزِ عمل (احتیاط اور دانش پژوہی) پر جمے رہنے کو طریقِ محبت کے خلاف سمجھا۔
انھوں نے دوسرے پر سوءِ ظن کرنے کو اور خصوصاً خدا کے نام کا واسطہ دینے کے بعد بدگمانی
کرنے کو شرافت اور کرم کے منافی جانا [خصوصاً اس صورت میں کہ وہ بھیس بدل کر آیا ہو
(جیسا بعض کا خیال ہے] ان کا اس موقع پر دھوکا کھا جانا بعید نہیں ہے بلکہ محبوب کے نام اور
قسم کو سن کر اہلِ محبت اگر اپنے ہوش و حواس میں باقی رہ جائیں تو تعجب ہے اصغر مرحوم نے
ایک شعر میں اہلِ محبت کے ایسے ہی فطری جذبہ کی کیسی عمدہ مصوری کی ہے کہتے ہیں:-

نامِ اُن کا آ گیا کہیں ہنگامِ باز پرس   ہم سمجھے کہ اڑ گئے صفِ محشر لئے ہوئے

نامِ محبوب سن کر قلب و دماغ میں جو "محشرِ جذبات" بپا ہو جاتا ہے اس وقت اپنے
کسی عزم پر قائم رہ جانا بڑا مشکل ہے یہ مرحلہ محبت میں پیش آتا ہے۔ غرض اُن کا جذبۂ عشق

تھا جس نے یہ فتویٰ دیا کہ اس نام پر قربان اور اس قسم اور واسطہ پر فدا ہو جاؤ کہ وقت ہے تو یہی اور موقع ہے تو اسی کا رہ گیا ہی "لا تقربا" کی خلاف ورزی اور بند "عدو مبین" کی عدم پابندی تو یہ انجام بینی اور عاقبت اندیشی عقلِ گریز پا اور خردِ مصلحت اندیش کے لئے وجہ فضل ہو تو ہو عشق کے لئے تو باعثِ ننگ ہے ؎

گرچہ بدنامی است نزدِ عاقلاں   مانمی خواہیم ننگ و نام را

اقبالؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

پختہ تر ہوتی ہے گر مصلحت اندیش ہو عقل   عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

بے دھڑک کود پڑا آتش نمرود میں عشق   عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

محبوب کے نام پر جان دے دینا، عقل و ہوش کو کھو بیٹھنا، دین و ایمان کو خیرباد کہہ دینا وہ مقامِ بلند ہے جس پر سود و راندیشیاں قربان اور اس گنہ نہ کرنے کے جرم سے جرمِ عشق کی سزا بھگت لینا بدرجہا آسان ؎

چو بعد خاک شدن یا زیاں بود یا سود   بہ نقد خاک شوم بنگرم چہ خواہد بود (رومی)

محبّت نے انھیں سمجھایا کہ اگر محبوب حقیقی اس پر باز پرس کر بیٹھے کہ کیوں جی دعوائے عشق تو اتنا لمبا چوڑا اور جب کسی نے ہمارے نام کا واسطہ دے کر تم سے کچھ کہا تو تم کو خودداری زیبا کہاں تھی؟ کیا یہی دعوائے محبّت ہے تو اس کا میرے پاس کیا جواب ہوگا؟ اس لئے انھوں نے یہ بھی نہ سوچا ہوگا کہ جب ہم ان کے نام پر دین و ایمان قربان کر دیں گے تو کیا وہ اس کی قدر نہ کریں گے اس لئے لاؤ اس قدر و عزت افزائی کی امید پر یہ اقدام کر بیٹھو نہیں بلکہ وہ تو نام سنتے ہی بے خود ہو کر گیہوں کھا بیٹھے ہوں گے آہ یہ عشق کا وہ جذبہ ہے جس پر عقلیں قربان انسان وہ انسان کیا جس میں اُنس نہ ہو کہ ؎ اُنس سے اور آن سے ترکیب ہے انسان کی۔

پھر کیا عجب ہے کہ ارشاداتِ قرآنی (فنسی ولم نجد لہ عزما۔ فعصیٰ اٰدم ربہ فغویٰ) میں آدم کے اسی جذبہ و کہ دعشق ہی کا بیان محبوبانہ انداز میں یہ بھی فرما دیا کہ آدمؑ ہماری نصیحت

بھول گئے۔ ہم نے اُن میں عزم نہ پایا۔ آدمؑ نے (ظاہر میں تو) خلاف ورزی کی اپنے رب کی اور (جذباتِ محبت کی طوفان میں) بہک گیا" ورنہ یہ اگر نہیں ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا وہ شخص جس کی فردِ قرار داد جرم حسب ذیل جرائم سے پُر ہو کہ

۱۔ وہ بھولتا بہت ہے۔

۲۔ اس کے اندر عزم تو ہے ہی نہیں۔

۳۔ وہ معصیت کوش ہے۔

۴۔ وہ بہکتا ہے۔

اور یہ تو ایک دفعہ کا حال ہے اس کے قبل بھی اس کے نامۂ اعمال میں حسب ذیل ریمارک درج ہو چکے ہوں کہ:۔

۱۔ وہ عجول (جلد باز ہے)

۲۔ وہ ظلوم ہے۔

۳۔ وہ جہول ہے۔

۴۔ وہ سب سے زیادہ جھگڑالو ہے۔ تو کیا ایسا ہی شخص تقرب کا سزاوار اور عنایت کا مستحق ہوتا ہے شاید آپ کہیں کہ یہ تقرب کا درجہ اس کی صفت توبہ وانابت و استغفار وندامت نے اسے دلایا تو میں یہ عرض کروں گا کہ وہ توبہ وانابت بھی تو خدا کی تلقین و شفقت و عنایت ہی سے ہوئی تھی کہ خود ہی ارشاد ہے

فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ — آدمؑ نے اپنے رب سے کچھ کلمات حاصل کئے تو خدا نے بھی اس پر عنایت فرمائی

بس اس سوال کا اگر کوئی حل ہے تو احقر کے نزدیک یہی کہ ان جرائم کا اظہار غصہ کے لب ولہجہ میں کیا ہی نہیں جا رہا ہے بلکہ محبت و شفقت کرم و رحمت کے انداز میں اور آدمؑ کے جذبہ کی قدر کرتے ہوئے برسبیلِ تذکرہ کیا جا رہا ہے فَنَسِیَ میں یہ فرمادیا کہ آدمؑ نے جو ہماری

نصیحت "اِنَّ الشَّیْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ" بھلادی تو جوشِ عشق میں بھلائی اس لئے ہم اس کی قدر بھی کرتے ہیں اور "وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا" میں یوں اظہار خیال کیا کہ آدمؑ کے اندر وہ عزم جو اہلِ عقل کے اندر ہونا چاہیے اور جو دنیا میں زندہ رہنے کے لئے (بظاہر) ضروری ہے جذبۂ عشق اور دردِ دل کے غلبہ کے باعث گویا ہے ہی نہیں "فَنَسِیَ" کہنے سے یہ مقصود ہے کہ (ضابطہ سے تو) یہ ہمارے ایک حکم کی نافرمانی ہی ہے [اب یہ دوسری بات ہے کہ ہم آدمؑ کے جذبۂ عشق کی قدر کرکے اور اس کی بے نفسی اور بے خودی پر نظر کرکے اسے نظر انداز کردیں] "فَغَوٰی" میں یہ فرما رہے ہیں کہ وہ نشۂ عشق میں بہکے اور بھٹکے جو عشق کے لئے حسن ہے مگر با اصول اور ہوشمندانہ زندگی کے لئے یقیناً قبیح ہے۔

یہ ایک تاویل ہے ممکن ہے کہ یہ تاویل بعض حلقوں میں پسند نہ کی جائے لیکن بادب عرض ہے کہ اگر یہ تاویل کسی نص صریح کے متصادم و مزاحم ہو تو بے شک رد کردینے کے قابل ہے ورنہ ایسی تاویل (کلمات قرآن کو محبوبانہ اندازِ تکلم پر محمول) کرنے کی رسم تو اوروں سے بھی ثابت ہے

ع این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

۱- خود مفسر حقانیؒ نے "اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا" کے متعلق اپنی رائے اسی طرزِ خطاب کی بتائی ہے لکھتے ہیں . . . . اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے بارِ گراں کا اٹھانا اور اس بلاو محنت کو گلے میں ڈالنا دانشمند اور دور اندیش سے کب ہو سکتا ہے یہ ایسے ہی لوگوں کا کام ہے جو اپنی جان پر مصیبت گوارا کرلیں اور دور اندیشی نہ کریں ؎

گرچہ بدنامی است نزدِ عاقلاں ما نمی خواہیم ننگ و نام را

۲- اور لفظ "فَغَوٰی" کے بارہ میں مفسر تھانویؒ بھی صرف یہ معنی لیتے ہیں کہ "سو (تحصیل مقصودِ خلد کے بابت میں) غلطی میں پڑ گئے" یعنی گمراہ ہو جانا وہ بھی نہیں مانتے چنانچہ یہی ہوا کہ ان کی لغزش (اور وہ لغزش بھی کیسی کہ ممانعت و نہی کی خلاف ورزی) ان کی تو تربیت و اصلاح فرمائی گئی اور اس عدوئے آدمؑ کی لغزش پر (جو "امر" کی خلاف ورزی تھی) اسے

رحمت سے دور کر دیا گیا اور فی الحقیقت عدل و انصاف کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اس عدوئے آدمؑ کی خلاف ورزیٔ حکم چونکہ اپنی نفس کی محبت میں تھی اس لئے اُسے مردود و ملعون ہی بننا چاہئے تھا اور آدمؑ معصوم کی خلاف ورزی بھی چونکہ خدا کی محبت میں تھی اس لئے انہیں مقبول و مرحوم ہی ہونا چاہئے تھا۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ آدمؑ بے خودیٔ عشق میں ابلیس کا کہنا ماننے کو تو مان گئے مگر ہوش آنے پر یہ خیال ستانے لگا کہ اب کہیں اس کی بازپُرس نہ ہونے لگے کہ ہماری نصیحت "عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ" اور ہدایت "لَا تَقْرَبَا" کے خلاف تم نے کیا کیوں؟ تو میں کیا کروں گا یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ندا آئی اے آدمؑ و حواؑ تم دونوں نے کیوں اس درخت کا پھل کھایا جس کے قریب جانے سے بھی میں نے تم کو منع کر دیا تھا بظاہر تو انھیں اس کے جواب میں صاف اور بے دھڑک کہہ دینا چاہئے تھا کہ "میں آپ کا واسطہ اور پیارا نام سُن کر ہوش میں نہ رہ گیا تھا" مگر غور کیجئے یہ جواب تو گویا محبوب پر احسان جتانا ہوتا اور یہ چیز آدابِ عشق کے خلاف اور رفعتِ عشق سے بہت پست ہو جاتی اس لئے حضرت آدمؑ نے پھر وہ اندازِ جواب اختیار کیا جو قیامت تک عشاقِ کے لئے مشعلِ راہ۔ اہلِ محبت کے لئے درسِ ادب ہے اور جمیع عشاقِ پران کا احسان ہے ؎ خارہا از اثرِ گرمیٔ رفتارم سوخت   منتے بر قدمِ راہرواں ست مرا

(غالبؔ)

آپ نے سر جھکا کر اشک بہا کر دل کو مسل کر اور غرور کو کچل کر عرض کیا "رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا الخ" اے ہمارے پروردگار ہمیں اقرار ہے کہ آپ کی حکم کی نافرمانی ہو گئی اس کا گناہ گار میں ہوں اور ضرور ہوں اب اگر آپ ہمیں معاف نہ کر دیں اور ہم پر دوبارہ رحم نہ فرمائیں تو ہم بڑے خسارہ میں پڑ جائیں گے ؎ ع یکبار لبِ فرمائی کہ لبے ہیچکسیں ما

چنانچہ اس کو قدر سے دیکھا گیا اور "فَتَابَ عَلَیْہِ" کے مژدہ رحمت سے نوازا گیا۔ محبوب

عہ یہ واقعہ جنت میں ہوا تھا لہٰذا توبہ اور اس کی مقبولیت بھی وہیں ہوتی تھی اس کے بعد جو روایات میں آدمؑ کا دنیا میں آنے کے بعد بھی روتے رہنا اور استغفار کرتے رہنا آتا ہے تو وہ محض یادِ معصیت سے تھا اور اہلِ تصوف میں یہ سنتِ آدمؑ آج تک جاری ہے کہ ایک خطا پر تین تین برس تک روتے رہتے حالانکہ وہ پہلے ہی توبہ میں معاف ہو چکی ہوتی ہے۔

کا قرب اور کرم کا یہ کرشمہ جو انھیں نصیب ہوا تو آداب عشق کا لحاظ رکھنے سے نصیب ہوا تھا۔

عارفِ شیرازؒ نے آدم معصوم کی اسی رعایتِ آداب ہی کا ذکر اس شعر میں کیا ہے ؎

گناہ گرچہ نہ بود اختیار ما حافظ ؔ تو در طریقِ ادب کوش و گو گناہِ من است

بہر حال شرفِ آدمؑ کی یہ وجہ اگرچہ طویل ہو گئی [اور اس کی طول کی معذرت خود اس کی حکایتِ لذیذ اور حدیثِ عشق ہونا ہے] مگر میرے نزدیک یہ وجہ ان کے جملہ وجوہِ شرف میں سب سے بڑھ کر تھی۔

شرفِ ہفتم ۔ میثاقِ الست

ساتویں وجہِ شرف جو ہمارے اور آپ کے جدامجد آدم معصوم پر پیش گاہِ احدیت جل جلالہٗ سے حاصل ہوئی جس کے باعث پوری بنی نوعِ آدم کائنات کے مقابلہ میں مشرف و ممتاز ہوئی، وہ یہ ہے کہ ان سے اس کے بعد ایک میثاق اور معاہدہ بھی لیا گیا۔

۱۔ حضرت مولانا تھانویؒ آیت "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" کے ماقبل سے ربط میں تحریر فرماتے ہیں "آگے میثاق عالم ارواح کا بیان فرماتے ہیں جس سے بڑا مقصود مسئلہ توحید کا اثبات ہے "وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ الخ" یعنی (ان سے اس وقت کا واقعہ ذکر کیجیے) جب کہ آپ کے رب نے (عالم ارواح میں آدمؑ کی پشت سے تو خود ان کی اولاد کو) اور اولاد آدم کی پشت سے اُن کی اولاد کو نکالا اور (ان کو سمجھ عطا کر کے) ان سے انھیں کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں سب نے اس عقل خداداد سے حقیقتِ امر سمجھ کر جواب دیا کیوں نہیں (بیان القرآن ج ۴ صفہ)

۲۔ جلالین میں ہے :-

اخرج بعضھم من صلب بعض	بعض کو بعض کی صلب سے اور (اخیر میں) آدمؑ کی
من صلب ادم نسلا بعد	صلب سے نسلاً بعد نسل اسی ترتیب سے جیونٹی

نسل کنحو ما یتوالدون کالذر بنعمان یوم عرفة ونصب لهم دلائل علی ربوبیة ورکب فیهم عقلا واشهد هم علی انفسهم

کی شکل میں نکالا جس ترتیب سے وہ دنیا میں پیدا ہوں گے اور یہ کام وادی نعمان میں (جبل عرفات کے قریب مکہ سے ۱۰-۱۲ میل کے فاصلہ پر) عرفہ (ج) کے دن کیا اور ان کے سامنے اپنی ربوبیت کے دلائل قایم اور پیش کئے اور ان (چیونٹیوں، میں) عقل بھی رکھ دی اور ان سے خود انکے متعلق گواہی حاصل کی۔

عبارت مذکورہ پر ایک حاشیہ ہے اس میں ایک ضعیف قول یہ لکھا ہے کہ "قیل فی الجنة ..... والصحیح ما ذکرہ المصنف کما هو المنصوص فی حدیث رواہ احمد عن ابن عباس مرفوعاً یعنی بعض کہتے ہیں کہ یہ میثاق جنت میں لیا گیا ہے ..... لیکن صحیح مصنف ہی کا قول ہے کہ مسند احمد میں ابن عباس کی ایک حدیث سے یہی نص ہے۔

بہر حال اس کا خلاصہ یہ نکلا کہ حق تعہ نے تمام انسانوں کو جنت میں (یا دنیا میں بھیجنے کے بعد) ایک بار یک جا پیدا فرما کر سب سے اپنی وحدانیت اور ربوبیت کا اقرار لیا۔ پس عرضِ امانت اور اخذِ میثاق میں فرق یہ ہوا کہ پہلے تو مجموعی طور پر جملہ حقوقِ نفس، حقوق العباد، حقوق اللہ غرض جمیع احکام کے ماننے کا میثاق لیا گیا یہ میثاق عرضِ امانت کے نام سے مشہور ہے پھر جب دنیا میں آنے کا وقت قریب آنگا (یا جب آدمؑ دنیا میں اتار ہی دئے گئے) تو مزید یاد دہانی کی یا تجدیدِ معاہدہ کی نظر سے پھر دوسرا میثاق لیا گیا مگر یہ میثاق صرف مسئلہ توحید (یعنی بہ الفاظ دیگر) حقوق اللہ کا ہی لیا گیا یہ "میثاق الست" کہلاتا ہے میثاق الست میں جملہ احکام کے نہ رکھنے کا راز جو احقر سمجھ سکا ہے یہ ہے:-

۱۔ حقوق العباد ہوں یا حقوق النفس غور کیجئے تو یہ بھی دراصل حقوق اللہ ہیں کیونکہ نفس کے یا ساری مخلوقات کے حقوق آخر انسان پر کس نے عائد کئے اور کون اُن کے ادا و وفا

پر انعام اور عدم وفا پر الزام و ایلام دے گا؟ ظاہر ہے کہ وہ خدا ہی ہے پس گو بظاہر اس کا نام و عنوان جداگانہ ہے ورنہ یہ سب حقوق اللہ میں پس مسئلہ توحید کا میثاق دراصل اپنی وسعتِ معنوی کے لحاظ سے جملہ احکام کو شامل ہے۔

۲۔ صرف حقوق اللہ کی یاددہانی دراصل جملہ حقوق و فرائض کی انجام دہی میں مُعین بھی بہت ہے کیوں کہ حقوق النفس ادا کرنے پر تو خیر ہر انسان طبعاً مجبور ہے رہے حقوق العباد تو ان کے ادا نہ ہونے کی وجہ بھی یہ ہے کہ انسان خدا کو سزا و جزا کو (یعنی مسئلہ توحید کو اور مسئلہ معاد کو) بھول جاتا ہے اس لئے حقوق ادا نہیں کرتا اور چونکہ ان دونوں میں بھی مسئلہ توحید اصل ہے جسے بھول کر انسان پہلے اتباع ھوی پھر ظلم و بدعت پھر شرک پھر کفر کرتا ہے اس لئے انسان کو صرف توحید کا سبق میثاق الست میں مستقلاً جداگانہ دیا گیا ہے۔

بہر حال یہ ساتویں وجہ تھی شرفِ آدمؑ کی جس نے آدمؑ کو (اور ان کے طفیل میں سارے بنی نوع آدم کو) ساری کائنات کے مقابلہ میں ممتاز و مشرف، معزز و مفتخر، مکرم و محترم بنا دیا۔ اس کے بعد اگرچہ دنیا میں آنے کے بعد سیدنا آدمؑ کو خلعتِ نبوت سے بھی سرفراز کیا گیا پھر ان سے نسلِ انسانی چلی اور اس اعتبار سے ان کو ابو البشر ہونے کا شرف ملا پھر اخلاق و عقائد تمدن[ع] و تدین کا سنگ بنیاد انھیں نے رکھا وغیرہ وغیرہ اور ان میں سے ہر ایک وجہ شرف بھی ہے مگر وہ سیدنا آدمؑ کا شرف شخصی و ذاتی ہے اور اس لئے ما نحن فیہ کی حدود سے خارج ہے ہمارا موضوع تو آدمؑ اور بنی آدم کا نوعی امتیاز و شرف ہے۔

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ كَرَّمَ بَنِیْ اٰدَمَ"

ع اس پر احقر کا ایک جداگانہ مضمون "تمدن و انسانیت کی صبح" کے نام سے ہے۔

(یہ نقشہ لے اسٹرینج کی کتاب ممالک خلافت شرقیہ سے ماخوذ ہے)

اسلامی دنیا چوتھی صدی ہجری میں
(ایک سیاح کے مشاہدات)
ملکِ مشرق
(ب) خُراسان

از

جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق استاد

ادبیات عربی - دہلی یونی ورسٹی

(سیاق وسباق کے لئے ملاحظہ ہو برہان ماہ دسمبر)

سیاح نے خراسان کو سترہ حصّوں میں بانٹا ہے:-

بلخ - طخارستان - بامیان - غزنین - بست - سجستان - ہراۃ - گنج رستاق - اسفزار - مروشاھجان - قوہستان - نیساپور - بوشنج - بادغیس - غرجستان (غرج الشار) جوزجان - مرورود -

خراسان کا تعارف

سیاح لکھتا ہے:- حقیقت یہ ہے کہ خراسان علاقہ ہیطل سے زیادہ عظیم الشان ہے کیوں کہ یہاں سامانی حکومت کا سب سے بڑا صدر مقام ہے، اس کے باشندے ہیطل کے مقابلہ میں زیادہ خوش سلیقہ، خوش لباس، خوش زبان اور بردبار ہیں، خیر وشر، حق وباطل سے ہیطل کی نسبت زیادہ آشنا ہیں، ان کے رسم ورواج، عربی ممالک کے رسم ورواج سے ہیطل کی نسبت زیادہ قریب ہیں،

خراسان کے صدر شہر بھی نسبتہً زیادہ شاندار، اور خوش آیند ہیں، اسی طرح یہاں ہیطل کے مقابلہ میں سردی بھی کم ہوتی ہے، اور باشندے بھی کم روکھے ہیں، یہاں کے قوانین اور آداب زندگی بھی وہاں کی نسبت بہتر ہیں، یہاں ہوشمندوں اور ذی علم اور ذی اقتدار اکابر کی تعداد بھی زیادہ ہے، تعلیم و تعلم، حدیث و روایت کا خوب چرچا ہے، دولت فراوان ہے، لوگ صائب رائے ہیں، یہاں مرو، بلخ اور نیساپور جیسے معمور، مالامال اور عظیم الشان شہر ہیں، اس مردم خیز ملک میں بڑے بڑے وزیر، لیڈر اور عالم پیدا ہوتے ہیں، یہاں ایسی ریاستیں ہیں جن میں انصاف کا بول بالا ہے، سلطان شار کی ریاست غرج (غرجستان) کا عدل اور فیاضی حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کے عہد کو تازہ کرتی ہے، سلطان غزنین برابر جہاد اور عسکری مُہموں میں مصروف رہتا ہے، یہاں کے بنی فریغون (سلاطین جوزجان) عدل و وفا کے لئے مشہور ہیں، با ایں ہمہ یہاں بُرائیاں پھیل گئی ہیں، سال میں دو بار خراج وصول کیا جاتا ہے، زمیندار اور جائداد والے مصیبت میں مبتلا ہیں، مذہبی اختلافات جھگڑوں اور بغاوتوں نے زندگی کی لذت اور عافیت تلخ کر دی ہے۔[1]

ممتاز شہر

بلخ:- یہ شہر جس کو سیّاح نے جنّت خراسان کے لقب سے یاد کیا ہے، خوش آیند، پُرلطف اور نعمتوں سے بھرپور تھا، افریقہ کے نزہت بخش شہر تاہرت اور شام کے دل کش پایۂ تخت دِمشق کی نظیر تھا۔ شہر کے اکثر راستوں سے نہریں اور نالے ہو کر گذرتے تھے، باغات اور گھنے درختوں نے شہر کو ڈھانپ لیا تھا، علم کا چرچا خوب تھا، اور بڑے بڑے جیّد عالم موجود تھے، یہاں کے فضلاء دور دور مشہور تھے اور ان کی بڑی عزت کی جاتی تھی، قانونِ اسلام (فقہ) کا خزانہ تھا، فیاضی

[1] مقدسی ص۲۹۴ و ص۲۹۵

اور مروت کی کان تھا، ہر قسم کی ضروریاتِ زندگی اور قدرتی نعمتیں فراواں تھیں، لوگ مہربان اور باشعور تھے، شہر کے مکانات کشادہ اور بازار خوش نما تھے، پھل لذیذ اور چیزیں سستی تھیں، پانی زود ہضم تھا، علم و تصوف کے مشائخ، سیاسی مدبر، وزراء اور لیڈر موجود تھے، شہر ہر قسم کے اضداد کا مظہر تھا، تجارت نفع بخش اور ترقی پذیر تھی، لوگ دولت مند تھے، کسی عجمی ملک کی جامع مسجد یہاں کی جامع مسجد کی طرح شاندار نہ تھی، اور مشرق کا کوئی شہر بلخ کا ہم پلہ نہ تھا، سندھ کی تجارت کی خاص منڈی اور خراسان کا مایۂ ناز شہر تھا۔ رقبہ میں بخارا کے برابر تھا، مگر یہاں کے مکانات بخارا سے زیادہ کشادہ تھے، جامع مسجد وسط بازار میں تھی، شہر میدان میں پہاڑ سے نصف مرحلہ (تقریباً دس میل) پر واقع تھا، شہر کی فصیل کے باہر ایک دوسری آبادی تھی جو اندرونِ شہر کی طرح معمور تھی، شہر کے گرد ایک بڑی خندق تھی، اور ایک بڑی نہر شہر میں داخل ہوتی تھی جس سے بہت سے نالے نکلتے تھے، عمارتیں کچی اینٹوں کی تھیں، شہر کے محصولات سے حکومت کو بہت آمدنی تھی، سیاح نے لکھا ہے کہ بلخ کے سارے ماتحت شہر عمدہ تھے۔ شہر میں برائیاں یہ تھیں :۔ قافلوں کی شاہ راہ سے دور واقع تھا، یہاں آنے میں بڑی کلفتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، یہاں جھگڑے اور بلوے خوفناک ہوتے تھے، بدکاریاں اور بے حیائیاں خوب پھیلی ہوئی تھیں [1]

غزنین :۔ صوبہ کے صدر مقام کا نام بھی غزنین تھا، یہ شہر بڑا تو نہ تھا مگر بہت دل لگا ؤ، چیزیں ارزاں تھیں اور معاشی سہولتیں مہیا۔ گوشت کی فراوانی تھی، پھل عمدہ تھے اور خوب۔ اس کے ماتحت بڑے بڑے شہر تھے، یہ خراسان و ہند کے تجارتی قافلوں کا اہم مرکز تھا، اور سندھ سے ہونے والی تجارت کی منڈی، باہر سے آنے

---

[1] مقدسی ص ۳۰۲

والوں کے لئے بالخصوص نہایت صحت بخش تھا، نہ یہاں مچھر ہوتے تھے اور نہ بچھو، مگر سردی سخت پڑتی تھی، اور برف بہت گرتا تھا، عام طور پر عمارتیں لکڑی کی تھیں، ہوا خشک تھی، پانی اچھا نہ تھا، ایک میدان میں پہاڑوں سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر واقع تھا، شہر کے دو حصے تھے، شاہی قلعہ شہر کے وسط میں تھا، اور کچھ بازار بھی فصیل کے اندر تھے، لیکن اکثر مکانات اور بازار فصیل کے باہر والے شہر میں تھے۔[1]

زرنج :۔ سجستان کا صدر مقام تھا، اس کا قلعہ نہایت خوبصورت اور عمارتیں خوش نما تھیں، یہاں سانپ بہت ہوتے تھے، باشندے تیز فہم، محنتی اور باحوصلہ تھے، علومِ عقلی و نقلی کی خوب اشاعت تھی، تجارت فروغ پر تھی، روزگار سہل الحصول تھا، چیزیں سستی تھیں، پھل خوب تھے، سیاح لکھتا ہے:۔ شہر خراسان کا بصرہ (یعنی تجارت کی اہم منڈی) تھا، یہاں کے معمار تعمیر اور نقش و نگار کے کام میں بڑے ماہر تھے، کھانے نہایت عمدہ اور صاف ہوتے تھے، علم و فن کے بڑے بڑے فاضل موجود تھے، تجارت نفع بخش اور روزگار سہل الحصول تھا، گرمی خوب پڑتی تھی، یہاں کی کھجوریں بے مزہ تھیں، فتنوں اور بلووں کا بازار گرم رہتا تھا، لوگ سیاسی و مذہبی جھگڑوں کے ہاتھ کا کھلونا بنے ہوئے تھے، مذہبی تعصب اور پارٹی بازی کا جنون زوروں پر تھا، بہت سے لوگ ان جھگڑوں کی نذر ہو جاتے تھے، اور بہت سے گھر بار چھوڑنے پر مجبور، اولاد الزنا فوج در فوج تھے، جن کی زندگی کا مقصد ایذا رسانی اور لوگوں کی ٹوپی اُچھالنا تھا، مخالف پارٹیاں قصائد میں ایک دوسرے کی دھجیاں اُڑاتیں، باشندے روکھے اور بارِ خاطر تھے، عام باشندے خارجی عقیدہ کے حامل تھے، مکانات تکلیف دہ اور

[1] مقدسی ص ۳۰۴

اور مروت کی کان تھا، ہر قسم کی ضروریاتِ زندگی اور قدرتی نعمتیں فراواں تھیں، لوگ مہربان اور باشعور تھے، شہر کے مکانات کشادہ اور بازار خوش نما تھے، پھل لذیذ اور چیزیں سستی تھیں، پانی زود ہضم تھا، علم و تصوف کے مشائخ، سیاسی مدبر، وزراء اور لیڈر موجود تھے، شہر ہر قسم کے اضداد کا مظہر تھا، تجارت نفع بخش اور ترقی پذیر تھی، لوگ دولت مند تھے، کسی عجمی ملک کی جامع مسجد یہاں کی جامع مسجد کی طرح شاندار نہ تھی، اور مشرق کا کوئی شہر بلخ کا ہم پلّہ نہ تھا، سندھ کی تجارت کی خاص منڈی اور خراسان کا مایۂ ناز شہر تھا۔ رقبہ میں بخارا کے برابر تھا، مگر یہاں کے مکانات بخارا سے زیادہ کشادہ تھے، جامع مسجد وسط بازار میں تھی، شہر میدان میں پہاڑ سے نصف مرحلہ (تقریباً دس میل) پر واقع تھا، شہر کی فصیل کے باہر ایک دوسری آبادی تھی جو اندرونِ شہر کی طرح معمور تھی، شہر کے گرد ایک بڑی خندق تھی، اور ایک بڑی نہر شہر میں داخل ہوتی تھی جس سے بہت سے نالے نکلتے تھے، عمارتیں کچی اینٹوں کی تھیں، شہر کے محصولات سے حکومت کو بہت آمدنی تھی، سیاح نے لکھا ہے کہ بلخ کے سارے ماتحت شہر عمدہ تھے۔ شہر میں برائیاں یہ تھیں :۔ قافلوں کی شاہ راہ سے دور واقع تھا، یہاں آنے میں بڑی کلفتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، یہاں جھگڑے اور بلوے خوفناک ہوتے تھے، بدکاریاں اور بے حیائیاں خوب پھیلی ہوئی تھیں [1]

غزنین :۔ صوبہ کے صدر مقام کا نام بھی غزنین تھا، یہ شہر بڑا تو نہ تھا مگر تھا دل لگا دینے والا، چیزیں ارزاں تھیں اور معاشی سہولتیں مہیا۔ گوشت کی فراوانی تھی، پھل عمدہ تھے اور خوب۔ اس کے ماتحت بڑے بڑے شہر تھے، یہ خراسان و ہند کے تجارتی قافلوں کا اہم مرکز تھا، اور سندھ سے ہونے والی تجارت کی منڈی، باہر سے آنے

[1] مقدسی ص ۳۰۲

والوں کے لئے بالخصوص نہایت صحت بخش تھا، نہ یہاں مچھر ہوتے تھے اور نہ بچھو، مگر سردی سخت پڑتی تھی، اور برف بہت گرتا تھا، عام طور پر عمارتیں لکڑی کی تھیں، ہوا خشک تھی، پانی اچھا نہ تھا، ایک میدان میں پہاڑوں سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر واقع تھا، شہر کے دو حصے تھے، شاہی قلعہ شہر کے وسط میں تھا، اور کچھ بازار بھی فصیل کے اندر تھے، لیکن اکثر مکانات اور بازار فصیل کے باہر والے شہر میں تھے [۱]

زرنج:۔ سجستان کا صدر مقام تھا، اس کا قلعہ نہایت خوبصورت اور عمارتیں خوش نما تھیں، یہاں سانپ بہت ہوتے تھے، باشندے تیز فہم، محنتی اور باحوصلہ تھے، علوم عقلی و نقلی کی خوب اشاعت تھی، تجارت فروغ پر تھی، روزگار سہل الحصول تھا، چیزیں سستی تھیں، پھل خوب تھے، سیاح لکھتا ہے:۔ شہر خراسان کا بصرہ (یعنی تجارت کی اہم منڈی) تھا، یہاں کے معمار تعمیر اور نقش و نگار کے کام میں بڑے ماہر تھے، کھانے نہایت عمدہ اور صاف ہوتے تھے، علم و فن کے بڑے بڑے فاضل موجود تھے، تجارت نفع بخش اور روزگار سہل الحصول تھا، گرمی خوب پڑتی تھی، یہاں کی کھجوریں بے مزہ تھیں، فتنوں اور بلووں کا بازار گرم رہتا تھا، لوگ سیاسی و مذہبی جھگڑوں کے ہاتھ کا کھلونا بنے ہوئے تھے، مذہبی تعصب اور پارٹی بازی کا جنون زوروں پر تھا، بہت سے لوگ ان جھگڑوں کی نذر ہوجاتے تھے، اور بہت سے گھر بار چھوڑنے پر مجبور، اولاد الزنا فوج در فوج تھے، جن کی زندگی کا مقصد ایذا رسانی اور لوگوں کی ٹوپی اچھالنا تھا، مخالف پارٹیاں قصائد میں ایک دوسرے کی دھجیاں اڑاتیں، باشندے روکھے اور بارخاطر تھے، عام باشندے خارجی عقیدہ کے حامل تھے، مکانات تکلیف دہ اور

---

[۱] مقدسی ص۳۰۴

مُتعفِن تھے، شہر وحشت خیز اور بے رونق تھا، اس کی فصیل کے باہر خندق تھی، جامع مسجد کے سامنے ایک جاذبِ نظر قید خانہ تھا[1]۔

ہَراۃ :- خراسان کا باغ تھا، نہایت معمور، اس کا دیہاتی علاقہ بھی خوب آباد اور سرسبز تھا، اعلیٰ قسم کے انگور اور پھل بہت پیدا ہوتے تھے، شہر کے مکانات باہم بھینچے ہوئے تھے، باشندے خوش مذاق، خوش پوش، خوش زبان اور صاحبِ فہم و نظر تھے، یہاں سے مختلف قسم کی مٹھائیاں اور کپڑے دساور کئے جاتے تھے، عام باشندے شرّی مزاج اور قتل کے خوگر تھے، شہر کے واعظ نہ تو فقہ و ادب میں درک رکھتے، نہ عبادت و ریاضت کی طرف مائل تھے، عام بولی رکیک اور سوقیانہ تھی، یہاں کی روٹی کھاکر پیٹ نہ بھرتا تھا، اور یہاں کے جھگڑے اور فسادات کبھی ختم نہ ہوتے تھے[2]۔

مروِ شاھجان :- بہت عمدہ شہر تھا، دل کش، خوش نما، شاندار، اور ارزاں، یہاں کے مکانات بلند اور خوبصورت تھے، باشندے جودتِ عقل اور بہادری میں مشہور تھے، گرمی کے موسم میں یہاں خاصی گرمی پڑتی تھی، شہر ایک وسیع میدان میں پہاڑوں سے دور آباد تھا، پرانا مرد ایک ٹیلے پر واقع تھا جس کے وسط میں جامع مسجد تھی، یہاں کھانے لذیذ ہوتے تھے، علوم و فنون کے فضلاء موجود تھے، رات کو علمی مناظرے اور مباحثہ کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں، واعظ ذی علم اور امام ابوحنیفہ کے مقلد تھے، مدارس میں طلبہ کو وظیفے دئے جاتے تھے، بازار خوش ترتیب تھے، شہر میں دولتِ عبّاسیہ کے مشہور سپہ سالار ابومسلم خراسانی کا محل تھا، یہاں کے حمام، کھچڑا اور روٹی خاص طور پر عمدہ تھے، پانی خراب تھا، فیاضی اور مروت کی بھی لوگوں میں کمی تھی، وسائلِ رزق تنگ تھے

---

[1] مقدسی ص ۳۰۵ [2] مقدسی ص ۳۰۶ و ۳۰۷

باشندے بڑے شاطر اور ہنگامہ پرور تھے، شہر کی آبادی فسادات کی وجہ سے کم ہوگئی تھی اور اکثر مکانات اُجڑ گئے تھے، فصیل کے باہر کی آبادی کا ایک تہائی حصہ کھنڈر تھا، شہر کا قُہندز اُجڑ چکا تھا، اور وہاں بغیر رہبر کے پہنچنا سخت دشوار تھا، پانی فصیل کے اندر اور باہر کی آبادی کے لئے نہروں اور نمبوں سے آتا تھا، شہر میں عمدہ حوض بھی تھے، جن تک مقررہ راستوں اور دروازوں سے رسائی ہوتی تھی، شہر میں بدکاریاں پھیلی ہوئی تھیں، اور مذہبی گروہ بندی کے زیر اثر ہونے والے جھگڑوں سے زندگی کا لطف کرکرا ہوگیا تھا، جامع مسجد میں خراج اور پولیس کے دفاتر تھے، باشندے طنز و تشنیع کے عادی تھے۔ چونکہ عباسی خلیفہ مامون (متوفی ۲۱۸ھ) ایک عرصہ تک یہاں رہا تھا، شہر کے لوگوں میں عراق کے طور طریق اور آداب کی بو آگئی تھی، اسی بنا پر یہاں بہت سے لوگ، خوش سلیقہ، خوش زبان اور خوش لباس نظر آتے تھے[1]

مرورُوذ :۔ بلند پایہ شہر تھا، جہاں ضروریات زندگی خوب مہیا تھیں، رقبہ میں زَبید سے دوٗ تہائی تھا، جامع مسجد جس کے ستون چوبی تھے، بازار میں واقع تھی، گرمی کے موسم میں یہاں گرمی پڑتی تھی جس کے زیر اثر بازار سائبان پوش کردئے جاتے تھے[2]

نَیشاپور (یا ایران شہر) صوبۂ نیشاپور کا صدر مقام اور سارے خراسان کا پایۂ تخت تھا، جلیل القدر شہر تھا، اسلامی دنیا میں اس کی نظیر نہ تھی، شہر میں بہت سی خوبیاں تھیں :۔ خوب وسیع تھا، پانی صحت بخش تھا، ہوا طاقت بخش تھی، علماء، فضلاء، وجیہ لوگ بڑی تعداد میں موجود تھے، پھل خوب تھے اور نہایت لذیذ ہوتے تھے، گوشت عمدہ تھا اور سستا بکتا تھا، رزق کے دروازے کھلے ہوئے تھے، بازار اور گھر کشادہ

[1] مقدسی ص ۳۱۱ و ۳۱۲ [2] مقدسی ص ۳۱۴

تھے، گاؤں اور جائدادیں آباد و سرسبز تھے، یہاں کی مٹی زرخیز اور باغ نزہت بخش تھے، لوگ نکتہ رس اور طبّاع تھے، مناظرہ اور مجادلہ کی مجلسیں عام تھیں، اسکول اور مدرسے خوش وضع تھے، لوگ باسلیقہ، خوش پوش اور خوش آداب تھے، رسم و رواج ستودہ تھے، مختلف پیشوں کے ماہر موجود تھے، تجارت، حوصلہ مندی، مروت، نیکی، دوستی اور محبت میں ان کا دور دور نام تھا، شہر مشرق و مغرب کی تجارت کا اڈا تھا، یہاں سے سامان دور دور ملکوں کو جاتا تھا، یہاں کے مختلف النوع کپڑے آب و تاب کے لئے مشہور تھے، مصر اور عراق کے خوش پوش اور شوقین یہاں کے کپڑے بہت پسند کرتے تھے، پھل دور دور سے یہاں لائے جاتے تھے، یہ فارس، سندھ، کرمان کی تجارت درآمد و برآمد کا چوراہا تھا، خوارزم، رَیّ اور جُرجان سے بھی اس کی تجارت بڑے پیمانہ پر تھی، دور دور سے لوگ تجارت اور تحصیل علم کے لئے ادھر کا سفر کرتے تھے، گرمی کا موسم یہاں خوشگوار ہوتا تھا، خوب برف باری کے باوجود سردی کا موسم تکلیف دہ نہ تھا، انگور کے باغ یہاں بہت تھے، کوئی فقیہ یا مذہبی عالم ایسا نہ تھا جو ادب سے دل چسپی نہ رکھتا ہو، انصاف کی باگ ڈور شریف حکام کے ہاتھ میں تھی، ہر دن مباحثے اور مبادلے ہوتے تھے۔ سیّاح نے لکھا ہے:۔ مجھ سے فارس میں ایک شخص نے نیساپور کے بارے میں پوچھا تو میں نے کہا:۔ یہاں چوالیس محلّے ہیں جن میں سے کچھ نصف شیراز، حیرہ یا جُور کے برابر ہوں گے، یہ شہر فسطاط سے بڑا تھا، بغداد سے اس کی آبادی زیادہ تھی، تجارت و تمدن میں بصرہ سے زیادہ تھا، قیروان سے زیادہ شاندار، اردبیل سے زیادہ صاف اور ھمذان سے زیادہ معمور تھا، نہ یہاں بو تھی، نہ دلدل، نہ وحشت، نہ کوئی تکلیف، ہاں یہ ضرور ہے کہ یہاں کی ہوا خشک تھی، لوگ روکھے تھے، بولی خراب تھی،

لوگ جلد مشتعل ہو جاتے تھے، عیش و لطف کے وسائل دشوار تھے، مسجدوں میں اندھیرا رہتا تھا، راستے گندے تھے، سراؤں پر وحشت برستی تھی، دکانیں بے ڈھنگی تھیں، شہر بلاؤں کی زد میں تھا، اشیاء ضرورت گراں تھیں، اچار، چٹنی اور ایندھن کمیاب تھے، دیہاتی علاقہ خشک تھا، شہر کی لمبائی تقریباً ۳ میل اور اسی قدر چوڑائی تھی، شہر کے گرد فصیل اور خندق تھی، شہر سے متصل قُہندز تھا، شہر میں داخل ہونے کے پچاس سے زیادہ راستے تھے، جامع مسجد رَبَض یا بیرونی شہر میں تھی، یہاں کے بلووں اور جھگڑوں کو دیکھ کر عقل گم ہوتی تھی اور مذہبی تعصبات کا مشاہدہ کر کے دل میں ٹیس اٹھتی تھی، شہر کا محتسب بے رُعب اور ڈھیلا تھا، خطیب فنِ خطابت سے بے بہرہ تھے، جمعہ کے دن جامع مسجد نمازیوں سے خالی ہوتی، یہاں کے پیش امام کسی گنتی شمار میں نہ تھے نہ ان کی تلاوت میں رس تھا، واعظ جھوٹ بولتے تھے، شہر میں شیعوں اور کرّامیوں کا طوطی بولتا تھا، امام شافعی اور امام ابو حنیفہ کے پیرو اقلیت میں تھے، اگر ایک حاکم معزول کر دیا جاتا تو شہر میں فتنوں کا دروازہ کھل جاتا اور مکاروں کی بن آتی۔ سیاح ان لفظوں میں شہر کا ذکر ختم کرتا ہے:

اس میں شک نہیں کہ یہ ایک جلیل القدر شہر ہے، مگر یہاں نہ تو کوئی اچھا بازار ہے، نہ کوئی اچھی سرائے، اس کے علاوہ عوام کا یہ حال ہے کہ جب کوئی سرپھرا کوئی نعرہ لگاتا ہے تو یہ اس کے پیچھے ہو جاتے ہیں، مذہبی فرقوں میں سخت تعصب ہے اور اہل شہر کی چال ڈھال بے ڈھنگی ہے[2]

ملک مشرق (ہیطل و خراسان) کا موسم و دیگر حالات

سجستان، بُست، اور طَبَس التَّمر کو چھوڑ کر جو گرم علاقے تھے، ہیطل اور

---

[1] ایک فرقہ جس کا ایک خاص کلامی مسلک تھا، جو حضرت معاویہ کی خلافت کو جائز قرار دیتا تھا اور حضرت عثمانؓ کے خلاف تحریک میں حضرت علیؓ کے اخلاقی تعاون پر نکتہ چینی کرتا تھا (الملل والنحل، شہرستانی) [2] مقدسی ص ۳۱۵ و ۳۱۶

خراسان کا سارا ملک سرد تھا، مگر خراسان میں ہیطل کی نسبت سردی ہلکی پڑتی تھی، سرد ہونے کے ساتھ یہاں کا موسم خشک بھی تھا، مگر سارے ملک (مشرق) کے ہر حصہ اور شہر میں خشکی یکساں نہ تھی، اس کے علاوہ جو مقام زیادہ سرد تھے وہاں گرمی کے موسم میں گرمی بھی زیادہ پڑتی تھی، اس عام قاعدے سے سمرقند کا علاقہ مستثنیٰ تھا، یہاں گرمی کا موسم معتدل اور خوش گوار ہوتا تھا، یہی حال نیساپور کا بھی تھا، البتہ یہاں سردی سمرقند سے کم ہوتی تھی، خراسان اور ہیطل میں لوگ گرمیوں میں چھت پر سوتے تھے، غرج الشار (غرجستان) کا صوبہ گرمی میں خاصہ گرم ہو جاتا تھا۔ خراسان اور ہیطل میں بہت سے دریا تھے، اور پھلوں کی بہتات تھی، سارے ملک میں تین جھیلیں تھیں۔ ایک کھاری اور دو میٹھی، کھاری جھیل خوارزم میں تھی، ایک میٹھی جھیل سجستان میں تھی اور دوسری بخارا میں۔ صرف سیحون اور جیحون دریا ایسے تھے جن میں کشتیاں چلتی تھیں۔

خراسان اور ہیطل ساری اسلامی دنیا میں علوم نقلی و عقلی کے سب سے بڑے مرکز تھے، یہاں کے لوگوں میں علم سیکھنے اور اس میں ترقی و تحقیق کا بڑا شوق تھا، یہاں کے واعظ دور دور مشہور تھے، اور بڑے بڑے مالدار تھے۔ ملک میں بہت سے یہودی آباد تھے، مگر عیسائیوں کی تعداد کم تھی، زردشتیوں کے مختلف فرقے بھی موجود تھے، سیاح نے لکھا ہے کہ اس ملک میں کوڑھ کا مرض بالکل نہ پایا جاتا تھا۔ حضرت علیؓ کی اولاد کو بڑی عزت و وجاہت حاصل تھی، ہاشمی خاندان کے لوگوں کو کوئی نہ پوچھتا تھا اور ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی[1]

حکومت

ہیطل اور خراسان کے علاقہ میں متعدد ریاستیں تھیں جن کے ایک الگ

[1] مقدسی ص ۳۲۲ - ص ۳۲۳

حکمراں تھے، تاہم یہ سارا علاقہ سامانی سلاطین کے زیر اقتدار تھا، اور ان کے نام پر ہر جگہ خطبہ پڑھا جاتا تھا، اکثر علاقہ کے محاصل بھی انہی کے خزانہ میں آتے تھے، مگر ذیل کی ریاستیں باجگذاری سے مستثنیٰ تھیں، یہاں سے صرف تحفے تحائف بھیجے جاتے تھے: سجستان (حکمراں عمرو بن لیث کا خاندان) جوزجان (حکمراں بنو فریغون) غرج الشار (حکمراں سلاطین شار) بُست و غزنین (حکمراں ترکی سلاطین) اور خوارزم۔

سامانی حکومت کے سپہ سالار کا مستقر نیساپور تھا۔ پہلا نامور سامانی سلطان اسماعیل بن احمد تھا جو ۲۸۷ھ میں کل ہیطل اور خراسان پر متصرف ہوا۔ سامان مضافات سمرقند میں ایک گاؤں تھا جو ان سلاطین کا آبائی وطن تھا، یہ لوگ بہرام گور کی اولاد سے تھے۔ سامانی سلاطین نہایت ستودہ سیرت کے حامل تھے علم و ادب کے بھی نہایت قدردان تھے۔ سیاح لکھتا ہے:۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ اگر کوئی درخت آل سامان کی بغاوت پر آمادہ ہو جائے تو بغیر سوکھے نہیں رہ سکتا، عضدالدولہ کی قوت، رسوخ، دولت مندی اور بڑھتی ہوئی کامرانی کا حال کس پر مخفی ہے: سارے یمن میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا، عُمان کو اس نے فتح کیا، سندھ میں بھی اس کا خطبہ پڑھا جاتا تھا، اس کے علاوہ ایران، فارس اور عراق کے جو علاقے اس کے قبضہ میں تھے اُن سے سب واقف ہیں، بایں ہمہ شوکت، جب اس نے سامانیوں سے تعرض کیا اور خراسان کا سودا اس کے سر میں سمایا تو خدا نے اس کو ہلاک کر دیا، اس کا شیرازہ بکھیر دیا اور اس کی فوجیں تتر بتر کر دیں اور اس کا ملک اس کے دشمن سامانیوں کے حوالہ کر دیا۔"

سامانی دربار میں علماء کو زمین بوسی پر مجبور نہیں کیا جاتا تھا، جمعہ کی رات

کو رمضان کے مہینہ میں ان کے دربار میں مناظرہ اور مباحثہ کی مجلسیں ہوا کرتی تھیں، جن میں بڑے بڑے فاضل شریک ہوتے تھے، بادشاہ علماء کے سامنے مختلف سوالات پیش کرتا جن پر ان کے مابین بحثیں ہوتیں۔ سامانی سلاطین کا رجحان امام ابو حنیفہ کے مسلک کی طرف تھا۔ یہ لوگ رعیت اور عوام سے الگ تھلگ رہتے تھے، مہمات حکومت اور سیاسی معاملات کی سربراہ کاری وزیر اور حاجب کے ہاتھ میں تھی، ہاں، جب کسی شخص کی عزت افزائی مقصود ہوتی تو یہ سلاطین اپنے ساتھ کھانے کے لئے اس کو بلاتے تھے، اہم معاملات میں ایلچیوں کے روبرو ہو کر بھی بات کر لیتے تھے، ان کا وزیر بخارا کا سب سے ممتاز ماہر فقہ اور راستباز شخص ہوتا تھا، ان کی صحبت میں ہمیشہ بڑے بڑے اصحاب علم و نظر رہتے تھے[1]

مصنوعات اور تجارت

نیساپور سے ذیل کا سامان برآمد ہوتا تھا:۔ سفید کپڑا، (ثیاب البیض الحفیّۃ؟) شاہجانی نام کے عمامے (العمائم الشہجانیۃ الحفیّۃ؟) راختج نامی کپڑا؟ تاختج نامی کپڑا؟ نقابیں، بٹے ہوئے ریشم کا کپڑا، (بین الثوبین؟) یک رنگا کپڑا (مُصمت) عُتابی نام کا کپڑا (ایک قسم کا گراں، لہریا ریشم) سعیدی نام کا کپڑا؟ نظر القفی اور مُشطی نام کا کپڑا؟ بنے بنائے تیار جوڑے۔ اونی کپڑا، اعلیٰ قسم کا سوت، لوہا وغیرہ۔

نسا اور ابیورد سے:۔ کچا گھٹیا ریشم (قز) ریشمی کپڑا، تل، تل کا تیل، زربفت کا کپڑا۔

طوس سے:۔ اعلیٰ قسم کی ڈوریاں، چٹائیاں، غلّے، عمدہ قسم کے کمربند، عمدہ چادریں۔

---

[1] مقدسی، ص ۳۳۷-۳۳۹

نسا سے :- بنبوزی نامی کپڑا، لومڑی اور شکرے کی پوستین۔
نیساپور کے دیہاتی علاقہ سے :- مختلف قسم کا موٹا کپڑا۔
ہَراۃ سے :- مختلف قسم کا کپڑا، گھٹیا زر کار ریشمی کپڑا (دیباج) خُلدی ؛ طائفی کشمش، ہری اور سرخ کشمش، اور منقی، انگور کا شربت (دوشابہ) مربّے، ناطفہ، فولاد، پستہ، خراسان کی بیشتر مٹھائیاں۔
مرو سے :- رستے، ریشمی نقابیں، ریشم، گاتے، پنیر، بیج، تل کا تیل، تانبا۔
سَرخس سے :- غلّہ، اونٹ۔
سجستان سے :- کھجور، ٹوکریاں، کھجور کے پتوں سے بنائی ہوئی رسیاں، چٹائیاں
قوھستان سے :- سفید سوتی کپڑا، قالین، عمدہ جانمازیں۔
بلخ سے :- صابن، تل، چاول، اخروٹ، بادام، کشمش، گھی، شیرۂ انگور، انجیر، شربت انار، توتیا (زاج) گندھک، سیسہ، سنکھیا (زرنیخ) اسپرک نام کی زرد گھاس جو رنگائی کے کام آتی تھی، سلگنے والی خوشبوئیں، ریشمی اور سوتی برقعے (دقایات) چادریں، مختلف قسم کا تیل، کھالیں۔
غرج الشار (غرجستان) سے :- سونا، نمدے، خوبصورت قالین، تھیلے، عمدہ گھوڑے، عمدہ خچر۔
ترمذ سے :- صابن، ہینگ۔ یہاں کشتی سازی کا کام بھی ہوتا تھا۔
(معجم البلدان یاقوت لوالج) ولوالج سے :- تِل، تِل کا تیل، اخروٹ، بادام، پستہ، چاول، مٹر، بیری، تازہ پنیر یا پنیر نکلا دودھ (زرخبین) گھی، سنگ، لومڑی کی کھالیں۔
بخارا سے :- ڈھیلے، نرم کپڑے، جانمازیں، بڑے قالین، جاندنیاں، موزنیاں (ثیاب الفرش القندقیۃ؟) زرد رنگ کی دو سوتی (صفر المنیّر؟) طبری ؟، زین کسنے کے تسمے، اُشمونی نام کا کپڑا، پھلوں کا شیرہ، بھیڑ کی کھالیں، روغن مہندی۔

گرمینیہ سے :- رومال۔

دبوسیۃ اور وذار (ھیطل) سے :۔ عمدہ قسم کا وذاری نام کا کپڑا۔

(معجم البلدان یاقوت ربخن) زبخن (ھیطل) سے :- سرخ رنگ کے زنانے اونی تہبند یا عزارے، کھالیں، جانمازیں، کٹورے، سن کی رسیاں، گندھک۔

خوارزم سے :- سمور نامی جانور کی پوستین، سنجاب بھورے رنگ کی گلہریوں کی پوستین (جن کو آرائش، نرمی اور گرمی کے لئے مالدار لوگ پہنتے تھے)، قاقم نام کے جانور کی پوستین (اس کی پوستین گرمی میں بھوری اور جاڑے میں سفید ہو جاتی تھی)، فنک نامی لومڑی کی پوستین، دلہ نامی جانور کی پوستین، ختز نامی جانور کی پوستین، (ختز پوست) رنگین خرگوش کی پوستین، بکری کی کھالیں، موم، تیر، ٹوپیاں، غراالسمک (مچھلی سے بنا ہوا گوند؟) (اسنان السمک) مچھلی کے کانٹے، اود بلاؤ کے خصیے، (خزمیان) کہربا نام کا معدنی گوند جو آرائشی سامان بنانے میں کام آتا تھا، کیمخت نام کا کھردرا چمڑا، شہد بندق (نام کا گرمی دار میوہ)، شکرے، تلواریں، زرہیں، خلنج نام کے چتکبرے کبوتر، صقلبی غلام، بکریاں، گائیں (یہ تمام اشیا ملک یلغار سے خوارزم آتی تھیں اور یہاں سے دوسرے ملکوں کو بھیجی جاتی تھیں) اس کے علاوہ خوارزم سے ذیل کا سامان باہر بھیجا جاتا تھا:- عناب، بڑی مقدار میں کشمش اور منقی، دودھ دوہنے کے برتن (ملابن) تل، چادریں، دریاں، اوڑھنے کے مطابب کے کپڑے، اعلیٰ قسم کا زرکار ریشمی کپڑا ریشمی نقابیں، تیاب آرنج؟ سخت کمانیں مچھلی، پنیر یا پنیر نکلا دودھ، مکھن یا تازہ پنیر، چھاچھ (مصل) مٹھا، یہاں کشتی سازی کا کام بھی ہوتا تھا۔

سمرقند سے :- سمرقندی اور سیمگون نامی کپڑا، تانبے کی دیگیں، عمدہ قسم کے قاقم جانور کی پوستین، زرکار ریشمی کپڑا (دیباج)، ممرجل نام کا سرخ کپڑا، سینیزی؟ (شاید کپڑے کا نام ہے) خیمے، رکابیں، لگام کے چھلّے، تسمے، بڑی مقدار میں گھٹیا کچا

ریشم (قز)، ریشمی کپڑا، بندق نام کا گرمی دار میوہ، اخروٹ۔

وذگ (ھیطل) سے:۔ عمدہ قسم کے بندے، چست کوٹ۔

بنکمث سے:۔ ترکستانی کپڑا۔

شاش سے:۔ کیمخت نامی کھردرے چمڑے کی بنی ہوئی زینیں، ترکش، خیمے ترکستان کے جانوروں کی مدبوغہ کھالیں، تہبند، جانمازیں، بیج، عمدہ قسم کی کمانیں، گھٹیا درجہ کی سوئیاں، روئی، قینچیاں، زربفت وغیرہ کی کلیاں اور پھول جو قمیصوں پر ٹانکے جاتے تھے، (بنیقات)۔

فرغانہ اور اسیجاب سے:۔ ترکی غلام، سفید رنگ کا کپڑا، تلواریں، ہتیاروں سے متعلقہ سامان، تانبا، لوہا۔

طراز سے:۔ بکری کی کھالیں۔

شلجی سے:۔ چاندی۔

ترکستان اور ختل سے:۔ گھوڑے، خچر۔

دانجرد (ھیطل) سے:۔ عمدہ قسم کا زعفران۔

ہیطل اور خراسان کی بے نظیر چیزیں

نیسابور:۔ دیباج (زرکار ریشمی کپڑا جس کے پلو پر قیمتی کام ہوتا تھا) طراز زرکار قیمتی ریشم جس سے شاہی خلعت بنائے جاتے تھے) ایک قسم کی کھانے کی مٹی، کھمبی، شہجانی؟، سوئیاں، چاقو، ریباس نام کی لذیذ ترکاری جو بڑے لوگ کچی کھاتے تھے،

مرو شاہجان:۔ دودھ دوہنے کے برتن، اشترغاز (درخت ہینگ کی جڑ) تربوز، روئی، کھچڑا۔

بخارا :- ہر قسم کا گوشت، سلاف نامی تربوز۔

خوارزم :- کمانیں۔

شاش :- تھالیاں یا بڑے پیالے۔

سمرقند :- کاغذ۔

نسا :- بینگن۔

ہراۃ :- انگور[1]

معدنیات

ہیطل اور خراسان میں بہت سی کانیں تھیں۔

نیسا پور :- فیروزہ، بنج (ایک سیاہ فام پتھر جس سے انگوٹھی کے نگینے اور دوسری چیزیں بنائی جاتی تھیں)، سنگ مرمر۔

بدخشاں :- انگوٹھیوں کے نگ، سنگ لاجورد، سنگ بلور، سنگ بازہر، حجر الفتیلہ (اس کی چراغ کی بتیاں اور دسترخوان بنائے جاتے تھے)

پروان، بنجہیر، شلجی :-

(شلجی) (ایک پہاڑی علاقہ جو فرغانہ تک پھیلا ہوا تھا) چاندی کی بہت سی کانیں تھیں۔

ایلاق :- نوشادر، سونا، چاندی، ذوالفار (چاندی کا دھواں)۔

سیاح نے لکھا ہے کہ ہیطل کے علاقہ میں پیٹرول اور فیروزہ کی کانیں تھیں مگر مختلف دقتوں کی وجہ سے وہاں کھدائی نہیں کی جاتی تھی۔ اس علاقہ میں تارکول اور رال بھی پایا جاتا تھا۔

زوزن :- کھانے کی مٹی۔

---

[1] مقدسی صفحہ ۳۲۴ و صفحہ ۳۲۶

ترکوں میں مذہبی احساسات کی بیداری

از

(ہاورڈ، اے، ریڈ، ناظر ادارۂ مطالعاتِ اسلامی، میک گل یونیورسٹی)

مترجم

(کپتان محمد قطب الدین احمد صاحب، بی۔ اے)

(۲)

دوسری متوازی کوشش اس سلسلہ میں یہ کی گئی ہے کہ مختلف صوبائی مرکزوں قیصریہ ارزمیر، اور قونیہ وغیرہ جیسے مقامات پر خطیب اور اماموں کی تعلیم کے لئے پندرہ مدارس قائم کئے گئے ہیں۔ ان کی حیثیت ثانوی مدارس کی سی ہے، جس میں ۵۵ فی صد عام تعلیمی نصاب رکھا گیا ہے، عربی کی تعلیم، تلاوت قرآن، اور خالص دینی علوم نصاب نامہ کے بقیہ ۴۵ فی صد حصہ پر حاوی ہیں۔ یہ چیز خاص اہمیت رکھتی ہے کہ یہ مدارس نظارت امور مذہبی کے بجائے وزارت تعلیم کے زیر نگرانی ہیں۔ ان کے صدر مدرسوں کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتی جاتی ہے، یہ ایسے قابل افراد پر مشتمل ہوتے ہیں جن کی تعلیم کلیتاً آزادانہ علوم میں ہوئی ہو اور اگر ان کی کوئی مذہبی تعلیم ہوئی بھی ہو تو وہ ایک معمولی حیثیت رکھتی ہو۔ جن لوگوں کی بابت میں نے اظہارِ خیال کیا ہے وہ اس بات کے شدید آرزومند ہیں کہ اس نازک صورت حال میں کوئی تعمیری کام انجام دیں۔ یہ جہل ولاعلمی کے ان چھپے خطروں اور ردعمل سے بخوبی واقف ہیں جو ان کی راہ میں حائل ہیں۔ جو طالب علم ان مدرسوں میں شریک ہوتے ہیں ان میں کی ایک زائد تعداد دیہاتی بچوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ نسبتاً مالدار زراعت پیشہ طبقہ کی اولاد ہوتے ہیں، جو اپنے بچوں کو ان والدین کے مقابلہ میں جو اتنے متمول نہیں ہوتے، آسانی کے ساتھ تعلیم کے لئے چھوڑ سکتے ہیں۔

قیصریہ اور قونیہ جیسے شہروں اور ارزومیر جیسے ملحدانہ مقام پر بھی ان جدید دینی مدارس کا عوام کی طرف سے کھلے دل سے استقبال کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر شہر میں مدرسوں کی تعمیر اور تعلیم کو فروغ دینے کے لئے خانگی انجمنیں ترتیب دی گئی ہیں، جو سرمایہ کی فراہمی، قطعاتِ ارض کے حصول، اور دیگر ساز و سامان کا انتظام کر رہی ہیں۔ قیصریہ میں زائد از نود ہزار ترکی لیرا (تقریباً ۳۲ ہزار ڈالر)، اور قونیہ میں زائد از ایک لاکھ پندرہ ہزار ترکی لیرا (تخمیناً ۴۱ ہزار ڈالر) کی معتدبہ رقم وہاں کے دینی مدارس کی اعانت و توسیع کے لئے خانگی طور پر فراہم کی گئی ہے۔ اعلیٰ ثانوی مدارس جن کا درجہ نظام تعلیم میں دوسرا ہے اب تک ان میں دینی تعلیم کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں کیا گیا لیکن اس کے امکانات پر غور و خوض جاری ہے۔

جامعہ انقرہ، جس کو ۱۹۴۶ء میں ایک علیحدہ آزاد حیثیت حاصل ہو چکی ہے، یہاں ایک جدید شعبہ دینیات کا قیام ۱۹۴۹ء میں عمل میں لایا گیا ہے، جو اس وقت مدرسہ سیاسیات سے متصل ایک خوشنما عمارت میں قایم ہے اس کو اپنی اس تحریک میں برسر اقتدار عوامی جمہوری جماعت سے کافی مدد ملی ہے۔ یہ واحد شعبہ دینیات ہے جو ترکی کو عطا ہوا۔ اس نے اس توازن کو دوبارہ بحال کیا جو ۱۹۳۳ء میں استنبول یونیورسٹی میں شعبہ دینیات کی موقوفی سے رونما ہوا تھا۔ یہ سابقہ شعبہ دینیات ۱۹۲۴ء میں قایم کیا گیا تھا، لیکن طلباء کی جو تعداد اس میں داخل ہوئی تھی وہ ۲۷-۱۹۲۶ء میں ۲۸۷ سے کم ہوتے ہوتے ۱۹۳۲ء میں صرف دس تک رہ گئی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے انقرہ کا یہ شعبہ دینیات عالم اسلامی میں اپنی نوعیت کا ایک ہی ادارہ ہے خالص اسلامی آداب و ضوابط کے علاوہ یہاں مذہب کے بالموازنہ مطالعہ اور اس کی تاریخ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اب یہ ایک بالکل آزاد شعبہ ہے جس کے ایک سہ ماہہ رسالہ کی اشاعت مجلہ شعبہ دینیات کے نام سے جاری ہے اس مجلہ کو ترکی اور یورپ کے علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس شعبہ کے اراکین نے تحقیقاتی منصوبات کے سلسلہ میں مصر، یورپ اور کناڈا کی سیاحت کی ہے۔ کوئی تین سو طالب علم و طالبات اس وقت زیر تعلیم ہیں۔

طلبسانوں کی پہلی جماعت جس نے ۱۹۵۳ء میں یہاں سے کامیابی حاصل کی ان کی مختلف شعبوں میں بحیثیت معلم، امام، اور اوقاف ولظارت امور مذہبی جیسے خصوصی عملہ کے لئے بڑی زبردست مانگ ہے۔ ۱۹۵۳ء کے اواخر میں حکومت نے یہ اعلان کیا کہ وہ انتخاب اور تعلیم وتربیت کے بعد ترکی کے ایک ہزار دیہاتوں کے لئے امام مہیا کرنے کا انتظام کرے گی۔

رجعت پسند تحریکات

ان اصلاحی تحریکات کے پہلو بہ پہلو قدرتاً رجعت پسندوں کا بھی نمود وظہور ہوتا رہا۔ ان میں کا سب سے زیادہ مشہور گروہ تیجانیوں (Tijanis) کا رہا ہے، جس کی بابت ترک کا بیان ہے کہ ابتداءً اس کا تعلق شمالی افریقہ کے درویشی نظام سے تھا۔ یہ قرآن کی اس آیت کی بنا پر

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ	"مسلمانو! بلاشبہ شراب، جوا، معبودانِ باطل کے
وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ	نشان، اور پانسے شیطانی کاموں کی گندگی ہے
رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ	توان سے اجتناب کرو تاکہ تمہیں فلاح حاصل ہو"
فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (المائدہ ۹۰)	

اپنے متبعین کو جن کی زیادہ تعداد انقرہ اور اناطولیہ کے وسطی علاقوں میں پائی جاتی ہے، اس بات پر برانگیختہ کیا کہ وہ جاندار مخلوق خاص کر اتاترک کے مجسموں کو مسمار کر ڈالیں کیوں کہ اس قسم کی تمثالات کا اسلام میں کوئی مقام نہیں۔ ترکی میں اس گروہ کے حالات کا واضح طور پر تعین نہیں کیا جا سکتا، لیکن غالباً اس کا آغاز جنگ عظیم اول کے عین قبل یا دوران یا اس کے خاتمہ پر ہوا۔ ۱۹۲۵ء کے بعد یہ گروہ روپوش ہو گیا، اور جنگ عظیم ثانی کے اختتام پر یہ پھر دوبارہ نمایاں ہوا جب کہ انقرہ کے ایک تجارت پیشہ شخص نے، جس نے قانون کی تعلیم پائی تھی اپنے اطراف میں ان کو جمع کرنا شروع کیا اور خود ان کا پیشوا بن بیٹھا۔ یہ تیجانی لیڈر کمال پیلا وگلو (Pila voglu) ایک صاحب ثروت اور حوصلہ مند آدمی تھا۔ یہ بظاہر اپنے متبعین کے اندھے جوش وخروش کو اپنے مادی وسیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ پولیس

کے ساتھ متعدد جھڑپوں، بعض محبسوں کی تخریب و بربادی، اور بعض کی توہین و بے حرمتی کے بعد حکومت نے بلاو گلو اور اس کے سربرآوردہ ساتھیوں کو نظر بند کر دیا۔ جولائی ۱۹۵۲ء میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ مختلف خلاف ورزیوں اور قانون شکنیوں کے سلسلہ میں انھیں پانچ سال سے دس سال تک سزا دی گئی جن میں سے بعض کو مشقت کے ساتھ تھی اس کے بعد تیجانیوں کی بابت کچھ سننے میں نہیں آیا، البتہ یہ کہا جاتا ہے کہ بعض اس کی توقع رکھتے ہیں کہ معجزانہ طریق پر ان کا دوبارہ ظہور ہوگا اور مہدویانہ انداز میں ان کے پیشواء کی غیب سے نصرت و تائید کی جائے گی۔

دیگر درویشی نظامات علی الخصوص نقشبندیہ کی سرگرمیاں ترکی میں جاری ہیں۔ ۳ر فروری ۱۹۵۳ء میں ماردین کے مقام پر کسی ممنوعہ مذہبی رسم کی ادائی میں سترہ نقشبندی لیڈروں کو ترکی کے مختلف مقامات پر گرفتار کیا گیا۔ چند ماہ قبل بکتاشیوں (Bektashis) کا ایک مشتبہ اجتماع ہوا تھا جس کو استنبول پولیس نے غیر آئینی قرار دے کر روک دیا۔ نوجوانوں کی ایک خاصی تعداد سن رسیدہ لوگوں کے دوش بدوش مقطع ریش و بردت کے ساتھ لانبے کوٹ اور عبا پہنے ہوتے نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ اپنی ڈاڑھی اور مونچھ علماء اور دراویش کی طرز پر رکھتے ہیں اور بجائے مغربی چھجے دار ٹوپیوں کے، جن کا حکم ۱۹۲۵ء میں دیا گیا تھا فوجی طاقیے (Berets) استعمال کرتے ہیں۔

بدقسمتی سے بعض مخلص اور دیگر غیر محتاط قائدین اور اہل صحافت اس امر کے کوشاں ہیں کہ مذہب کے ساتھ دلچسپی اور اسلام کے ساتھ ناواقفیت کے اس امتزاج کے رخ کو اپنے مفادات کی جانب پھیر دیں۔ ان میں کی ایک رسوائے عالم شخصیت نجیب فاضل کساکورک (Kisakurak) کی ہے۔ یہ ایک قابل شاعر ہے، اور انتہا درجہ رجعت پسند اور متعصبانہ اخبار ینی بیوک دوغو (Yeni Buyakdogu) 'شاندار مشرق جدید' کا ایڈیٹر ہے اپنے ناشائستہ حرکات کے سبب یہ متعدد بار نظر بند کیا گیا۔ بایں ہمہ یہ اپنے سادہ لوح قارئین کے نزدیک روحانی تاثر و فیضان کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے۔ ۱۹۵۲ء تک قصبات و مفصلات میں اس

کے اخبار کی بڑی وسیع اشاعت تقسیم تھی۔ کچھ مدت تک اس کا اخبار گورنمنٹ کے دئے ہوئے اعلانات کی اشاعت کرتا رہا، اور یہ خود جمہوری جماعت کی تائید و حمایت کا دعویدار تھا اس کے بعد سے یہ نظر بند ہے اور اس کا اخبار اس مشتبہ الزام میں مسدود کر دیا گیا کہ نوجوانوں کی ایک جماعت نے، جو سمجھا جاتا ہے کہ اس کے اشتعال انگیز تحریرات سے متاثر ہو کر ترکی کے ایک سربرآوردہ حریت پسند اور نہایت تجربہ کار جریدہ نگار احمد امین یلمان پر نومبر ۱۹۵۲ء میں قاتلانہ حملہ کیا تھا۔

دیگر دلیرانہ کام، اصلی یا نقلی اسلامی مستند کتابوں کی نشر و اشاعت اور تصنیفی مسارقت کے اختیار کئے گئے، لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ اکثر و بیشتر اس نوعیت کی چیزیں الحاق کی گئیں جن سے ان کے اصل مصنفین بالکل لاعلم تھے ان کے ناشرین کی طرف سے یہ اس لئے داخل کی گئیں تاکہ ان کے قارئین کے خام یا تنگ نظر احساسات کو ابھارا جائے۔ طبع و اشاعت کا ایک زائد حصہ قرآن کے ترجموں پر مرکوز کیا گیا۔ اوراد و وظائف کی کتابیں بڑی دیدہ زیبی کے ساتھ لیکن ایسے عربی خط میں شائع کی گئیں جو پڑھا نہ جا سکے۔ یہ زیادہ تر آرائش و زینت یا نقشوں کے طور پر استعمال کے لئے تھیں فحش کتابوں کو مقدس و متبرک رنگ روپ دے کر پیش کیا گیا اور گھوم پھر کر بیچنے والوں کے ذریعہ اعلیٰ داموں یا حسب استطاعت ہر قیمت پر دیہاتی علاقوں میں انھیں فروخت کیا گیا۔ فروری ۱۹۵۳ء میں ایک معتبر اخبار نے سند و شہادت کے ساتھ ان ناجائز طریقوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اس بنا پر پولیس کی طرف سے طبع و اشاعت کے تحفظات کی طمانیت کے ساتھ اس قسم کی فریب کاریوں کے سدباب کے لئے مناسب کارروائی اختیار کی گئی۔ پولیس نے یہاں تک اس معاملہ میں احتیاط برتی کہ عربی رسم الخط میں جو مخطوطات اور مطبوعات ۱۹۵۳ء کے موسم حج میں حجاج اپنے ہمراہ لائے تھے ان پر نگرانی اور سخت احتساب قائم کر دیا۔ تمام بے ضرر کتابیں ان کے مالکوں کو واپس کر دی گئیں اور بقیہ کو ضبط کر لیا گیا۔ اس احتساب کی اصل ذمہ داری نظارت امور مذہبی کے نمائندوں کو تفویض کی گئی۔

یلمان پر قاتلانہ حملہ کے بعد سے ہر دو عظیم سیاسی جماعتوں نے اس جاہلانہ ردّ عمل کے خطرہ

کو بخوبی محسوس کیا۔ سابق صدر جمہوریہ عصمت انونو اور وزیر اعظم مندرس نے کچھ عرصہ تک ان باہمی
اختلافات کو ہم آہنگ کرنے میں رہنمائی کی، اور ایسے داخلی رجعت پسندانہ خطرات کے خلاف
متحدہ طور پر موثر کارروائی اختیار کی گئی۔ عمومی جماعت سے متعدد نمائندوں کا اخراج اس وجہ
سے عمل میں لایا گیا کہ وہ اپنے ملک کے لئے اور اپنے جماعتی لائحہ عمل میں اسلام کی حیثیت سے
متعلق انتہا پسند خیالات کے حامل تھے۔ دوسری طرف حکمت بایور (Bayar) سابقہ
ملی جماعت کا رکن تھا، جو ابتداءً منحرف عمومیت پسندوں پر مشتمل تھی، اور جس کو حالیہ انتخابی
مہم میں طرفداران عمومیت کی طرف سے سرگرمانہ حمایت و تائید حاصل ہوئی ہے۔

قوم کا موجودہ مزاج

ایک دوسری انتہائی نازک اور حد درجہ اہم سطح پر ہم ایسی جماعتوں کے نمود و ظہور کا ذکر
کریں گے جو مذہب کے زیر اثر اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں خلوص دل کے ساتھ روحانی اصلاح
و ہدایت کے آرزومند ہیں۔ یہ کسی بزرگ کی ذات یا کسی قابل احترام شخصیت سے خود کو وابستہ
کئے ہوئے ہیں، جو ان کے لئے بطور ایک نمونہ و مثال کے ہے۔ اس قسم کی ایک خدا رسیدہ
اور محترم شخصیت کا اظہار اس وقت بلا کسی پس و پیش کیا جا سکتا ہے کیوں کہ مارچ ۱۹۵۳ء
میں یہ ایک دوسرے عالم میں پہنچ چکی ہے۔ یہ بزرگ شخصیت عمر فوزی ماردین کی ہے ۱۹۰۸ء
سے قبل یہ مقدونیہ میں انجمن اتحاد و ترقی کی انقلابی جماعت کے اولین رکن تھے جنگ عظیم
اول میں یہ ایک ممتاز اسٹاف افسر اور کرنل رہ چکے تھے۔ بحر وسط الارض میں کروزر ([illegible])
حمیدیہ کی دریا نوردیوں کے دوران میں شروع سے آخر تک نہایت حیرت انگیز طریقہ پر رسد رسانی
کا کام انجام دیتے رہے، جو ان کے مشہور دوست کپتان رؤف آربے کے زیر کمان تھا۔ اگرچہ
ان کا ایک لڑکا بڑا متمول تاجر تھا اس کے علاوہ وہ اپنے کئی ذی ثروت اور ذی اثر بزرگوں سے
مدد بھی حاصل کر سکتے تھے، لیکن یہ بے نفس و غیور مسلمان کادی کوئی (Kadikoy) کے

حوالی میں، جو استنبول کے مضافات سے ہے، ایک دو منزلہ مکان کے گوشہ میں اپنی سادہ اور محتاط زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کی خدمت میں چند معتقدین ہر وقت حاضر رہتے اور یہ اپنا سارا وقت قرآن کی آزادانہ تفسیر، کتب ادعیہ کی تسوید، اور اہل کتاب علی الخصوص مسلمان، یہودی اور عیسائیوں کو باہمی اتحاد و دوستی کی طرف بلاتا رہتا تھا۔ وہ اپنے کثیر التعداد پیروؤں کو اس بات کی پند و موعظت کرتا رہتا کہ وہ ایک پاکیزہ، عبادت گذار، اور خود فرد شانہ زندگی بسر کریں۔ اس بات پر اُسے کامل یقین تھا کہ ایک خاص خدمت اس کے لئے تفویض کی گئی ہے۔ اور اسے بعض اوقات خدا کی طرف سے چند عبارات لکھنے یا بعض دیگر عبارتوں کی جدید تشریح و توضیح کا الہام ہوتا ہے۔ اس کے تعلقات لوئی میسی نون جیسے مستشرقین سے تھے، جو مشہور کیتھولک عالم ہے۔ بعض یہودیوں اور عیسائیوں سے بھی اس کے دوستانہ تعلقات تھے اس کی مصنفات، جن کی اشاعت کا انتظام اس کے احباب کیا کرتے تھے، ان کے دیکھنے سے اس کے علم و عرفان، اور اسلام اور دیگر تمام توحیدی مذاہب کے تجدید و احیاء کی شدید خواہش کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے چند متبعین، جن سے کہ میں واقف ہوں، ان کی زندگیوں اور طرز و روش پر اس کا گہرا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ عمر فوزی ماردین میں قطعی طور پر کسی قدر متصوفانہ رنگ ضرور تھا۔ بعض ترک احباب سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس کے جیسے بہت سے لوگ جو تمام کے تمام صوفی منش ہیں، اعلیٰ ثانوی اور جامعاتی طلباء میں اپنے بہت سے متبعین رکھتے ہیں، جو ایک والہانہ، مخصوص اور غیر متعصبانہ اسلامی عقیدہ کے متلاشی ہیں، جس کا نشان مسلمانوں کی رسمی زندگی میں انھیں کہیں نظر نہیں آتا۔ اس بات سے ترکوں کے مذہبی اندازِ فکر اور حالیہ دور میں عام اسلامی زندگی کی بابت ان کے قدیم امتیازی وصف کی شہادت ملتی ہے۔

مذہب سے متعلق یہ عام مقبولیت ان جدید مساجد اور عبادت گاہوں سے نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہے جن کی داغ بیل نئی آبادیوں، خاص کر انقرہ، اور دیگر متعدد شہروں اور

قصبات میں کثرت کے ساتھ ڈالی جا رہی ہے۔ اہل قصبات کی طرف سے حالیہ زرعی خوشحالی کے دور میں مسجد کی تعمیر یا موجودہ عمارت میں ترمیم و اضافہ کو منصوبات قومی (Community Projects) میں اولین حیثیت دی گئی ہے۔

ترکی میں مذہب کے ساتھ روز افزوں واقفیت نے اہل سنت کے حکمراں طبقہ کو شیعہ فرقہ کی طرف سے بہت باخبر کر دیا ہے سرکاری اعداد و شمار میں ایک عرصہ تک تمام مسلمان بحیثیت اہل سنت کے محسوب کئے جاتے رہے، لیکن شیعہ کی تعداد کا صحیح اندازہ (۱۰) اور (۳۰) لاکھ کے درمیان کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی دیہات میں گشت لگائے تو اس کو بہت سے شیعہ نظر آئیں گے اور سنیوں کے ہمسایہ دیہات سے ان کی بابت بہت کچھ سننے میں آئے گا۔ جمہوری دور میں جنگ عظیم ثانی تک اسلام کے ساتھ بے حسی و بے اعتنائی کی جو پرورش کی گئی تھی اس کا ایک ذیلی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ شیعہ سنی کے باہمی مناقشات فروغ نہ پا سکے۔ آج کل شدت پسند سنیوں کی طرف سے ان دیرینہ اختلافات کو پھر سے تازہ اور مشتعل کیا جا رہا ہے۔ نابینا اشیک وسیل (Ashik Veysel) جو ترکی کا مشہور اور مقبول عام مطرب شاعر ہے، سیواس کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا علوی ہے۔ ۱۹۵۰ء میں اس کی نظموں کی اشاعت میں دھوکہ دہی سے اس کو ایک دیندار اور پابند صلوٰۃ مسلمان بتلایا گیا ہے، ترکی میں جن کی بالعموم پابندی شیعہ نہیں کیا کرتے۔ تاہم یہ عنوان غالباً اس لئے تراشا گیا تھا کہ عام توجہ کو اپنی جانب مبذول کرایا جائے۔ یہ اس بات کی مزید ایک علامت ہے کہ ہر معاملہ میں یہاں مذہب کا کس قدر خیال رکھا جاتا ہے۔

ترکی میں اسلام کی موجودہ صورتِ حال نہایت امید افزا ہے۔ کوئی اس بات کی پیش گوئی نہیں کر سکتا کہ اس کی ترقی کس نہج پر ہوگی۔ قدامت و رجعت پسندی کے اتنے آثار ظاہر ہو چکے ہیں، جن پر ہر دو سیاسی پارٹیوں کے قائدین نے علی الاعلان اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے۔ بعض لوگوں کو اس امر کا اندیشہ ہے کہ اتاترک کی اصلاحات اور لادینیت اور

انقلابیت کے اساسی اصولوں کو ان سے خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ گذشتہ تین سال کے دوران میں جمہوریت پسند ترکی کے کارناموں کی حفاظت و صیانت کی خاطر کئی ایک اعلانات جاری ہو چکے ہیں۔ ایک جدید سرگرم جماعت، جو خاص کر جامعات کے نوجوان اساتذہ اور متعلمین میں کام کر رہی ہے وہ دیورم اجاگی (Devrim Ocagi "انجمن تحفظ تصورات انقلاب") ہے۔ یہ جماعت اتاترک کے کارناموں اور تصورات کی تلقین کرنا چاہتی ہے، تاکہ کسی قسم کے انحراف کا اس مقبول عام معیار کے ذریعہ انسداد کیا جا سکے۔ ترکی کی تاریخ انقلاب سے واقفیت و آگہی کے لئے ایک مخصوص نصاب ترتیب دیا گیا ہے، جو اس وقت نافذ العمل ہے۔ نونہالان قوم کو واقف کرانے اور ان میں احساس قومیت پیدا کرنے کی یہ قابل ستائش اور مخلصانہ کوششیں ہیں۔ جامعہ استنبول کی ذی اثر انجمن اتحاد طلبار نے اس عام مسئلہ کو ان مساعی کے ساتھ اختیار کیا ہے کہ وہ ایسی چیز کی تلقین کرے جس کو وہ ایک معینہ نظریہ یا جماعتی راہِ عمل سمجھتی ہے۔ اس نے خیالات پر قابو اور اختیار کے خطروں سے بھی خبردار کیا ہے، جس سے نہ صرف ترکی دستور کی خلاف ورزی ہوتی ہے بلکہ اس سے نازی جرمنی اور اشتراکی روس کے یک خیال و ہم رنگ نمونوں سے بھی مطابقت پیدا ہوتی ہے۔

نظارت امور مذہبی کے وجود اور اس کی سرگرمیوں کے خلاف بھی عامۃ الناس کو شکایتیں ہیں۔ یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ کیوں چند مفتیوں اور اماموں کو مامور کیا گیا، یہ ایک ایسی مملکت کو زیب نہیں دیتا جو غیر مذہبی ہونے کے ساتھ ان کی نگرانی کرے اور ان خدمات کی تنخواہیں ادا کرے۔ اس سرکاری محکمہ نے ہندوستانی مسلمان محمد علی کی مشہور کتاب "مذہب اسلام" کے ترجمہ و اشاعت کی منظوری دی ہے اور ازہر یونیورسٹی کے ابتدائی مذہبی مضامین کی کتابوں کا ترکی میں ترجمہ بھی شائع کیا ہے۔ یہ سوال کیا گیا ہے کہ کیوں ایک محصول ادا کنندہ کی رقم سے ایسے کاموں کی اعانت کی جائے، بعض ترکی مصنفین نے یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ غیر مسلم ترکی باشندے مقابلتاً مسلمان اکثریت کے کہیں زیادہ مذہبی آزادی سے شاد کام ہیں۔ دوسری

جانب وزیر اعظم کو اس بات پر سرزنش کی گئی کہ اس نے یونانی بطریق اور یہودی ربی کے ساتھ تصویر کھنچوائی، مگر ایوب صابری صدر محکمہ امور مذہبی کے ساتھ ایسی یگانگت برتی نہیں گئی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے یہ طے کیا ہے کہ ترکی میں مسلمان اور عیسائی سیاحوں کے لئے جو قابلِ دید تاریخی آثار ہیں ان سے نفع اٹھانے اور غالباً اپنی بے تعصبی کا ثبوت دینے کے لئے اسٹامپ پر بی بی مریم کے روضہ کی تصویر اور بعض اسٹامپ پر ینی جامی (مسجد جدید) کا نقشہ پیش کیا گیا ہے، جو استنبول میں جسر غلاطہ کے جنوبی سرے پر واقع ہے۔

ہم اس سے قبل مجلۂ شعبۂ دینیات کا ذکر کر چکے ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں اس کی اولین اشاعت کے اداریہ کا عنوان "اسلامین علم جلی، (اسلام کا سوال وجواب نامہ) تھا، جس کا لکھنے والا پروفیسر ضیاء یوروقان (Ziya Yörükan) ہے اس کو شعبۂ دینیات میں تنہا پروفیسر ہونے کا بے مثال امتیاز حاصل ہے۔ اس سے قبل یہ سابقہ استنبول یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات میں درس وتعلیم کی خدمت انجام دے چکا ہے۔ ۱۹۵۳ء میں وزارت تعلیم نے اس مضمون کو شرح وبسط کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کرنے کی باقاعدہ منظوری دی تھی۔ اولاً اس کے ۲۵ ہزار نسخوں کی طباعت کا حکم دیا گیا۔ اگرچہ کہ مجھے شعبۂ دینیات سے تعلق رکھنے والے کئی ایک حضرات سے یہ معلوم ہوا کہ اس وقت ترکی کا کوئی سرکاری مذہب نہیں ہے، مگر پھر بھی اس جدید کتاب کی کم از کم حیثیت نیم سرکاری ضرور سمجھی جاسکتی ہے۔ مقام و وقت اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اس کے مشمولات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے، مگر سرسری طور پر اس بات کا حال خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے دیباچہ میں مصنف نے خدا کے لئے ترکی کا مخصوص لفظ تنری (Tanrı) استعمال کیا ہے، اور اصل متن میں ہر جگہ حسب دستور اللہ کا لفظ لایا گیا ہے۔ قرآن پر مبنی اور خالصاً مذہبی ہونے کے ساتھ یہ اپنے اسلوب اور طریق اظہار میں بے شبہ جدید اور ترکی رنگ لی ہوئی ہے۔

شعبۂ دینیات کا یہ رسالہ حکیمانہ، تنقیدی اور جدت پسند بھی ہے۔ اس کے پرچوں

کی مانگ بہت زیادہ ہے اور خوب لکھتا ہے۔ اب تک اس رسالہ میں، تنظیم فتوت کا مبداء و آغاز، اسلامی فنون و صنائع، قونیہ میں اسلامی نقش و نگار کے نادرۂ روزگار اثری اکتشافات، علم منطق، قدیم آل عثمان کی مذہبی تحریکات اور اسی قسم کے دیگر عنوانات پر مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ اس کی ایک دلچسپ خصوصیت خود اپنے اراکین کی تحقیقات پر ایک دوسرے کی بے لاگ تنقید ہے اس خصوص میں قابلِ ذکر وہ سلسلہ مضامین ہے جن میں ترکی کے قدیم بک تاشی درویش و ولی ساری سلتک (Sari saltik) کی تاریخ حیات کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ اس شعبہ کے اراکین اپنے جماعتی تعلقات میں باہم اختلاف رکھتے ہیں۔ سابق صدر پروفیسر سعوت کمال یتکن (Suut Kemal Yetkin) اور موجودہ برسرِ خدمت صدر محمد کراسان (Karasan) پارلیمان کے انتخاب کے لئے جمہوری اور عمومی جماعتوں کی طرف سے ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہو چکے ہیں۔ صدر کراسان نے نشست حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی اور اس وقت اپنے وطن ڈینزلی (Denizli) کے حلقۂ انتخاب کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ انھیں اس کے بعد اپنی علمی خدمت سے مستعفی ہونا پڑا۔ اور ارمئی کو بحیثیت صدر پروفیسر بیدی ضیا ایگی من (Bedi Ziya Egemen) ان کی جگہ مامور ہوئے۔ اس طرح پر شعبہ کا نقصان گویا پارلیمان کا نفع بن گیا۔ یہ ۱۹۵۴ء کے اعلیٰ قابلیت رکھنے والے منتخب شدہ اراکین کی بہت سی مثالوں میں سے ایک ہے۔

ترکی میں اس وقت اسلام سے متعلق جو تنقیدی انداز کارفرما ہے۔ یہ اس کے صحیح فکر و عمل کی ایک محسوس مثال ہے، اور ساتھ ہی اس کے ایک خوش آئند، حقیقت پسند، اور معقول میلان بھی پایا جاتا ہے، جو طمانیت بخش ہے۔ اس طرزِ فکر کا کھلا اقرار وزیر اعظم مندرس کی طرف سے بھی کیا گیا ہے جب کہ اس نے ۱۹۵۳ء میں علی الاعلان اس بات کا اظہار کیا تھا کہ، "اولاً ہم ترک ہیں اور ثانیاً مسلمان"، سرکاری حلقوں میں ہر جگہ ایسے آزاد خیال اور وسیع المشرب ترک پائے جاتے ہیں جو اعلیٰ تعلیم اور فہم و فراست کے ساتھ زیادہ دیندار نہیں ہیں، جس کا انھیں

اعتراف بھی ہے۔ بعض دوسرے ایسے ہیں جو پکے مذہبی اور انتہائی صوفی منش بھی ہیں، لیکن ان سب کے دلوں میں اسلام کا احترام ہے۔ جمہوریت نے بڑی کوششوں کے بعد دین و سیاست میں علیحدگی سے متعلق جو کامیابی حاصل کی ہے، اس کو یہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں، کیوں کہ یہ اس کو ترکی کی آئندہ صحت بخش نشو و ارتقا کے لئے نہایت اہم سمجھتے ہیں۔ ترکی کا یہ اصرار کہ پاکستان کے ساتھ جو ۲ر اپریل کو معاہدہ طے پایا ہے اس کو کسی نوع سے عالمگیر اسلامیت کے معنوں میں نہ سمجھا جاتے، بلکہ یہ ایک باہمی مدافعت اور مودت کا سیدھا سادہ عہد و پیمان ہے، جو جغرافی سیاسی حقائق پر مبنی ہے۔ خارجی معاملات میں ان کی طرز روش کی یہ ایک مثال ہے قدیم یوگوسلافی، یونانی، ترکی اتحاد اور وسیع تجارتی لین دین اور اسرائیل سے مناسب تعلقات اس حقیقت پسندانہ حکمت عملی کی دوسری مثالیں ہیں۔ بعض پاکستانی اور عرب قائدین نے اس معاہدہ کو ہمہ اسلامی (Pan-Islamic) یا ہمہ تازی (Pan-Arab) نظریہ کا رنگ دینا چاہا، مگر یہ سیاسی ہتھکنڈے معاملات کے سمجھنے میں تو غلط فہمی پیدا کر سکتے ہیں لیکن ترکی کی مستحکم حیثیت کو اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتے۔

دیہی باشندگانِ شہر و قصبات جو مختلف رجعت پسندانہ میلانات کی مذمت کیا کرتے ہیں، بسا اوقات اس امر پر بھی اپنے تاسف کا اظہار کرتے رہتے ہیں کہ وہ اور ان کی اولادیں اپنے گھروں میں مذہبی تعلیم اور دیندارانہ زندگی سے بے اعتنائی برتی۔ بہت سوں نے مجھ سے یہ کہا کہ ہم لوگ اور ہمارے اہل خاندان آج کل اپنے گھروں میں اسلامی تعلیم کا خاص خیال رکھتے ہیں، کیوں کہ ہم سب کی یہی خواہش ہے۔ اس بات کے لئے احتجاج کیا جارہا ہے کہ تعلیمی سال کا اختتام اور ماہ صیام چونکہ ایک ساتھ واقع ہوتے ہیں، اس لئے سرکاری اور خانگی مدارس کو عارضی طور پر بند یا امتحانات کی تاریخوں کو تبدیل کیا جائے تاکہ بلا کسی رکاوٹ کے روزوں کی پابندی کی جا سکے۔ تاہم قانون میں ایسے مذہبی رسوم جو اسکول کے اوقات سے متصادم ہوں اس قسم کے انتظامات کی کوئی گنجائش نہیں، اور بہت سے لوگ یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ قانون

کو اپنی حالت پر قایم رہنے دیا جائے۔

مواصنعات میں زرعی خوشحالی اور دیہی تنظیم نے قصباتی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے متعدد قصبات میں جہاں کوئی امام نہیں تھا، یا جہاں ایسے جاہل، متعصب اور کاہل الوجود اماموں کو مجبوراً اپنا پیشوا بنا لیا گیا تھا وہ اب اس قابل ہیں کہ اچھے تعلیم یافتہ اشخاص کو اس کام کے لئے زیادہ تنخواہ دے کر رکھ سکیں۔ باشندگان دیہات ان پاکبازانہ ریاکاریوں (Pious frauds) سے بخوبی باخبر ہیں جن کا وہ کسی وقت تختۂ مشق بنائے جاتے تھے، اب وہ ان سے اخلاص عمل کے طالب ہیں یا ان کی جگہ پر جدید تعلیم یافتہ اور زیادہ با اخلاص پیشوایان مذہبی کو مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ بہت سوں نے مجھ سے یہ کہا ہے کہ اسلام اب خوب پھلے پھولے گا، کیوں کہ اس وقت قوم کی معاشی حالت نسبتاً پہلے کے کسی قدر بہتر ہے اور ان کاموں پر خرچ کرنے کی ان کے پاس کافی گنجایش بھی ہے۔ اہل قصبات کی زیادہ تعداد عربی پڑھنا نہیں جانتی، لیکن جہاں کہیں مجھے ان میں سے کسی سے ملنے کا اتفاق ہوا، خواہ وہ امام ہو یا نہ ہو، ۱۹۲۳ء کے قبل کے مدرسوں کا یا خانگی طور پر تعلیم حاصل کیا ہوا پایا گیا۔ اگر مذہب کی طرف ان کا میلانِ خاطر ہو تو یہ دیہاتی مُلّا ہمیشہ بطور اظہارِ علم کے صحیح بخاری سے متعلق ڈینگیں مارتے اور اس پر قسمیں کھاتے رہتے ہیں۔ میرے ایک مصری دوست نے کہا ہے کہ ان کے وطن میں تمام اہلِ قصبات بخاری کی قسم کھایا کرتے ہیں، جس کی بابت ان میں سے اکثر کا علم محض سماعی ہے۔ اور جہاں تک قسم کا تعلق ہے وہ اس کو قرآن سے زیادہ مقدس سمجھتے ہیں۔ توہم پرستی کا دیہات میں خوب زور ہے اور کسی قدر شہروں میں بھی یہ چیز پائی جاتی ہے۔ لیکن تعلیم، شفاخانے اور حفظانِ صحت کے انتظامات، ریڈیو، عمدہ رسل و رسائل، اور ہر کام میں حقیقت پسندانہ اور ناقدانہ طریق عمل کے سبب خیالات میں انقلاب اور حالات میں تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔ یہ بات عورتوں کے مقابلہ میں زیادہ تر مردوں پر صادق آتی ہے، کیوں کہ ان کے پاس کافی وقت ہے اور وہ آزادی کے ساتھ ہر طرف گھوم سکتے ہیں۔

آخر میں، ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ جن توضیحات کو پیش کیا گیا ہے ان میں ترکی کے اندر اسلامی جذبہ پیدا ہونے کی کافی شہادت موجود ہے۔ ان میں سے بعض ایسے روایاتی اور رسمی ہیں، جن کو جدید الخیال ترک، جو جمہوری اصلاحات و ادارات کو عزیز رکھتے ہیں، رجعت پسندانہ قرار دیں گے جب درویشی نظامات نے شریعت کو دوبارہ بحال کرنے کے لئے ۱۹۳۰ء میں ہیجان برپا کیا تو ان کے سرغنوں کو سزائے موت دی گئی۔ جنوری ۱۹۵۴ء میں ملّی جماعت کے قائدین پر مقدمہ چلایا جا کر ان کی جماعت کو غیر آئینی قرار دیا گیا۔ ان کے خلاف الزام یہ تھا کہ یہ شریعت اور دیگر اسلامی طریقوں کو جو موجودہ ترکی کے آئین و دستور کے خلاف ہیں، ملک میں دوبارہ رواج دینا چاہتے ہیں۔ فروری میں ان میں کے کئی لوگ اپنے قدامت پرستی کے اصولوں میں کسی قدر کمی کے ساتھ ایک جمہوری قومی جماعت کی تنظیم کی۔ مئی کے انتخابات میں اس جدید و آزاد خیال جماعت نے پانچ نشستیں حاصل کیں، جو تمام کے تمام کرشہر (Kirsehir) کے ضلع سے منتخب ہوئے تھے، جو وسطی اناطولیہ میں بک تاشیوں کا مرکز مانا جاتا ہے۔ جب اس کا مقابلہ ۱۹۵۰ء میں ملّی جماعت کے صرف ایک نشست حاصل کرنے سے کیا جاتا ہے تو یہ ایک اچھی علامت سمجھی جاتی ہے، لیکن پالیسی پر اثر انداز ہونے کے لئے یہ تعداد مشکل کافی ہو سکتی ہے۔

بہت سے ترک دین و سیاست کے معاملہ میں راہ توسط و اعتدال کے خلوص دل سے حامی ہیں۔ سیاسی و مذہبی معاملات میں جو افراط و تفریط ہے ان کی بابت، اظہار کیا جا چکا تاہم ترکی حال ہی میں انتخابات کے نازک دور سے گذر چکی ہے، جو نہایت منصفانہ طریق پر عمل میں لایا گیا۔ قبل انتخاب عوامی جمہوری مخالف جماعت کا شور و پکار صرف اس لئے تھا کہ عمومی جماعت کی آئینی جدوجہد، مالی امداد، اور اس کی صحافتی تائید کو نقصان پہنچایا جائے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ مخالفت آئینی لحاظ سے کتنی ہی صحت پر مبنی ہو، بہت سی مخالف آوازوں کو ترکی کے سیاسی استحکام اور اسلام کے احترام کی خاطر باہم متحد کر دیا۔ باوجود چند خطرناک اندیشوں

کہ قوم نے عمومیت پسندوں کے حق میں اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔

۱۹۵۰ء میں، جب سے کہ عمومی جماعت کے لیڈروں نے اقتدار سنبھالا ہے اس معاملہ میں مذبذب سے نظر آتے ہیں کہ مقبول عام اسلام کے اس احیائے جدید کے ساتھ کیا طریق عمل اختیار کیا جائے خاص کر باشندگان دیہات میں جو رائے شماری میں ایک فیصلہ کن قوت رکھتے ہیں۔ ان کی انتہائی یک رنگ پالیسی یہ رہی ہے کہ مذہبی تعلیم کے لئے ایک واضح اور آزاد خیال لائحہ عمل کی تائید و حوصلہ افزائی کریں۔ ۱۹۵۲ء کے وسط سے اسلام کے ایسے اظہارات کی بابت، جو جمہوری قوانین اور معقول و سنجیدہ رائے کی توضیحات کے خلاف ہوں، تدریجی طور پر یک گونہ تشدد آمیز نظر آتی ہے۔ اس رجحان کی تائید تجارت پیشہ اور فوجی لیڈروں کی طرف سے کی گئی ہے، جنہوں نے رجعت پسند مسلمانوں کی اس رجعت قہقری پر اپنے تردد کا اظہار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حریف جماعتوں نے باوجود قدامت پرست اور رجعت پسند اسلامی جذبات کو ابھارنے کے ۲ مئی والے انتخابات میں کوئی نمایاں تائید حاصل نہ کر سکیں۔ ترکی کی عام خوشحالی پیدا کرنے والی اجتماعی تنظیم نے، باوجود اس کے کمزور پہلوؤں اور زر کے تو فیری دباؤ کے، بیرونی علاقوں میں اس کے نام کو چمکا دیا، اور رائے شماری میں عمومیت پسندوں کی بغلبہ آراء کامیابی نے اس کے لیڈروں کو اس تذبذب سے مخلصی بخشی، جو ان کو اسلامی رجحانات کو آئندہ قابو میں رکھنے کے لئے درپیش تھا، جن کو وہ رجعت پسند اور ضرر رساں سمجھتے تھے۔

سیاسی اصطلاح میں انتخابات کے نتائج یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ترک اسلام اور حکومت میں علیحدگی کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ اس مہم میں جو کامیابی حاصل کی گئی وہ مذہب سے کہیں زیادہ سیاسی و معاشی مسائل کے سبب سے تھی، کیا اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ترکی نے دو جماعتی طریق حکومت کا ایک معقول اور قابل عمل طریق کار معلوم کر لیا ہے یا ایک ایسا سوال ہے جو جداگانہ نوعیت رکھتا ہے۔ جنگ کے بعد سے ترکی سیاسی عمومیت نے بڑی ترقی کی ہے۔

اسلام کو اس سے کیا نفع حاصل ہو سکتا ہے؟ مذہب کے تعلق سے، یہ انتخابات ترکی جمہوریت کے استحکام کی ایک صحت بخش علامت ہیں۔ غیر مذہبیت کے اصول کو مضبوطی کے ساتھ برقرار رکھا گیا ہے، تاہم اسلامی بیداری کو منظم کیا جا رہا ہے۔ جیسا کہ پہلے بتلایا جا چکا، ۱۹۴۶ء کے بعد سے حقیقی مذہبی جذبات اور مذہبی تعلیم کی حوصلہ افزائی بعض اوقات سیاسی مسائل سے الجھتی رہی جس سے حقیقی روحانی اصلاح و ہدایت کو نقصان پہنچا۔ فی الحال اور غالباً ہر موقع پر، قدامت پرست اور رجعت پسند اسلام ترکی سیاسیات میں کبھی اس قابل نہ ہو سکا کہ قطعی طور پر خود کو منوا سکے۔ بہت سے ترک اس کو اسی طریق پر چلاتے ہیں۔ دین و سیاست میں یہ مطلقاً علیحدگی اپنی انتہا پر ایک زیادہ کامل عمومی حکومت کے ارتقاء کی حوصلہ افزائی کرے گی، اور غیر مذہبی ترکوں میں ایک نہایت عظیم روحانی ترقی کا موجب ہوگی اپنی جدید سیاسی اور معاشری زندگی کے تقاضوں کے پیش نظر اسلام کے ساتھ اس طریق عمل میں ترکی اپنی موجودہ تاریخ کے ایک نازک مسئلہ کو حل کر رہا ہے ایسا کرنے میں ممکن ہے کہ یہ دیگر اسلامی ممالک کی کوئی رہنمائی کر سکے، اور ایک ایسے جدید اور طاقتور اسلام کی تخلیق میں مدد دے، جو اس کے موجودہ عظیم ورثہ اور اس کے عالمی ثقافتی خدمات میں معتد بہ اضافہ کر سکے۔

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی — اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا — نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
میانِ شاخساراں صحبتِ مرغِ چمن کب تک — ترے بازو میں ہے پروازِ شاہینِ قہستانی
ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں — کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

حالاتِ حاضرہ

جنگ کا خطرہ۔ عرب ممالک کا سانحہ

از

(جناب اسرار احمد صاحب آزاد۔ ایڈیٹر جدوجہد)

جنگ کا خطرہ!

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے برسر اقتدار گروہ کی طرف سے دنیا کے آزاد ممالک کے داخلی معاملات میں جو ناجائز مداخلت کی جاتی رہتی ہے اس کی وجہ سے ایک مرتبہ پھر مشرق بعید میں جنگ کے شعلے بھڑک اٹھنے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جنرل چیانگ کائی۔شیک نے ارض چین میں شکست کھانے کے بعد وہاں سے فرار ہو کر جزیرہ فارموسا کو اپنی پناہ گاہ بنا لیا تھا۔ لیکن یہ جزیرہ ہمیشہ سے چین کے ساتھ وابستہ رہا ہے اور اگرچہ ۱۸۹۵ء میں چین اور جاپان کی جنگ کے بعد اس جزیرہ پر جاپان کا قبضہ ہو گیا تھا لیکن دوسری عالم گیر جنگ کے زمانہ میں امریکہ اور برطانیہ نے اعلان قاہرہ میں اس جزیرہ پر چین کے حق کو تسلیم کیا تھا اور اس بات کا یقین دلایا تھا کہ جنگ کے بعد اسے چین کے حوالہ کر دیا جائے گا اور پھر پوٹسڈیم کے معاہدہ میں اس یقین دہانی کی توثیق کی تھی لیکن فارموسا میں چیانگ کائی شیک کے قیام کے بعد انھوں نے اپنی اس یقین دہانی پر قائم رہنا ضروری نہیں سمجھا اور اس طرح آج اسی جزیرہ کی بدولت دنیا پھر جنگ کے خطرہ میں مبتلا ہو گئی ہے۔

یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ فارموسا سے متعلق جنرل چیانگ کائی شیک عوامی چین کا تنازعہ ایک داخلی تنازعہ ہے اور اسے بیرونی مداخلت کے بغیر ان دونوں ہی کو باہم طے کرنا چاہئے مگر اس حال میں چونکہ چیانگ کائی شیک کی شکست یقینی ہے اور اس کی شکست کے بعد فارموسا

ایسے اہم فوجی مستقر نیز معدنی اور زرعی اعتبار سے زرخیز مقام کے ساتھ امریکی ملوکیت پسندوں اور نوآبادیات خواہوں کا کوئی تعلق باقی نہیں رہ سکتا اس لئے وہ فارموسا سے چیانگ کائی۔شیک کے اخراج کو اپنا اخراج اور مشرق بعید سے اپنے اخراج کا پیش خیمہ تصور کرتے ہیں اور اس اہم جزیرہ پر چیانگ کائی۔شیک کے نام پر اپنے تسلط کو بحال رکھنے کے لئے کبھی تو ارض چین اور فارموسا کے باشندوں کو دو مختلف، قوموں کے افراد قرار دے کر عوامی چین کے دعویٰ کو باطل قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی اس جزیرہ کے ساتھ بین اقوامی مفادات کی وابستگی کا حوالہ دے کر اسے ایک بین اقوامی علاقہ قرار دینے کی تجویز پیش کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر فارموسا کے باشندے چینی قوم سے تعلق نہیں رکھتے تو یہ جزیرہ صدیوں تک چین کے ساتھ کس طرح وابستہ رہا ہے اور قاہرہ کے اعلان اور پوٹسڈیم میں اس کی توثیق کے وقت امریکی اور برطانوی مدبرین نے اس نکتہ کو کیوں نظر انداز کر دیا تھا؟ پھر اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر فارموسا کے ساتھ بین اقوامی مفادات کی وابستگی کی بنیاد پر اسے عوامی چین سے علیحدہ کر دینے کی دلیل کو تسلیم کر لیا جائے تو کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ جس ملک کے ساتھ بین اقوامی مفادات وابستہ ہو جائیں اسے بین اقوامی علاقہ قرار دے دیا جائے؟ اور اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا گیا تو کیا اس کی بدولت دنیا کے تمام ممالک کی آزادی اور سالمیت خطرہ میں نہیں پڑ جائے گی؟ مستعمرین مغرب کے پاس ان سوالات کا کوئی جواب موجود نہیں۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ امریکی سرمایہ پرست ایک مرتبہ پھر ارض چین پر قبضہ کر لینے کے خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ چیانگ کائی۔شیک کے توسط سے اپنے اس خواب کو حقیقت کی شکل میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور فارموسا کے تحفظ کے نام پر عوامی چین کے داخلی معاملات میں دخل دے کر عوامی چین کے خلاف جنگ برپا کر دینے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔لیکن آج ایشیا کے عوام سیاسی طور پر بیدار ہو چکے ہیں اور انھوں نے اس بات کا پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ کم از کم وہ اس خطہ ارض میں نوآبادیاتی نظام اور مغربی مستعمرین کی مداخلت کو جاری

نہ رہنے دیں گے اس لئے توقع تو یہ ہے کہ جنگ کے خلاف دنیا کے عوام کی جدوجہد کی بدولت اول تو فارموسا کے مسئلہ پر جنگ برپا ہی نہ ہو گی اور اگر جنگ برپا بھی ہوئی تو یہ جنگ مغربی استعمار، ملوکیت پسندی اور سرمایہ داری کی موت ثابت ہو گی۔

عرب ممالک کا حادثہ!

عراق اور ترکی کے مجوزہ عسکری معاہدہ کی بدولت عرب ممالک کے مابین جو کشیدگی پیدا ہو گئی ہے اسے تقسیم فلسطین کے بعد بجا طور پر عرب ممالک کا ایک عظیم حادثہ کہا جا سکتا ہے۔

فلسطین کی تقسیم کے بعد بظاہر عرب ممالک میں جو بیداری پیدا ہوئی تھی اس نے انھیں متحد بنا دیا تھا مگر اس حادثہ نے انھیں پھر منتشر کر دیا ہے اور اس حادثہ میں بھی وہی مغربی طاقتیں کارفرما ہیں جن کی بدولت تقسیم فلسطین کا حادثہ رونما ہوا تھا۔

اس بات کی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ مغربی سرمایہ دار عرب ممالک کی بعض خصوصیات کے پیش نظر انھیں اپنے قبضہ اور تسلط میں رکھنا چاہتے ہیں۔ مثلاً ایک طرف تو وہ عرب ممالک کی روغنی دولت پر قابض رہنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف وہ ان ممالک کی عسکری اہمیت سے فائدہ اٹھا کر سوویت یونین پر جارحانہ حملہ کرنے کے لئے انھیں اپنے فوجی مستقر کی حیثیت سے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک پہلی عالم گیر جنگ کے زمانہ ہی سے برطانیہ کے زیر اثر تھے لیکن دوسری عالم گیر جنگ کے بعد اس اثر و اقتدار میں امریکہ بھی حصہ دار ہو گیا تھا اور اس طرح آج ایشیا کے عرب ممالک کی تمام تر روشنی دولت اور اقتصادیات پر مغربی مستعمرین کا قبضہ ہے۔ لیکن اس وقت تک مغربی سرمایہ دار اپنے دوسرے مقصد کے حصول میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے اور عرب رہنماؤں نے، مصر کی زیر قیادت یہ کہہ کر ان کے عسکری منصوبوں کو مسترد کر دیا تھا کہ وہ مغرب کی کسی فوجی تنظیم میں شامل نہیں ہونا چاہتے لیکن مغربی جنگ بازوں اور سرمایہ داروں نے ترکی کے ذریعہ سے ان کی فوجی تنظیم کی تحریک کر کے ان کے اس اعتراض کو رد کر دیا اور اب اس معاملہ میں عرب ریاستیں دو گروہوں میں منقسم ہو گئی ہیں۔

عرب ریاستوں کی موجودہ صورت حال وضاحت کی محتاج ہے لیکن قلت گنجائش کے باعث یہاں وضاحت ممکن نہیں ہو سکتی۔ لیکن صرف اس قدر سمجھ لیجئے کہ اس افتراق سے نہ صرف عرب ممالک کے ظاہری اتحاد ہی پر ایک کاری ضرب لگی ہے بلکہ شمالی افریقہ کے عرب ممالک کی قومی تحریک کو بھی صدمہ پہنچنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ اور اسی ایک واقعہ سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کے سرمایہ دار اور جنگ باز حلقے مسلمانوں کی دوستی کے پردہ میں ان کو کتنے شدید نقصانات پہنچا رہے ہیں۔

ادبیات

غزل

از

(جناب الم مظفر نگری)

بڑھ گئی آسانی مشکل سے مشکل اور بھی
ہو رہا ہے مضطرب بعدِ سکوں دل اور بھی

پردۂ ہر جلوہ میں چھپ چھپ کے تم ہو جلوہ گر
بڑھ گیا اس سے نزاعِ حق و باطل اور بھی

زندگی میں ہمتِ دل نے سنبھالا ہے مجھے
یوں تو اس طوفاں میں تھے ہونے کو ساحل اور بھی

کچھ خبر بھی ہے تجھے غارت گرِ دنیائے دل
خاکِ دل سے وقت پر بن جائیں گے دل اور بھی

انتشارِ گردِ صحرا سے یہ ثابت ہے کہیں
منعقد ہونے کو ہے ذروں کی محفل اور بھی

جب کوئی آتا ہے صدرِ محشر بدامن انقلاب
خود سنور جاتی ہے یہ دنیا کی محفل اور بھی

قید میں لازم نہ تھی یوں مشقِ پیغامِ جنوں
ہو گئے نالے ہم آہنگِ سلاسل اور بھی

باطنِ ہر ذرہ میں جذب ہے احساسِ نمو
ہمت افزا ہے شکستِ رنگِ محفل اور بھی

اے جزاک اللہ ساقی تیرے فیضِ عام سے
اب نکھرتا جا رہا ہے رنگِ محفل اور بھی

کر سکے جو دل کی تجویزِ وفا پر تبصرہ
چاہیے ایسا شریکِ رازِ محفل اور بھی

ڈوبتا ہے ڈوبنے دو صبح کا تارا الم
دل تو ہے اک رہنمائے صبحِ منزل اور بھی

کبھی کبھی!

از

(سعید احمد اکبرآبادی)

ہو ہی نہ سکے جس کی محاکات کبھی بھی
ممکن نہیں اس غم کی مکافات کبھی بھی

کیا کوئی سمجھتا دلِ پُرشوق کی باتیں
ہم خود ہی نہ سمجھے وہ اشارات کبھی بھی

وہ گوشِ توجہ سے اگر سنتے بھی تو کیا
کھل کر نہ کہی شوق نے اک بات کبھی بھی

منظور تھی ہر لمحہ جنہیں دل کی رعایت
سنتے نہیں اب دل کی کوئی بات کبھی بھی

اے خندہ زنِ بےکسیٔ اہلِ وفا سن!
دیکھی نہیں آہوں کی کرامات کبھی بھی؟

ہر تارِ نفس بستۂ یک تارِ قفس ہے
آئی ہی نہیں مرگِ مفاجات کبھی بھی

بیگانہ وشی سی کوئی بیگانہ وشی ہے
گویا کہ نہ تھی ان سے ملاقات کبھی بھی

کشتِ دلِ محزوں میں بھی آجائیں بہاریں
ایسی بھی تو برسے کوئی برسات کبھی بھی

کیا قہر ہے اے یاس کہ اب دستِ تمنا
اٹھتے بھی نہیں بہرِ مناجات کبھی بھی!

وہ برہمیٔ ناز کہ سو لطف تصدق
ملتی ہے کہاں حسن کی سوغات کبھی بھی!

اُس مہرِ درخشاں کا زہے فیضِ تصور
کاشانہ میں میرے نہ ہوئی رات کبھی بھی!

تبصرے

قاموس القرآن از مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی۔ تقطیع متوسط ضخامت ۸۰۰ آٹھ سو صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد آٹھ روپیہ پتہ :۔ مکتبۂ علمیہ قاضی منزل میرٹھ۔

قرآنِ مجید کے لغات پر اردو میں اب تک متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سب سے زیادہ مبسوط۔ محققانہ اور معلومات آفریں وہ کتاب ہے جس کی جلد بجلد اشاعت کا سلسلہ ندوۃ المصنفین دہلی کی طرف سے اب تک جاری ہے۔ لیکن یہ کتاب اول تو اب تک تمام نہیں ہوئی۔ پھر کئی جلدوں میں ہے اور مبسوط ہے اس لئے ہر متوسط درجہ کی حیثیت کا شخص اس سے مستفید نہیں ہو سکتا اسی ضرورت کے پیشِ نظر مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی نے جو اپنی سنجیدہ اور مفید تصنیفات وتالیفات کی وجہ سے کافی متعارف ہیں۔ زیرِ تبصرہ لغت ترتیب دیا ہے۔ اس میں قرآنِ مجید کے الفاظ کو اصل لغت قرار دے کر حروف تہجی کی ترتیب سے انھیں درج کرنے کے بعد پہلے اُن کے معنی لکھے گئے ہیں جو قرآن میں مُراد ہیں اس کے بعد الفاظ کی صرفی نحوی تشریح مختصراً کی گئی ہے۔ یعنی لفظ اگر فعل ہے تو اس کا مصدر اور صیغہ اگر اسم ہے تو واحد کی جمع اور جمع کا واحد بتایا ہے۔ علاوہ بریں جگہ جگہ مستند کتابوں کے حوالہ سے قرآن مجید کے بیان کردہ اسماء واعلام یا قصص و واقعات پر مفید نوٹ بھی ہیں، زبان آسان اور عام فہم۔ اندازِ بیان دل نشین اور سنجیدہ ہے۔ جو حضرات عربی سے واقف نہیں ہیں یا انھوں نے صرف عربی زبان پڑھی ہے لیکن علوم قرآن سے آشنا نہیں ان کے لئے یہ کتاب بڑی مفید ہوگی اور اگر کوئی صاحب چاہیں تو عربی صرف و نحو کی ابتدائی دو تین کتابیں پڑھنے کے بعد اس لغت کی مدد سے خود عربی زبان بھی سیکھ سکتے

ہیں، اس طرح اس بے بیک کرشمہ دوکار کا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے!!

قرآن اور پیغمبر: از مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی۔ تقطیع خورد ضخامت ۴۸ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۵ / پتہ :۔ مکتبہ جماعت اسلامی ہند رام پور (یوپی)

اس مختصر رسالہ میں بعض دوسرے مذاہب کی الہامی کتابوں سے مقابلہ وموازنہ کرکے یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید کی رو سے ایک پیغمبر کا صحیح تصور کیا ہے اور وہ کیوں کہ ہمارے لئے اسوہ حسنہ بن سکتا ہے۔ دوسرے مذاہب میں پیغمبر کا جو تصور پیش کیا گیا ہے اُس کی رو سے پیغمبر ایک غیر انسانی مخلوق ہوتا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ انسانوں کے لئے وہ نمونہ عمل نہیں بن سکتا۔ رسالہ مفید اور لائق مطالعہ ہے!

ہادیٔ اعظم تقطیع خورد ضخامت ۴۸ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۵/ پتہ :۔ جماعت اسلامی ہند رام پور نے بچوں کے لئے مختلف عنوانات ومباحث پر کتابیں شائع کرنے کا جو پروگرام بنایا ہے یہ رسالہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں جناب ابو خالد صاحب ام۔ اے، آسان اور دلچسپ طرز بیان میں بچوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی تا واقعۂ ہجرت سنائے ہیں جن کو پڑھ کر اور سن کر نبیکی کی عظمت اور اس کی طرف میلان پیدا ہوتا ہے۔ بچوں اور بچیوں کے نصاب میں اس کو شامل کرنا مفید ہوگا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام از جناب ابو سلیم محمد عبد الحیٔ صاحب تقطیع خورد ضخامت ۱۶۸ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت عمر روپیہ پتہ :۔ مکتبۂ الحسنات رام پور۔

یہ کتاب "نبیوں کے حالات" کا چوتھا حصہ ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات جو قرآن مجید یا عہد نامہ جدید وقدیم میں مذکور ہیں۔ حضرت موسیٰ کی پیدائش اور اس زمانہ میں بنو اسرائیل کی حالت سے لے کر حضرت کے ایک وعظ تک بیان کئے گئے ہیں زبان آسان اور عام فہم ہے۔ لائق مرتب نے یہ حالات وواقعات اس طرح بیان کئے ہیں کہ

پڑھنے اور سننے والوں کے دل پر خود بخود پیغمبر اور اس کے کام کی عظمت کا نقش بیٹھ جاتا ہے اور ایسے محسوس ہوتا ہے کہ کسی سوسائٹی میں انقلاب پیدا کرنے کا یہ پیغمبرانہ طریقہ کتنا کامیاب اور موثر ہوتا ہے۔ بچوں کے علاوہ عام اردو خواں حضرات کے لئے بھی یہ سلسلہ بہت مفید ہے۔

ہماری دنیا حصہ سوم | از جناب افضل حسین صاحب ام۔اے۔ال۔ٹی تقطیع خورد ضخامت ۱۷۶ صفحات کتابت وطباعت بہتر۔ قیمت ۱۲/ پتہ:۔ مکتبہ جماعت اسلامی ہند رام پور۔

یہ کتاب بھی اسی سلسلۂ نصاب کی کڑی ہے جو جماعت اسلامی ہند تیار کر رہی ہے اس میں جغرافیہ طبعی کے اصول موضوعہ پر گفتگو کرنے کے بعد ہندوستان۔ پاکستان۔ لنکا۔ عرب۔ امریکہ اور ریڈ انڈین کے طبعی جغرافیہ اور اس کے متعلقات یعنی آب و ہوا۔ پیداوار۔ مذاہب اور زبانیں۔ ذرائع آمد و رفت۔ آبادی۔ پیشے۔ صنعت و حرفت۔ وغیرہ مباحث پر گفتگو کی گئی ہے، کتاب کی ترتیب اور اس کی زبان آج کل کے مسلمہ اصول تعلیم کے مطابق ہے۔ یہ کتاب پانچویں اور چھٹی کلاس کے طلبار کے لئے بہت موزوں اور مناسب ہے۔

آسان ریاضی حصہ سوم | از جناب شوکت علی صاحب بی۔اے۔ال۔ٹی صفحات ۱۴۴ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲/

یہ کتاب بھی جماعت اسلامی کے اسی سلسلۂ نصاب کی کڑی ہے۔ اس میں جمع و تفریق اور ضرب و تقسیم مرکب سے لے کر کسور اعشاریہ تک حساب اور پھر علم ہندسہ کی ابتدائی چند باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ترتیب اور طریق تفہیم ایسا ہے کہ حساب کی خشکی بچوں کے لئے اس کے حصول میں مانع نہیں ہوتی اور وہ باتوں باتوں میں اس خشک مضمون سے مانوس ہو جاتے ہیں جماعت اسلامی ہند رام پور کی طرف سے اب تک نصاب کے سلسلہ میں جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان میں بچوں کی تعلیم کے لئے یہ جماعت بڑا مفید اور نفع بخش کام کر رہی ہے جن اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم اردو ہے وہ بلا تکلف ان کتابوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

بُرہان

جلد ۳۴ شمارہ ۳

مارچ ۱۹۵۵ء مطابق رجب المرجب ۱۳۷۴ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

گذشتہ ماہ جنوری میں بمبئی میں دینی تعلیمی کنونشن ہوئی اور فروری میں جمعیۃ علمائے ہند کا اٹھارہواں سالانہ جلسہ کلکتہ میں منعقد ہوا۔ اس ماہ فروری کو خاص طور پر قومی اور ملی اداروں کے جلسوں اور کانفرنسوں کا مہینہ کہنا چاہئے۔ کیونکہ جمعیۃ علمائے ہند کی کل ہند کانفرنس کے علاوہ مدراس میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔ اور انجمن ترقی اردو کی آل انڈیا کانفرنس، برار میں صوبہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔ بستی (یوپی) میں صوبہ انجمن ترقی اردو کانفرنس بھی چند روز کے آگے پیچھے سے اسی مہینہ میں منعقد ہوئیں، ان سب کانفرنسوں میں جو تقریریں ہوئیں، جو تجاویز منظور کی گئیں، جو خطبات پڑھے گئے اور ان میں جس جوش و خروش کے ساتھ لوگوں نے شرکت کی اور حصہ لیا وہ ہمارے مستقبل کے لئے فالِ نیک ہے ان کانفرنسوں کی مجموعی طور پر یہ خصوصیت بہت زیادہ مسرت اور اطمینان کا باعث ہے کہ ان کی کارروائیوں میں دل شکستگی، ہزیمت خوردگی اور مایوسی و احساسِ کمتری کا کہیں نام و نشان نہیں ہے بلکہ ان میں ایک عزم ہے خود اعتمادی اور ولولہ ہے۔ اپنی تعمیرِ نو کے لئے ہمت و حوصلہ ہے۔ اور بگڑے ہوئے کاموں کو از سرِ نو سنوارنے اور سدھارنے کا ایک بے چین و مضطرب جذبہ اور امنگ ہے۔ یہ سب اس بات کی اچھی علامت اور نشانی ہے کہ ملک کی ہمہ جہتی ترقی کے ساتھ ساتھ اب مسلمانوں کا وہ دورِ گمشدگی و حیرانی جو تقسیم کے طبعی نتیجہ کے طور پر ان پر طاری ہو گیا تھا وہ توقع اور اندازہ کے برخلاف بہت جلد ختم ہو گیا ہے اور وہ اپنی حیاتِ قومی و ملی کے چاک در چاک جیب و دامان کی سوزن کاری و رفوگری کے ارادہ سے پھر ایک نئی اُمنگ اور ولولہ کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

جہاں تک ہمت، جوش اور حوادث و آفات میں بھی ثابت قدم رہنے کا تعلق ہے۔ مسلمانوں میں ایسے افراد کی کمی نہیں ہے جو ان اوصاف سے متصف ہوں۔ لیکن تعمیر و

ترقی کے اس مرحلہ پر جوش سے زیادہ ہوش کی اور بہادری سے زیادہ ٹھنڈے دماغ کے ساتھ ٹھوس اور تعمیری کاموں کو انجام دینے کی ضرورت ہے اور افسوس ہے کہ مسلمانوں میں ایسے ہی افراد کی کمی ہے، آج ہمارے کتنے تعلیمی، اقتصادی، سماجی اور مذہبی مسائل و معاملات ہیں جو ایک عمدہ تنظیم اور جماعتی اتحاد و اتفاق کے ساتھ خاموشی اور استقلال سے کام کرنے کے مقتضی ہیں اور محض بزم آرائی اور کانفرنسوں میں چند تجاویز پاس کر دینے سے اُن کا حل دستیاب نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر صرف ایک دینی تعلیم کے مسئلہ کو لیجئے بمبئی کی کنونشن نے اس مقصد کے لئے ایک مرکزی بورڈ تو بنا دیا ہے لیکن اس بورڈ کو پورے ملک میں دینی مکاتب قایم کرنے کے لئے کتنا روپیہ درکار ہوگا۔ کتنے مخلص اور لایق کارکن درکار ہوں گے۔ اور ان سب مکاتب کی نگرانی کے لئے بورڈ کو جگہ جگہ کتنے ادارے قایم کرتے ہوں گے۔ جب ان سب چیزوں کا تصور کیا جاتا ہے تو اس منصوبہ کی تکمیل جوئے شیر لانے سے کم مشکل نظر نہیں آتی لیکن عوام اور خواص دونوں میں اس مسئلہ کی اہمیت کا صحیح احساس پیدا ہو جائے تو اس کی تکمیل کچھ مشکل بھی نہیں ہے۔ بہر حال مستقبل ہی یہ فیصلہ کرے گا کہ ہم نے آج اپنے قومی پلیٹ فارم پر جن کاموں کی انجام دہی کا عہد و پیمان کیا ہے انھیں ہم کہاں تک پورا کر سکے ہیں۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ حکومت ہند کی لاکھوں روپیہ کی فیاضانہ امداد و اعانت سے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں اسلامی تحقیقات اور ہندوستان کی تاریخ قرون وسطیٰ کی تحقیقات کے لئے دو مستقل شعبے قایم ہو گئے ہیں۔ پہلے شعبہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عبدالعلیم صدر شعبہ عربی اور دوسرے کے پروفیسر شیخ عبدالرشید مقرر ہوئے ہیں۔ دونوں شعبوں نے اپنا کام سرگرمی کے ساتھ شروع کر دیا ہے۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ ان دونوں شعبوں کے لئے کام کے پروگرام اور اس کی ترتیب کی شکل کیا ہے لیکن یہ حقیقت غالباً مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے ذمہ دار اصحاب پر پوشیدہ نہ ہوگی کہ تاریخ ہند اور اسلامیات دونوں ایسے موضوع ہیں جن پر اگرچہ اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن اب بھی ایک بہت بڑا میدان ہے جو خالی پڑا ہوا ہے اسے صحیح نقطۂ نظر

اور تحقیق و بصیرت کے ساتھ لکھنے کی ضرورت ہے۔ تاریخ کو صرف واقعات کی کھتونی نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ اسے یہ بھی بتانا چاہئے کہ جو واقعات پیش آئے ان کے اقتصادی، سماجی، سیاسی اور مذہبی اسباب و عوامل کیا تھے! ان واقعات نے اس زمانہ میں مجموعی حیثیت سے ملک کی تہذیب و تمدن اور اس کے عام اقتصادی اور ثقافتی حالات پر کیا اثر ڈالا، انھوں نے ملک کو اونچا کیا یا نیچا اور یہ سب کچھ کسی ایک مخصوص نظام فکر کا نتیجہ تھا یا محض بخت و اتفاق تھا جو ظہور میں آگیا۔ اگر تاریخ اس نقطۂ نظر کے ساتھ مرتب کی گئی تو وہ صرف ایک فن کی خدمت نہیں ہوگی۔ بلکہ ملک کی بھی بڑی خدمت ہوگی اور اس کے ذریعہ ان لوگوں کو اپنی رائے پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوگی جو کہتے ہیں کہ ہندوستان ڈیڑھ سو دو سو سال نہیں بلکہ ایک ہزار سال بعد آزاد ہوا ہے۔

اسلامی تحقیقات کے سلسلہ میں سب سے بڑی اور اہم ضرورت ان تین عنوانوں پر کام کرنے کی ہے (۱) تاریخ اسلام۔ (۲) فلسفۂ اسلام۔ (۳) اور اسلامی دینیات، کتنے افسوس کی بات ہے کہ یونیورسٹیوں میں مذکورۂ بالا تین مضامین کے جو پرچے ہوتے ہیں ان کی تیاری کے لئے ہمارے نوجوان طلبار، طالبات اور اساتذہ سب اُن کتابوں پر اعتماد کرنے کے لئے مجبور ہیں جو یورپ اور امریکہ میں لکھی گئی ہیں۔ مستشرقین یورپ کا علمی ذوق۔ محنت و جستجو۔ ترتیبِ مواد اور تصنیف و تحقیق کی صلاحیت و استعداد سب مسلّم! لیکن اُن کا نقطۂ نظر چونکہ اسلامی نہیں ہوتا اور وہ اسلامی احکام و مسائل کی اصل اسپرٹ سے براہِ راست واقف نہیں ہوتے اس بناء پر ان کی تحقیق کے جو نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں وہ بسا اوقات صحیح نہیں ہوتے اور ان سے طرح طرح کی غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پیدا ہو جاتی ہیں اس بنا پر سخت ضرورت ہے کہ صحیح الخیال محقق مسلمان اسلامی تاریخ و فلسفہ اور اسلامی دینیات پر خود انگریزی میں کتابیں لکھیں تاکہ تصویر کا صحیح رُخ سامنے آسکے۔ یہ کام ظاہر ہے کہ ایک دو سال کا نہیں برسوں کا ہے اور ایک دو آدمیوں کے کرنے کا نہیں۔ بلکہ پوری ایک جماعت یا بورڈ کے کرنے کا ہے اور کچھ ضمنی طور پر کرنے کا نہیں بلکہ مستقل طور پر ایک اصلی اور بنیادی حیثیت سے انجام دینے کا ہے اگر مسلم یونیورسٹی کا شعبۂ تحقیقاتِ اسلامی یہ کر سکا تو بے شک علم و فن کی ہی نہیں بلکہ عالمِ انسانیت کی وہ ایک بہت بڑی خدمت انجام دے گا اور اس کو کہنے کا حق ہوگا کہ

شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم!

یہ چند سطریں صرف توجہ دلانے کی غرض سے لکھی گئی ہیں۔ ورنہ مسلم یونیورسٹی کے بیدار مغز اور وسیع النظر وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب اور ان کے لائق و فاضل رفقائے کار سے خود یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی!۔

ابوعلی ابن سینا بحیثیت ایک فارسی ادیب اور شاعر

از

(جناب سید نجیب حسین صاحب ایم۔ اے ریسرچ اسکالر الہ آباد یونیورسٹی)

نام ونسب شیخ الرئیس[1] ابوعلی الحسین بن عبداللہ بن الحسن بن علی بن سینا[2] نام حسین، ابوعلی کنیت، شیخ الرئیس لقب، دیگر القاب حجۃ الحق[3]، الحکیم الوزیر[4]، الدستور[5]،

دورِ اسلامی کے مقدم حکماء واطباء اور متفکرین اور دانشمندوں میں اس کا شمار ہے، شیخ کے حالاتِ زندگی اس کے شاگرد ابوعبید جوزجانی نے بتفصیل ایک رسالہ میں تحریر کئے ہیں، اور دنیا کی دوسری زبانوں میں تذکرہ نویسوں نے شیخ کے سوانح حیات میں جو کچھ تحریر کیا ہے ان کا ماخذ یہی رسالہ ہے، اس کا متن عیون الانباء ابن ابی اصیبعہ میں اور اس کا خلاصہ اخبار الحکماء قفطی میں ہے، صوان الحکمۃ بیہقی میں بھی اس کا خلاصہ درج ہے۔

شیخ کا باپ عبداللہ بلخ کا رہنے والا دولت سامانی کی سلک ملازمت میں تھا، امیر نوح بن منصور کے عہد میں بخارا چلا آیا، اور ایک گاؤں خرمثین یا خرمیثن میں سرکاری خدمات بجالانے لگا، مضافات بخارا اور بخارا کی زبان فارسی دری تھی، ابن حوقل کا بیان ہے کہ "اہل بخارا کی زبان سغد کے لوگوں جیسی ہے، کلمات میں تھوڑا سا اختلاف اور تحریف پائی جاتی ہے" سامانیوں

---

[1] عیون الانباء فی طبقات الاطباء ابن ابی اصیبعہ ج ۲ ص ۲، مطبوعہ مصر ۱۲۹۹ھ، وفیات الاعیان میں "لقب الرئیس" آیا ہے، اصل میں شیخ الرئیس دو القاب سے مرکب ہے، پہلا "الشیخ" لقب علمی ہے، دوسرا "الرئیس" لقب سیاسی ہے، اور منصبِ وزارت کے پانے کے بعد مشہور ہوا لیکن دونوں لقب ایک کلمۂ مرکب کے طور پر سمجھے جاتے ہیں،

[2] یہ سلسلہ نسب مشہور مکمل اور صحیح ترین ہے جس سے ابوعلی سینا مشہور ہے۔ (طبقات الاطباء ج ۲ ص ۲) لیکن عام طور پر اس کے نسب کو اختصار کے ساتھ حسین بن عبداللہ بن سینا ہی لکھتے ہیں۔ [3] چہار مقالہ نظامی عروضی مطبوعہ لیڈن ۱۳۲۷ھ ص ۶۸، [4] تتمہ صوان الحکمۃ ص ۳۸، درۃ الاخبار ص ۲۹ ۔ [5] درۃ الاخبار ص ۲۹،

کے عہدِ حکومت میں بخارا و ماوراء النہر کے دوسرے شہر فارسی دری کے شعر و ادب کے لحاظ سے بڑے زبردست مراکز رہے ہیں، آل افراسیاب اور خوارزمشاہان[1] آل اتسز کی تمام مدت حکومت میں فارسی شعر و ادب کے لحاظ سے ان مراکز کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔

سال ولادت | خرمیثن کے قرب و جوار میں ایک گاؤں افشنہ تھا، عبداللہ نے اسی گاؤں کی ایک عورت سے جس کا نام ستارہ تھا، شادی کرلی، اس سے ماہ صفر ۳۷۰ھ میں ایک لڑکا پیدا ہوا، اس بچہ کا نام باپ نے حسین رکھا، شیخ الرئیس کا ایک اور بھائی محمود اس کی ولادت کے پانچ سال کے بعد پیدا ہوا۔

کسب علوم | محمود کی ولادت کے بعد عبداللہ اپنے اہل و عیال کو لے کر بخارا میں چلا آیا، یہاں پہنچ کر شیخ کی تعلیم و تربیت کی بنیاد پڑی، دس سال کی عمر میں قرآن مجید اور کئی ایک علوم ازبر کرلئے، شیخ کی ذہانت اعلیٰ پایہ کی تھی، لوگ اس کی فہم و فراست پر حیران رہ جاتے تھے۔

اس زمانے میں خلفائے فاطمی مصر کی طرف سے اسماعیلی داعیوں کی تبلیغ بڑے پیمانہ پر جاری تھی، یہ داعی مسلمانوں کو امامت محمد بن اسمٰعیل بن جعفر صادقؓ کی دعوت دینے پر مامور تھے، ایران کے مرکزی اور مشرقی نواح میں ان کا بہت چرچا تھا، ایرانی لوگ یہاں تک کہ طبقہ امراء و وزراء، فلاسفہ اور ادباء وغیرہ نے اس مذہب کی پیروی اختیار کرلی، شیخ کے باپ اور بڑے بھائی (جو پہلی ماں سے تھا) علی بھی اسماعیلی مذہب کی تبلیغ سے متاثر ہوکر اس جماعت میں داخل ہوگئے، اس فرقہ سے نفس اور عقل کا ذکر باپ بیٹوں کی زبانی ابو علی

---

[1] خوارزم شاہان آل مامون یا مامونی | خوارزم شاہان کا یہ سلسلہ آل عراق کے دور تسلط میں خوارزم اور کچھ عرصہ گرگانج پر حکومت کرتا تھا، ان میں سے ایک مامون بن محمد نے ۳۸۵ھ میں ابو عبداللہ محمد خوارزم شاہ کو جو آل عراق سے تھا، قتل کردیا، اور اس کے ممالک کو اپنے تصرف میں لے آیا اور خوارزمشاہ ہوگیا، اس کے مرنے کے بعد ۳۸۷ھ میں علی بن مامون بن محمد نے سلطنت پائی، اس کے بعد خوارزم شاہی حکومت ابوالعباس مامون بن مامون بن محمد کو ملی ۴۰۷ھ میں وہ قتل ہوگیا، اس کی جگہ محمد بن علی بن مامون بن محمد کو ملی لیکن ۴۰۸ھ میں سلطان محمود نے اسے قید کرلیا (چہار مقالہ ص ۲۴۱ - ۲۴۴)

(شیخ الرئیس) کے گوش گذار ہوتا رہتا تھا، لیکن شیخ کا قول ہے کہ "میں ان کے مذاکرات سنتا تھا لیکن مجھے ان پر یقین نہ آتا تھا، اس حالت میں انھوں نے مجھ پر ڈورے ڈالے اور دعوت دی اور اثنائے گفتگو میں فلسفہ، ہندسہ اور حساب کا ذکر بھی لاتے تھے،" اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیخ الرئیس نے اسماعیلی عقاید کو کبھی اختیار نہیں کیا۔

ایک سبزی فروش جس کا نام محمود مساح تھا اور حساب ہندسہ اور جبر و مقابلہ سے بھی واقف تھا شیخ کے والد نے ابو علی کو اس کے سپرد کیا، اسی کے ساتھ ساتھ شیخ فقہ کی تعلیم ایک بزرگ اسمٰعیل الزاہد کے پاس جاکر حاصل کرتا تھا، ان کے مطالب پر غور کرتا اور خلاف مسئلوں پر استاد سے مناظرہ کرتا تھا۔

اسی اثناء میں ابوعبداللہ ناتلی فیلسوف شاگرد ابوالفرج بن الطیب (جو چوتھی صدی ہجری کے اواخر کے مشہور ترین فلسفیوں میں سے تھے) بخارا آگئے، عبداللہ نے انھیں اپنے گھر میں مہمان کیا، غرض یہ تھی کہ ابو علی ان سے اصولِ فلسفہ سیکھے، شیخ نے ان سے کتاب "ایساغوجی" (فوریوس)، کی شروع کی، اس کتاب کے مسائل پر اس نے بڑی تحقیق کی اور ان کو اس خوبی سے حل کرتا تھا کہ استاد سن کر باغ باغ ہو جاتا تھا، منطق کی ابتدائی کتابوں کو پڑھنے کے بعد از خود مشکل اور ادق کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا، اور ان کی تشریح ساتھ ساتھ کرتا جاتا تھا، کتاب اقلیدس کی پانچ چھ شکلیں استاد کی مدد سے حل کیں، مجسطی کی کتاب اشکال ہندسہ تک استاد سے پڑھی، عبداللہ ناتلی نے بقیہ کتاب اسے پڑھنے اور حل کرنے کی اجازت دے دی ان کتابوں کو جس قدر سمجھ سکا، استاد کے سامنے دہرائیں، ان میں سے بعض اشکال ایسی تھیں کہ خود عبداللہ الناتلی انھیں سمجھ نہ سکتے تھے، شیخ نے جب ان کو حل کر کے سمجھایا تو ناتلی کی سمجھ میں آئیں، عبداللہ ناتلی جب ابو علی کی تعلیم سے فارغ ہوا تو گرگانج کی راہ لی، اب شیخ نے خود ہی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، علوم طبیعی اور الہیات کے متن اور شرحوں کو بڑے غور سے پڑھا حتیٰ کہ اس پر علم کے دروازے کھل گئے، اس کے بعد شیخ کو علم طب کا شوق دامن گیر

ہوا زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ اس فن میں بھی وہ یکتائے روزگار ہوگیا، اس کے نام کی شہرت اطراف و نواح میں پھیل گئی، نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بڑے بڑے فاضل اطبا اس کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرنے لگے دور دور سے پیچیدہ امراض کے مریض اس کے پاس آنے لگے، اس زمانے میں بھی وہ علم فقہ کے مطالعہ میں سرگرم رہا، اور اسمٰعیل زاہد کی خدمت میں حاضر ہوکر فیض یاب ہوتا رہا۔

× شانزدہ یعنی سولہ سال

جب شیخ کا سن پندرہ سال کا ہوا تو اس نے اپنے تحصیل کردہ علوم پر نظر ثانی کی جس سے اس کے معلومات و محفوظات میں نظم و ترتیب پیدا ہوگئی، شیخ کی عمر ہی کیا تھی، اس کے ہم عمر کھیل کود میں مصروف رہتے مگر شیخ کو ان چیزوں سے کوئی مناسبت نہ تھی، وہ کتابوں کے مطالعہ میں غرق رہتا، اور شب بیداری میں کتابوں کا مطالعہ جاری رکھتا گویا یہ اس کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، کہ طلب علم کے ذوق میں اپنے پر نیند حرام کر رکھی تھی، سچ ہے، "ومن طلب العلی فقد سہر اللیالی" جس حجت اور دلیل پر غور کرتا پہلے اس کے مقدمات قیاسی ثابت کرتا انھیں کاغذوں پر لکھ لیتا، مقدمات کی شرائط پر غور کرتا جو قیاسات حاصل ہوتے یا حل نہ ہوتے ان کو زیر نظر رکھتا اور اگر کسی مسئلہ میں الجھ جاتا یا حل نہ کر سکتا تو مسجد میں جاکر نماز ادا کرتا اور نہایت تضرع سے خداوند تعالیٰ سے دعا کرتا کہ اے پروردگار اس مسئلہ کو حل کر دے اور ہر رات کو جب گھر لوٹتا تو پڑھنے لکھنے میں مشغول ہو جاتا، اس حالت میں اگر اسے جھپکی بھی آجاتی تو خواب میں وہی مسائل نظر آتے چنانچہ بہت سے مسائل کی حقیقت اس کو خواب ہی میں معلوم ہو جاتی، اس ریاضت کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ جملہ علوم و فنون میں ماہر و کامل ہوگیا اور بقیہ عمر میں پھر اس پر کچھ اضافہ نہ ہوا۔

شیخ بحیثیت ایک طبیب، فلسفی، ریاضی داں، ماہر علم نجوم و فلکیات کے بہت مشہور ہے، باوجود ان کمالات کے علم دین کی تکمیل میں وہ ہمیشہ سرگرم رہا اور قرآن مجید کی تحصیل سے کبھی غفلت نہ برتی، چنانچہ تفسیر اور مسائل تصوف اور علم شعر میں اس کی کئی اہم تصنیفات موجود ہیں

→ p. 4[illegible]

شیخ کے شاگرد ابو عبید جوزجانی[1] نے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ:-

"شیخ ایک دن ابو منصور الجبائی کے ساتھ امیر علاء الدولہ کی مجلس میں شامل تھا، لغت کا ایک مسئلہ پیش تھا، شیخ نے بھی اس میں حصہ لیا اور جو کچھ اس کی یادداشت میں تھا اس نے کہا، ابو منصور نے اس کی طرف دیکھ کر کہا کہ تم فلسفی اور حکیم تو ہو ضرور لیکن تمہیں لغت میں کچھ درک نہیں ہے، نہ تم نے پڑھی ہے، شیخ کے دل میں اس طعن نے بڑا اثر کیا، متواتر تین سال تک ادب کے مطالعہ اور تحقیق میں مصروف رہا پھر خراسان سے ایک کتاب تہذیب اللغت مصنفہ ابو منصور الازہری[2] منگوا کر پڑھی، اور لغت میں ایسے درجہ پر پہنچ گیا کہ اس کے مانند بہت کم لوگ پائے جاتے تھے، اس کے بعد تین قصائد لکھے جن میں الفاظِ غریبہ کا استعمال کیا، اور تین کتابیں لکھیں، ایک ابن العمید[3] کے طرز پر دوسری صابی[4] کے طرز پر اور تیسری صاحب[5] کے طرز پر، پھر ان تینوں پر ایسی جلدیں کرائیں کہ جن سے کتابیں بالکل پرانی معلوم ہوں، اور انھیں امیر ابو منصور کی خدمت میں پیش کیں اور کہا کہ جنگل میں شکار کے لئے گیا تھا، وہاں پڑی پائی ہیں ان پر ذرا غور کیجئے اور ان کے مطالب سمجھائیے، ابو منصور نے جب یہ کتابیں دیکھیں تو انھیں سمجھنے میں بڑی دقت پیش آئی، شیخ نے اس کی رہبری کی اور ان تمام الفاظ کو جن لغات کی کتابوں میں درج تھے بتاتے، ابو منصور سمجھ گیا کہ یہ رسائل شیخ کی طبع رسا کا نتیجہ ہیں، اور اس کے طعن کا جواب ہے جو اس نے ایک مرتبہ کیا تھا، چنانچہ اس نے شیخ سے معافی مانگی۔"

کتب و رسائل فارسی

ابو علی ابن سینا (شیخ الرئیس) کے نام سے بہت سی کتابیں انتساب کی گئی ہیں بعض تو

---

[1] ابو عبید عبدالواحد بن محمد الجوزجانی، الفقیہ، الحکیم، [2] ابو منصور محمد بن احمد بن الازہر الازہری الہروی اللغوی لغت کے مشہور ائمہ میں سے ہیں سال وفات ۳۷۰ یا ۳۷۱ھ [3] ابو الفضل محمد بن العمید الکاتب وزیر معروف دیالمہ ۳۶۰ھ (وفیات الاعیان مطبوعہ مصر ج ۲، ص ۸۳ - ۸۸)، [4] ابو اسحٰق ابراہیم بن ہلال الحرانی الصابی صاحب رسائل مشہور متوفی قبل ۳۸۰ھ (وفیات الاعیان مصر ج ۱ ص ۱۷ - ۱۸)

[5] الصاحب ابو القاسم اسمٰعیل بن عباد دانشمند مشہور وزیر مؤید الدولہ و فخر الدولہ دیلمی متوفی ۳۸۵ھ (وفیات الاعیان ج ۱ ص ۱۰۴ - ۱۰۷

شیخ کی تصنیفات سے ہیں، لیکن اکثر ان میں سے عربی کتابوں کے تراجم فارسی زبان میں اسی مسلم الثبوت استاد کی طرف منسوب ہو گئے ہیں، ان میں سے چند کے نام ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

۱۔ دانش نامہ علائی یا دانش نامہ علائیہ، حکمت علائی یا حکمت علائیہ، ان میں سے بہت اہم کتاب ہے، اس کتاب کو شیخ نے علاء الدولہ کاکویہ کی خواہش سے تصنیف کی تھی، یہ کتاب منطق، طبیعیات، ہیئت، موسیقی اور مابعد الطبیعیات پر ہے، لیکن افسوس ہے کہ منطق، الٰہیات وطبیعیات کے علاوہ کچھ اور لکھنے کی اسے توفیق نہ ہوئی، باقی کتاب (ہیئت، ہندسہ، حساب، موسیقی) اس کے بعد اس کے شاگرد ابو عبید جوزجانی نے شیخ کی مختلف تصانیف (عربی) سے ترجمہ کر کے اسے مکمل کر دیا۔

۲۔ رسالہ نبض، اس کے کئی نسخہ کتب خانہ مجلس و مشہد مقدس میں موجود ہیں۔

۳۔ رسالہ معراجیہ یا معراجنامہ، اس رسالہ کو شیخ نے اپنے ایک دوست کی خواہش سے لکھا تھا، اصطلاحاتی تاویلات پر مشتمل ہے، مثلاً روح القدس، وحی، کلام اللہ، نبوت، شریعت اور معراج کے موضوع پر بحث اور اس بات کے اثبات میں کہ معراج روحانی ہے نہ کہ جسمانی، اس کے متعدد نسخہ جات تہران اور کتابخانہ برٹش میوزیم، دار الکتب مصریہ، استنبول میں موجود ہیں،

۴۔ کنوز المعزمین ۔ یہ رسالہ طلسمات اور نیرنجات پر مشتمل ہے، اس کے نسخے تہران اور کتب خانہ استانبول میں موجود ہیں۔

۵۔ ظفر نامہ، ایک چھوٹا سا رسالہ ہے اس کے نسخے تہران، بنگال، بودلین اور استانبول میں موجود ہیں، یہ کتاب امیر سامانی نوح بن منصور کے لئے لکھی تھی،

۶۔ حکمت الموت فارسی، یہ رسالہ ظاہرا شیخ کے عربی رسالہ "حکمت الموت" کا فارسی ترجمہ ہے، استانبول میں اسعد آفندی کے کتب خانہ میں اس کا نسخہ موجود ہے، اور شیخ الرئیس کے نام سے منسوب ہے۔

۷- رسالہ نفس، اصل عربی رسالہ ۱۶ فصلوں میں ہے، اس کا فارسی ترجمہ بھی ۱۶ فصول میں ہے، یہ ترجمہ فارسی بھی شیخ کی طرف منسوب ہے، اس کے متعدد نسخے جگہ جگہ موجود ہیں۔

۸- رسالہ المبداء والمعاد، اصل رسالہ شیخ نے عربی زبان میں تالیف کیا تھا، اس کا فارسی ترجمہ کتابخانہ برٹش میوزیم میں موجود ہے، اور شیخ کی طرف منسوب ہے،

۹- رسالہ المعاد، اصل رسالہ عربی ہے، اس کا فارسی ترجمہ برٹش میوزیم میں موجود ہے اور شیخ کی طرف منسوب ہے۔

۱۰- رسالہ اثبات النبوت یا رسالہ نبوت۔ اصل عربی میں ہے اس کا فارسی ترجمہ کتابخانہ نور عثمانیہ استانبول اور کتابخانہ مشہد مقدس میں موجود ہے، اور ابن سینا کی طرف منسوب ہے

۱۱- رسالہ علل تسلسل موجودات و حقیقت وکیفیت سلسلہ موجودات و تسلسل اسباب و مسببات، یہ رسالہ فارسی زبان میں ہے، اس کے نسخے کتابخانہ مشہد و کتابخانہ مدرسۂ عالی سپہ سالار میں موجود ہیں،

۱۲- قراضئہ طبیعیات- اس رسالہ کا ایک نسخہ کتاب خانہ ملی ایران میں موجود ہے اور شیخ کی طرف منسوب ہے،

۱۳- رسالہ وجودیہ طب میں- اس رسالہ کا ایک قلمی نسخہ ابن سینا کا لکھا ہوا اسی کی طرف منسوب ہے، آقائے ڈاکٹر محمود نجم آبادی نے انجمن آثار ملی کی طرف سے چھپوایا ہے، اس رسالہ کی صحت میں تامل ہے۔

۱۴- رسالہ بیشین وبرین یا علم بیشین وبرین- اس رسالہ کا ایک نسخہ کتاب خانہ ملک تہران میں موجود ہے۔

۱۵- معیار العقول در علم جر ثقیل- یہ رسالہ ابن سینا کی طرف منسوب ہے اور پہلی بار ہندوستان میں چھپایا گیا ہے، اور انجمن آثار ملی کی خواہش پر آقائی جلال الدین ہمائی نے بھی اس کو چھپوایا ہے۔

۱۶۔ رسالہ در منطق ۔ اس کا ایک نسخہ کتاب خانہ ملک التجار (تہران) میں موجود ہے، اور شیخ کی طرف منسوب ہے ۔

۱۷۔ رسالہ عشق ۔ یہ رسالہ ابن سینا کے رسالہ "العشق" کا ترجمہ ہے اور اس کا فارسی ترجمہ شیخ کی طرف منسوب ہے،

۱۸۔ رسالہ اکسیر ۔ یہ قلمی نسخہ شیخ کے ہاتھ کا لکھا ہوا کتابخانہ سلطان احمد سوم میں موجود ہے اور شیخ الرئیس کی طرف منسوب ہے ۔

۱۹۔ رسالہ در اقسام نفوس ۔ اس کا ایک نسخہ کتابخانہ مجلس شورائے ملی میں موجود ہے اور ابو علی سینا کی طرف منسوب ہے، ظاہرا یہ کتاب بھی شیخ کے عربی رسائل میں سے ایک رسالہ کا ترجمہ ہے ۔

۲۰۔ تشریح الاعضاء ۔ اس رسالہ کا ایک نسخہ کتاب خانہ سلطان احمد سوم و اباصوفیہ و حمیدیہ و فاتح و نور عثمانیہ استانبول میں موجود ہے اور شیخ کی طرف منسوب ہے ۔

۲۱۔ رسالہ در معرفت سموم و دفع مضرات آں در سہ باب ، اس رسالہ کو بھی شیخ کی طرف منسوب کرتے ہیں، لیکن صحت میں کلام ہے ۔

۲۲۔ حل مشکلات معینیہ ۔ اس کا ایک نسخہ کتاب خانہ اباصوفیہ میں موجود ہے اور شیخ الرئیس کی طرف منسوب ہے ۔

۲۳۔ شرح کتاب النفس ارسطو ۔ یہ کتاب ارسطو کی کتاب النفس کی عربی شرح جو ابن سینا کی تھی اس کا فارسی ترجمہ ہے، اس کتاب کا ایک نسخہ کتابخانہ سلطان احمد سوم استانبول میں موجود ہے، اور ابن سینا کی طرف منسوب ہے ۔

مذکورہ رسائل میں جو براہ راست شیخ کے فارسی نسخوں کی طرف منسوب ہیں ان میں سے اکثر کی صحت میں تامل ہے، لیکن چونکہ اس استاد کے نام سے شہرت پا گئے ہیں اس لئے ان کا یہاں ذکر کر دیا گیا ہے ۔

ترجمہ اشارات ابو علی کہ ان میں سے بعض انوری شاعر کی طرف منسوب کرتے ہیں، ایک نسخہ جو اس کتاب پر منحصر ہے ۱۳۱۶ھ میں تہران میں چھپ چکا ہے،

خطبہ در توحید بنام خطبۃ الغراء شیخ کی اس تصنیف کو ۴۷۲ھ میں حکیم عمر خیام نے فارسی زبان میں منتقل کیا، اور یہ ترجمہ عربی متن کے ساتھ مجلہ شرق میں طبع ہوا،

شرح و ترجمہ حی بن یقظان جو علاء الدولہ کاکویہ کے حکم سے لکھا گیا اس کی عبارت نہایت فصیح و بلیغ ہے بعض لوگ اس کو جوزجانی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

شرح رسالہ الطیر از عمر بن سہلان ساوی، ۱۹۳۵ء میں اشٹگارٹ میں طبع ہوئی۔

ابن سینا کا ادب میں مقام

بو علی سینا صرف علوم و فنون کا ماہر ہی نہ تھا کہ اسی کی بحث و تحقیق میں مصروف رہتا ہو بلکہ ادب میں بھی اس کا مقام نہایت اعلیٰ وارفع ہے، عربی اور فارسی زبانوں پر اسے بڑا عبور حاصل تھا، عربی زبان پر اسے جو قدرت حاصل تھی اور مطالب کے ادا کرنے میں اسے جو مہارت تھی اس کی نثر سے کافی طور پر عیاں ہے مقاصدِ علمی کے اظہار میں ادبی حیثیت سے اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں زبان فارسی دری میں علمی کتابوں کی تحریر کا آغاز ہوا لیکن ابھی اس زبان میں اتنی سکت نہ تھی کہ اس میں مقاصدِ علمی بیان کئے جا سکیں، لیکن ابن سینا اس زبان میں بھی تصنیف و تالیف سے غافل نہ ہوا، مصطلحات کے جمع کرنے اور فلسفی و علمی مصطلحات کی ایجاد اپنی مادری زبان میں کر کے آنے والے ایرانی ادیبوں کا پیشرو بنا، اس سے قطع نظر دوسرے فنونِ ادب یعنی شعر و شاعری کے میدان میں بھی اپنے زمانے کا ممتاز شاعر تھا، ایک ایسا شخص کہ جس کی اس کثرت سے تالیفات ہوں اور جس کا غالب وقت سیاسی گتھیوں کے سلجھانے میں صرف ہوتا ہو اس کیلئے عربی اور فارسی میں شعر کہہ لینا کوئی معمولی بات نہیں۔

ابو علی سینا کا فارسی کلام چند قطعوں، رباعیوں اور قصائد پر مشتمل ہے، جو کتابوں میں پراگندہ ملتے ہیں، فارسی اشعار کی کل تعداد ۲۲ قطعات، رباعیاں اور کچھ ابیات جن کی تعداد کل ملا کر

۱۵ تک پہنچتی ہے، سفینوں، مجموعوں اور بعض کتابوں مثلاً آتش کدہ آذر، تذکرہ محمد صادق ناظم تبریزی، مجمع الفصحا، ریاض العارفین ہدایت، اور مجالس المومنین قاضی نور اللہ اور نامۂ دانشوران وغیرہ میں ملتے ہیں، ان میں سے کچھ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:-

اگر دل از غم دنیا جدا توانی کرد — نشاط عیش بدار بقا توانی کرد
وگر بآہ ریاضت برآوری نفسی — ہمہ کدورت دلہا صفا توانی کرد
ز منزلات ہوس گر بروں نہی گامی — نزول در حرم کبریا توانی کرد
وگر ز ہستی خود بگذری یقیں میدان — کہ عرش و فرش و ملک زیر پا توانی کرد
ولیکن ایں عمل رہروان چالاکست — تو نازنین جہانی کجا توانی کرد
نہ دست و پائے اجل را فرو توانی بست — نہ رنگ و بوئ جہاں را رہا توانی کرد
چو بوعلی ببر از خلق و گوشہ بگزیں — مگر کہ خوئ دل از خلق را توانی کرد

غذائ روح بود بادہ رحیق الحق — کہ رنگ و بوش کند رنگ و بوئ گل را دق
برنگ زنگ زداید زجان اندہگیں — ہمائ گردد اگر جرعۂ بنوشد بق
بطعم تلخ چو پند پدر ولیک مفید — بپیش مبطل باطل بنزد دانا حق
مے از جہالت جہال شد بشرع حرام — چو مہ کہ از سبب منکران دیں شد شق
حلال گشتہ بفتوای عقل بر دانا — حرام گشتہ باحکام شرع بر احمق
شراب را چہ گنہ زانکہ ابلہی نوشد — زباں بہرزہ گشاید دہد ز دست ورق
حلال بر عقلا و حرام بر جہال — کہ مے محک بود و خیر و شر ازو مشتق
غلام آں مے صافم کز و رخ خوباں — بیک دو جرعہ برآرد ہزار گونہ عرق
چو بوعلی مے ناب ار خوری حکیمانہ — بحق حق کہ وجودت شود بحق ملحق

روز کی چند در جہاں بودم — بر سر خاک باد پیمودم
ساعتی لطف و لحظۂ در قہر — جان پاکیزہ را بیالودم

باخرد را بطبع کردم ہجو   بی خرد را بطبع بستودم
آتشی برفروختم از دل   دآب دیده از آں بپالودم
باہولہا ئے حرصِ شیطانی   ساعتی شادماں بغنودم
آخر الامر چوں برآمد کار   رفتم و تخم کشتہ بدرودم
گوہرم باز شد بگوہرِ خویش   من ازیں خستگی بیاسودم
کس نداند کہ من کجا رفتم   خود ندانم کہ من کجا بودم

گماں برم کہ دریں روزگار تیرہ چو شیب   بخفت چشمِ مروت بمرد مادرِ جود
زسیرِ ہفت ستارہ دردرِ ایں دوازدہ برج   بدُ دوازدہ سال اندریں دیار و حدود
ہزار شخص کریم از وجود شد بعدم   کہ یک کریم نمی آید از عدم بوجود

بگزار ازِ بندِ مجاز و دور گرد از دامِ حس   ہر کہ یاد و نان نشیند ہمت او دوں شود
چوں بود کامل کسے در خطۂ کون و فساد   کو نداند چوں درآید یا از آنجا چوں شود

دل گرچہ دریں بادیہ بسیار شتافت   یک موئی ندانست ولی موئی شگافت
اندر دلِ من ہزار خورشید بتافت   وآخر بکمال ذرۂ راہ نیافت

تا بادۂ عشق در قدح ریختہ اند   وندر پئ عشق عاشق انگیختہ اند
با جان و رواں بو علی مہرِ علی   چوں شیر و شکر بہم برآمیختہ اند

کفر چو منی گزاف و آساں نبود   محکم تر از ایمانِ من ایماں نبود
در دہر چو من یکی و او ہم کافر   پس در ہمہ دہر یک مسلماں نبود

از قعرِ گلِ سیاہ تا اوجِ زحل   کردم ہمہ مشکلاتِ گیتی را حل
بیروں جستم ز قیدِ ہر مکر و حیل   ہر بند گشادہ شد مگر بندِ اجل

اے کاش بدانمی کہ من کیستمے   سرگشتہ بعالم از پئے چیستمے
گر مقبلم آسودہ و خوش زیستمی   ورنہ بہزار دیدہ بگریستمے

رفت آں گہری کہ بود پیرایۂ عمر وآورد زمانہ طاقِ سرمایۂ عمر

از موئے سپیدم سرِ پستانِ امید بنگر کہ سیاہ میکند دایۂ عمر

بعض رباعیاں اور بھی ہیں جو مجمع الفصحا، ریاض العارفین و کشکول شیخ بہائی ابو علی کے نام سے ملتی ہیں، اور یہی رباعیاں خیام کی رباعیوں کے نام سے خیام کی رباعیات میں ملتی ہیں جسب ذیل ہیں:

می حاصل عمر جاودانیست بدہ سرمایۂ لذت جوانیست بدہ

سوزندہ چو آتشست لیکن غم را سازندہ چو آب زندگانیست بدہ

بایک دو سہ ناداں کہ چنیں می دانند از حمق کہ دانائے جہاں آنانند

خر باش کہ ایں جماعت از فرطِ خری ہر کو نہ خر ست کافرش میخوانند

مائیم بعفو تو تولی کردہ وز طاعت و معصیت تبری کردہ

آنجا کہ عنایت تو باشد باشد ناکردہ چو کردہ کردہ چوں ناکردہ

شیخ الرئیس ابو علی سینا اور عمر خیام کے زمانوں میں قریباً سوا سو سال[125] کا فرق ہے شیخ کے تبحر علمی کا اندازہ کیجئے بُعد زمانی کے باوجود اچھے اچھے مسلم الثبوت استاد اس صاحبِ کمال کے کلام اور عمر خیام کے کلام میں امتیاز نہ کر سکے حالانکہ شیخ کے زمانہ میں فارسی زبان اس بوجھ کی متحمل نہ سمجھی جاتی تھی کہ اس کا شمار علمی زبانوں میں کیا جاسکے اور یہی وجہ ہے کہ جو علماء علوم و فنون کی کتابیں لکھتے تھے وہ عربی زبان کو اپنے مقاصد کے اظہار کا ذریعہ بناتے تھے، مگر شیخ کا کمال اظہر من الشمس ہے کہ اس نے اگرچہ اپنی تصانیف کو عربی کا جامہ پہنایا، لیکن اس کا قلم معجز رقم فارسی میں بھی اسی قدر پر زور اور گہر افشاں تھا کہ آنے والی نسلوں نے اس سے بے انتہا استفادہ کیا اور فارسی نظم و نثر میں اس نے جو خامہ فرسائی کی ہے، آیندہ زمانے کے لئے دلیلِ راہ بن گئی ہے، بس یہی کہنا پڑتا ہے کہ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ " افسوس ہے کہ شیخ نے طویل عمر نہیں پائی، اس کی عمر کے بارے میں مختلف اقوال ہیں، مگر زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ اس نے کم سے کم ترپن[۵۳] سال اور زیادہ سے زیادہ اٹھاون سال کی عمر پائی اور اس عرصہ میں جتنی کتابیں تصنیف کی ہیں ان کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے ۔۔

البیرونی اور اصفہبد جیلجیلان مرزبان بن رستم

(دیباچہ کتاب مقالید الہیئۃ کی روشنی میں)

از

(جناب مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی استاذ شعبۂ عربی مدرسہ عالیہ کلکتہ)

قابوس بن وشمگیر (۴۰۳ھ / ۱۰۱۲ء) ابو العباس مامون بن مامون (م ۴۰۷ھ / ۱۰۱۶ء) اور سلطان مسعود غزنوی (۴۳۲ھ / ۱۰۴۱ء) سے ابو الریحان محمد بن احمد البیرونی (۳۶۳ھ / ۹۷۳ء - ۴۴۰ھ / ۱۰۴۸ء) کے تعلقات بہت روشن اور جلی ہیں۔ اس نے قابوس کے لئے کتاب الآثار الباقیہ لکھی۔ اور مسعود کے نام سے اپنی مشہور کتاب القانون المسعودی معنون کی اسی طرح اپنی ایک تالیف سپہبذ مرزبان بن رستم بن شروین کے نام سے موشح کی اور ہمارے علم میں یہ پہلی تالیف تھی جو کسی فرمانروا کے لئے البیرونی کے قلم سے نکلی۔

بیرونی کے تذکرہ نگار سپہبذ مرزبان اور اس کے تعلقات پر روشنی ڈالنے سے قطعاً معذور ہیں کہ اصل تالیف کی کمیابی کے علاوہ سپہبذ مرزبان کی شخصیت تاریخی طور پر غیر معروف رہی ہے۔ پیش نظر مضمون میں بیرونی کی اس نادر کتاب کے تعارف کے ساتھ سپہبذ مذکور کی شخصیت سے بحث اور ممکن الحصول معلومات کو فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مقالید الہیئۃ ابن ابی اصیبعہ (م ۶۶۸ھ / ۱۲۷۰ء) بیرونی کے ترجمہ[1] میں اس کی تالیف مقالید الہیئۃ کا ذکر کرتا ہے۔ خود البیرونی کتاب استیعاب الوجوہ الممکنۃ فی صنعۃ الاسطرلاب[2] کے اوائل میں ممر کواکب کا درجہ معلوم کرنے کے دو طریقوں کا ذکر کرتے ہوئے ہر دو طریق عمل کے برہان کے لئے زیر بحث

---

[1] عیون الانباء ج ۲ ص ۲۰ - طبعہ مولر (امرؤ القیس بن الطحان) مصر ۱۳۰۰ھ حاجی خلیفہ (۶ / ۵۳) فلوگل

[2] نسخہ جمعیت اسیویہ (کلکتہ) زیر شمارہ (A ۱48) برگ ۱۲۰ ب - ایضاً رقم II 132 - برگ ...

کتاب کا حوالہ ان لفظوں میں دیتا ہے:

"وقد اقمت البرهان علی هذین العملین فی کتابی الموسوم بمقالید الهیئة"

میں نے ان دونوں طریقوں پر اپنی کتاب مقالید الہیئہ میں برہان قایم کر دیا ہے۔[1]

اور اپنی کتابوں کی خود نوشت فہرست[1] میں اس کتاب کو ۱۵۵ ورقوں میں اصفہبد جیلجیلان مرزبان بن رستم کے لئے لکھنے کی تصریح کرتا اور پورا نام کتاب مقالید علم الهیئة ما یحدث فی بسیط الکرة بتاتا ہے۔

کتاب المقالید ریاضیات کے مشہور ماہر و امام نصیر الدین طوسی (م ۶۷۲ھ / ۱۲۷۴ء) کے پیش نظر رہی تھی اور اس نے کتاب الشکل القطاع کی ایک خاص فصل میں بیرونی کی اس تالیف کے اصل مباحث کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ ممکن ہے کہ طوسی نے کتاب المقالید سے نہ صرف اسی حد تک استفادہ کیا ہو بلکہ علم مثلث کروی پر اپنی مجتہدانہ تحقیقات کی بنیاد قایم کرنے میں بھی البیرونی کی اس تالیف سے مدد لی ہو[2] لیکن کسی صحیح نتیجہ تک پہنچنا ممکن نہیں تا آنکہ بیرونی کی کتاب اصحاب فن کے ہاتھوں میں نہ پہنچ جائے۔

کتاب مقالید الہیئۃ سے ہماری دلچسپی کا دائرہ بہت محدود ہے۔ کتاب کا دیباچہ فنی مسائل سے زیادہ شکل مغنی عن القطاع کی تاریخ پیش کرتا ہے اس طرح فن سے ناواقفیت کے باوجود ہمارے لئے کافی سامان جاذبیت دیباچہ میں موجود ہے۔ خود البیرونی کی زندگی کے بعض غیر معروف گوشوں کی طرف واضح اشارے اس دیباچہ میں ملتے ہیں جو بے حد اہم ہیں۔

موجود نسخے البیرونی کے حالات و تالیفات پر بعض مستند فضلاء کی تحریریں ہماری نظر سے گذری ہیں لیکن باستثناء آقائے جلال ہمائی کسی کی تحریر کتاب مقالید الہیئہ کے موجودہ نسخوں سے

[1] الآثار الباقیہ — مقدمہ زخاؤ P. xxxx.

[2] دیکھو: Al-Biruni Comm. Volume, pp. 162, 170, 1951.

تعرض نہیں کرتی۔ بروکلمان[1] اس کتاب کے کسی نسخہ کی نشاندہی یقین کے ساتھ نہیں کرتا وہ صرف سوتر (Suter) کا یہ شبہ بتاتا ہے کہ پیرس کے مکتبہ ملیہ میں زیر شمارہ 2497 (عربی) کتاب کتاب المقالید[2] کا نسخہ ہوگا۔ لیکن کیٹلاگ سے ظاہر[2] ہوتا ہے کہ پیرس کا یہ نسخہ جس کا تعلق اسطرلاب سے ہے کچھ اور ہی شئی ہے۔ ہمارے علم میں آقائے ہمائی تنہا شخص ہیں جنہوں نے بیرونی کی مشہور کتاب التفہیم لاوائل صناعۃ التنجیم (فارسی) کی تصحیح و تحشیہ میں کتاب المقالید للبیرونی سے مدد لی اور استفادہ[3] کیا ہے وہ اس کتاب کے دو عمدہ نسخوں کا ذکر کرتے ہیں۔ دونوں نسخے کتاب خانہ سپہ سالار جدید (ایران) میں زیر شمارہ (۵۹۶) و (۵۹۷) موجود ہیں۔ کتاب المقالید کا ایک قیمتی نسخہ جمعیت اسیاویہ (کلکتہ) کے کتب خانہ میں بھی ہے اور فن ریاضی کے آٹھ رسائل کے مجموعہ[4] میں یہ آخری رسالہ ہے جس کے کل چھیالیس اوراق ہیں پورا مجموعہ ایک ہی کاتب کی قلم کشی کا نمونہ ہے۔ نقطوں کا التزام نہیں کیا گیا ہے۔ طرز خط اور کاغذ کی قدامت سے عیاں ہے کہ یہ مجموعہ غالباً آٹھویں صدی ہجری سے مؤخر عہد کا نہیں ہو سکتا۔

موضوع کتاب | مقالید الہیئۃ بیرونی کے عنفوان شباب کی تصانیف میں سے ہے اس سلسلہ کی ضروری باتیں آئندہ پیش کی جائیں گی کہ اس کتاب کے زمانہ تالیف ہی سے سپہبذ مرزبان بن رستم کی اصبہبذیت کی بحث وابستہ ہے۔ لہذا اس بحث کو مؤخر کرکے ہم اصل موضوع سے آغاز کرتے ہیں:

علم مثلث کے ابتدائی مسائل یونانی ماہرین ریاضی و ہیئت کے یہاں ملتے ہیں قدیم ہندی ریاضیات میں بھی اس خاص شعبہ کا نشان واضح طور پر پایا جاتا ہے۔ مثلاً مسئلہ

---

[1] Gesch. Arab. Litt. S. Vol. I. P. 874 (14) 1937

[2] فہرست مکتبہ ملیہ پیرس۔ مرتبہ M. Le Baron de Slane ص ۴۴۳ (۱۸۸۳ء۔۱۸۹۵ء) اس نسخہ کا آغاز اس طرح ہے: "الحمد للّٰہ مانح عطایہ و کاشف غطائہ"

[3] کتاب التفہیم (فارسی): مقدمۂ ناشر (کا، فکح) چاپ تہران

[4] زیر شمارہ III. 15. A (کارڈ) — دیکھئے متفرقات (اسی مضمون کا خاتمہ)

جیوب کی اصلیت کے متعلق اہل تحقیق کا فیصلہ یہ ہے کہ آریا بھٹ (عربوں کا ارجبھذ، تقریباً سنہ ۵۰۰م) اور برہما گپتا (سنہ ۶۲۰م) کی تحریروں میں اس کا سراغ ملتا ہے اور خود لفظ "جیب" سنسکرت اصطلاح "جیوا" کا معرب کہا جاتا ہے۔ مسئلہ جیوب کو ترقی دینے میں مسلم ریاضیین نے خاص طور پر حصہ لیا تھا اور ان کا ترقی دادہ مسئلہ جیوب موجودہ کروی فلکیات[1] میں بھی بنیادی مسئلہ تسلیم کیا جاتا ہے علم المثلث کو عربوں نے جو ترقی دی اس کا اعتراف یورپ کے محققین بھی شاندار الفاظ میں کرتے ہیں مثلاً گستاولی بان لکھتا ہے کہ "علم مثلث کروی (Spherical trigonometry) مثلثات حل کرنے کی چند ایسی شکلیں عہد اسلامی میں ایجاد ہوئیں جن سے یہ علم بالکل بدل گیا اور ان کی معلوم کردہ شکلیں اب تک مستعمل[3] ہیں۔" مشہور مستشرق نالینو (Nallino) عربوں کے علم الفلک پر اپنی تحقیقات پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "اسلامی فضلاء[2] کا ایک اہم کارنامہ کروی مثلثات کے شعبہ میں یہ تھا کہ ان لوگوں نے سدۂ چہارم ہجری کے نصف آخر میں جیوب[1] اضلاع و زوایا کا تناسب ثابت کر دیا تھا اور تناسب جیوب ہی کے قاعدہ پر کروی مثلثات کے حل کا ایک مخصوص طریقہ شکل مغنی کا ایجاد کیا تھا۔"

سطح کرہ پر دوائر عظام کے تقاطع سے جو قسی پیدا ہوتے ہیں ان کے مقادیر سے واقفیت کا قدیم ذریعہ شکل قطاع کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے موجد اہل یونان تھے چنانچہ مالاناؤس (سنہ ۱۰۰ء) اور بطلمیوس (سنہ ۱۴۰ء) کی تالیفات میں اس کا ذکر آتا ہے۔ اور چوتھی صدی ہجری کے نصف تک اس شکل کا استعمال عام طور پر جاری رہا۔ اصل میں شکل قطاع کو ایک کلید کی حیثیت حاصل تھی جس کے بغیر اہل فن کسی صحیح نتیجہ تک پہنچ نہیں پاتے تھے۔ اس شکل کو جیسی اہمیت حاصل تھی اس کے استعمال میں اسی قدر دشواریاں پیش آتی تھیں اور نسب مؤلفہ و اختلافات دعاوی کے کامل ضبط کے بغیر اس شکل کا استعمال سودمند نہیں ہو سکتا تھا۔ ان لوازمات کی وجہ سے حصول مطلوب میں جو دقت پیش آتی تھی اس سے نجات پانے کی ترکیب پر مسلم علمائے ریاضی نے غور کرنا شروع کیا اور چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر تک بعض ایسی شکلوں کی ایجاد میں ان کو کامیابی حاصل ہو گئی جو اپنے فوائد و نتائج کے اعتبار سے ایک طرف تو شکل قطاع کی قائم مقام ثابت ہوئیں اور دوسری طرف ان کے استعمال میں نسب مؤلفہ اور اختلاف دعاوی کے قید و ضبط میں طویل حسابی اعمال کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی تھی۔

---

[1] برٹانیکا: ج ۲۲ ص ۲۶۷ (۲۹ واں ایڈیشن) نیز دیکھو: Al-Biruni comm. vol pp. 162, 48-

[2] ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین: فروری و مئی سنہ ۱۹۵۲ء ص ۲

[3] تمدن عرب: صفحہ ۴۱۲

[4] سید حسن برنی: البیرونی صفحہ ۳۸-۳۹ سنہ ۱۹۲۷ء نیز al-Biruni comm. vol: صفحہ ۲۶۰ (۴)

ہمیں ایسی دو شکلوں کا علم ہے شکل ظلی اور شکل مغنی عن القطاع - دونوں شکلیں ایک ہی زمانہ میں اور ایک ہی مقصد کے پیش نظر وضع کی گئی تھیں اور خاص خاص مواقع میں ان میں سے ہر ایک باعتبار افادیت وسہولت بخشی دوسری شکل پر فوقیت رکھتی تھی۔ لیکن شکل قطاع اور اس کے لوازمات سے استغناء بخش ہونے میں دونوں کا درجہ تقریباً مساوی تھا۔

شکل ظلی کا موجد مشہور ریاضی داں ابو الوفاء البوزجانی (م ۳۸۸ھ / ۹۹۸ء) تھا اور اس بارہ میں کسی کا اختلاف منقول نہیں لیکن شکل مغنی کے اختراع کی نسبت بڑا تنازع بپا رہا تھا اس اختراع کا زبردست مدعی خود ابو الوفاء البوزجانی تھا اسی طبقہ کا ایک اور ہیئت داں ابو محمود حامد بن خضر الخجندی (م ۳۸۲ھ / ۹۹۲ء) اسے صرف اپنی قوت اختراع کا نتیجہ قرار دیتا تھا البتہ اس نے اس شکل کو المغنی کے عوض قانون الہیئۃ کا نام دیا تھا۔ البیرونی کی کتاب مقالید الہیئۃ کا تعلق براہ راست اسی شکل مغنی عن القطاع سے ہے اور اس کا بیان اس سلسلہ میں یہ ہے کہ شکل مغنی کا حقیقی مخترع اس کا استاذ امیر ابو نصر منصور بن عراق تھا لیکن ابن عراق نے اس شکل کا کوئی نام مقرر نہیں کیا تھا؛ اسکو شکل مغنی کا نام جس شخص نے دیا وہ طبرستان کا ایک مشہور ہیئت داں کوشیار بن لبان الجیلی (م ۴۲۰ھ / ۱۰۲۸ء) تھا۔ نصیر الدین طوسی کی تحقیق میں یہ نام خود ابن عراق کا مقرر کردہ[۲] اور شاید ثابت بن قرہ (م ۲۸۸ھ) سے مستعار تھا جس نے شکل قطاع سے استغناء پیدا کرنے کی ترکیب ایک مستقل رسالہ کی شکل میں قلم بند کی تھی؛ البتہ ثابت بن قرہ کے پیش کردہ طریقہ میں نسب مؤلفہ کی ضرورت علی حالہ باقی تھی جب کہ ابو نصر ابن عراق نے اپنے اختراع کے ذریعہ نہ صرف شکل قطاع کی ضرورت ختم کردی تھی بلکہ نسب مؤلفہ کے استعمال سے بھی احتراز کی صورت واضح کردی تھی۔

البیرونی آغاز کتاب (جس کو ہم دیباچہ سے تعبیر کر رہے ہیں) میں اسی شکل کے اختراع

---

[۱] طوسی: کتاب الشکل القطاع (خط) برگ ۱۵۳ ب۔ (جمعیت آسیویہ کلکتہ) شمارہ III. 5. /۸۰ (مجموعہ)
[۲] طوسی: الشکل القطاع: برگ ۱۶۱ ب (بجوالہ کتاب المجسطی الشاہی تالیف ابن عراق)

کی بابت پورا قصہ بیان کرنے کے بعد اصل مسئلہ کی وضاحت میں مدعیانِ اختراع کے دعاوی کی تفصیل حتی الامکان انہی کے الفاظ و ترتیب میں نقل کرتا ہے اور جملہ طرق و مذاہب پر نقد و تحلیل کی نگاہ ڈالتا اور اپنے عندیہ و رجحانات مع دلائل بیان کرتا جاتا ہے۔ طوسی نے کتاب الشکل القطاع کی ایک خاص فصل میں بیرونی کی اسی تالیف سے شکل مغنی سے متعلق بعض فوائد درج کئے ہیں اور اس کی ایجاد کے بارہ میں تنازع و اختلاف نیز کتاب مقالید الہیئۃ کے اصل موضوع کا ان لفظوں میں ذکر کیا ہے:

"اصل دعاویہ ان نسب جیوب اضلاع المثلثات الحادثات من تقاطع القسیّ العظام فی سطح الکرۃ کنسب الزوایا الموترۃ لہا۔ وقد جرت العادۃ ببیان ھذہ الدعوی اولاً فی المثلث القائم الزاویۃ وقد ذھبوا فی اقامۃ البرھان علیہا فیہ مذاھب جمعہا الاستاذ ابو الریحان البیرونی فی کتاب لہ سمّاہ بمقالید علم ھیئۃ ما یحدث فی الکرۃ وغیرہ ویوجد فی بعض تلک الطرق تفاوت فاخترت منہا ما کان اشدّ مناسبۃً"[1]

(شکل مغنی کا) اصل دعویٰ یہ ہے کہ سطح کرہ پر قوسوں کے تقاطع سے جو مثلثات پیدا ہوتے ہیں ان کے جیوب الاضلاع کو زوایا مقابلہ سے تناسب ہوتا ہے۔ اس دعوی کا بیان پہلے مثلث قائم الزاویہ میں کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں علمائے ہیئت مختلف طریقوں پر برہان قائم کرتے ہیں استاذ ابو الریحان البیرونی نے اپنی کتاب "مقالید علم ھیئۃ ما یحدث فی بسیط الکرہ وغیرہ" میں ان تمام طریقوں کو جمع کر دیا ہے ان میں سے بعض طریقے (ہمارے مقصد سے) متفاوت ہیں لہذا ہم نے اسی طریقہ کا انتخاب کیا ہے جس کو (ہماری کتاب سے) زیادہ مناسبت ہے"۔

---

[1] طوسی: الفصل الخامس فی الشکل المغنی وشرح فروعہ ولواحقہ (برگ ۱۵۳ ب) نیز مطبوعہ قسطنطنیہ ص ۱۰۸

یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ شکل قطاع کی تسہیل کی جانب بوزجانی، خجندی اور ابن عراق وغیرہ سے بہت پیشتر ہی لوگوں کی توجہ منعطف ہو چکی تھی۔ ثابت بن قرہ کا رسالہ جس کا ذکر طوسی کی زبانی گذرا اس کا تذکرہ بیرونی بھی کرتا ہے[1] بلکہ اسی کے بیان سے یہ بھی ثابت ہے کہ شارحین کتاب المجسطی ابو العباس فضل بن حاتم النیریزی اور ابو جعفر الخازن نے ایسی شکلیں مخصوص مقاصد کے ماتحت ایجاد کی تھیں جن میں سے ہر ایک گویا شکل مغنی کے لئے پیش خیمہ کہی جاسکتی ہے۔ ان میں سے بعض شکلیں کتاب المقالید میں درج کی گئی ہیں[2]۔ بہرحال نمایاں کامیابی اس اختراع میں جس طبقہ کو حاصل ہوئی وہ بوزجانی اور ابن عراق کا طبقہ ہے؛

اصل قصہ: ابن عراق نے شکل مغنی کا اختراع کب کیا اور بیرونی کو اپنے استاذ کے اس کارنامہ کا علم کس موقع پر ہوا؟ اس قسم کے سوالات کا جواب، ابن عراق کی تالیف کتاب السموت کی وجہ تالیف معلوم کرنے سے متعلق ہے۔ جس کے متعلق ابو ریحان کا یہ دعویٰ ہے کہ امیر ابن عراق نے اسی کی فرمائش پر کتاب السموت لکھی تھی۔ کتاب السموت کے کسی نسخہ کا وجود تاحال معلوم نہیں لیکن اس کے حوالے خود ابن عراق کے مطبوعہ رسائل میں بھی ملتے ہیں جن سے حسب موقع ہم فائدہ اٹھائیں گے۔ سردست ہمیں یہ واضح کرنا ہے کہ البیرونی پر کیا افتاد پڑی تھی کہ اس نے استاذ ابن عراق کو کتاب السموت کی تالیف پر آمادہ کیا؟

خود البیرونی کا بیان ہمیں دیباچہ مقالید میں ملتا ہے کہ ایک دفعہ ابو سعید سجزی سمت قبلہ کے استخراج میں مصروف ہوا تو اس کے گرد و پیش علمائے ہندسہ کے مختلف طرق و کتب

---

[1] مقالید: برگ ۱۷۶/ظ [2] مقالید: برگ ۱۰۷/ظ (البرهان علی هذا الشکل المغنی من تفسیر ابی العباس النیریزی وابی جعفر الخازن لکتاب المجسطی الخ) ایضاً: برگ ۱۰۸/ب (شکل اورده ابو العباس النیریزی فی تفسیر المجسطی، یؤدی الی الشکل المغنی الخ) ایضاً: برگ ۱۰۸/ظ (وقد اورد ابو العباس بعد ذلک فی هذا التفسیر وابو جعفر الخازن فیه ایضا وفی زیج الصفائح لمعرفة المطالع وامثالها اشکالا مخصوصة باستخراج کل واحد منهما قریبة بعضها من بعض وکلها تؤدی الی ما ادی الیه ما تقدم من الشکل المغنی واکتفینا منها بما حکیناه ۔ ۱۲)

جمع ہو گئے جن سے بہ سہولت مقصد برآری کی صورت نہ پاکر سجزی نے اپنی دشواریوں کی اطلاع البیرونی کو بھیجی اس نے امیر ابن عراق کی اختراعی صلاحیتوں اور دقیق مسائل کے حل میں اس کی غیر معمولی قوت و درک کا ذکر سجزی سے کیا اور دونوں میں یہ بات طے پاگئی کہ ان دشواریوں کے حل کے لئے استاذ ابن عراق سے رجوع کیا جائے۔ اس طرح سجزی کو اس دشوار گذار مرحلہ میں جو مشکلیں پیش آئی تھیں وہ سوالات کی شکل میں البیرونی کی وساطت سے ابن عراق کو موصول ہوئیں انھیں مشکلات کے حل میں ابن عراق نے کتاب السموت تالیف کی۔ چونکہ اس کتاب میں مخصوص و متعین سوالات کو حل کرنا تھا لہذا اصل سوالوں اور ان سے متعلق جملہ نکات و مقررہ شرائط و حدود کی پابندی و رعایت ناگزیر تھی۔ اسی بناء پر کتاب السموت میں قدما کے مقررہ اصول و قوانین پر رہ کر سوالات حل کئے گئے اور شکل قطاع کا استعمال بدستور کیا گیا۔ تاہم اسی کتاب میں ابن عراق کے قلم سے دو ایسی شکلیں دائرۂ تقنید میں آگئی تھیں جو شکل مغنی کی طرف صاف رہنمائی کرتی تھیں اور شکل قطاع سے بے نیاز کر دیتی تھیں گویا کتاب السموت ہی میں ابن عراق نے اس قانون کا ذکر پہلی دفعہ کیا جو بعد میں شکل مغنی کے لقب سے مشہور ہوا۔

البیرونی اپنے کمال فن کی بناء پر آغاز شباب ہی سے پختہ کار و سن رسیدہ فضلائے وقت کے دوش بدوش نظر آتا ہے مشاہیر عہد سے اس کے گہرے روابط قائم رہے ہیں ابو سعید سجزی سے اس کے تعلق پر مذکورہ واقعہ سے جو روشنی پڑتی ہے وہ ظاہر ہے اس کے علاوہ الآثار الباقیہ اور علی الخصوص استیعاب الوجوہ کی عبارتیں دونوں کی ہم آہنگی کو خوب جلا دیتی ہیں مشہور علامۂ ہیئت ابوالوفاء البوزجانی سے بھی البیرونی کو علمی بحث و تحقیق کے سلسلہ میں زبردست تعلق تھا گو کہ ابوالوفاء سے اس کی ملاقات ثابت نہیں لیکن جانبین میں خط و کتابت کی شہادت خود البیرونی کی زبانی ملتی ہے ابن عراق کی کتاب السموت کی اطلاع کسی طرح ابوالوفاء کو دارالسلام (بغداد) میں ملی تو اس نے اس کتاب کے سلسلہ میں بیرونی کو لکھا اور اس نے استاذ ابن عراق کی تالیف ابوالوفاء

برہان

جلد ۳۴ — شمارہ نمبر ۴

اپریل ۱۹۵۵ء مطابق شعبان المعظم ۱۳۷۴ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

آہ! الاستاذ الاجل

۸ مارچ کے اخبار الجمعیۃ میں جب یہ خبر نظر سے گذری کہ حضرت الاستاذ مولانا محمد اعزاز علی صاحب پر قلب کا دورہ پڑ گیا اور اس کی وجہ سے کچھ بے ہوشی رہی اور اب تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد دورے پڑ رہے ہیں تو اسی وقت ماتھا ٹھنکا کہ خدا خیر کرے۔ چٹان جب گرتی ہے تو مٹی کے تودہ کی طرح رس رس کے نہیں اچانک ہی گرتی ہے۔ چنانچہ دوسرے دن کا اخبار آیا تو دل کے دغدغہ کی تصدیق ہو گئی اور جس خبر وحشت اثر کو سننے کے لئے کان تیار نہ تھے اس کا یقین کرنا پڑا۔ یعنی حضرت الاستاذ راہی ملک بقا ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

دار العلوم دیوبند شروع سے معدنِ لعل و گہر رہا ہے۔ کتنے ہی ذرے اس کی آغوش میں پلے اور بڑھے اور علم و فضل کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے۔ کتنے چاند اور ستارے اس کے آسمان پر طلوع ہوئے اور اپنی روشنی دکھا کر اسی دار العلوم کے دامن میں روپوش ہو گئے کیسے کیسے گہر ہائے آبدار اس کی خاکِ پاک سے اٹھے اور علم و عمل۔ تقویٰ و طہارت اور زہد و ورع کی بزم قدس کو جگمگا کر پھر خاکِ لحد میں جا ملے۔ آج وہ نہیں ہیں لیکن ان کی یادگاریں باقی ہیں خود ان کا وجود فنا ہو گیا لیکن ان کے کارنامے زندہ ہیں اور وہ گویا خود زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں۔

تلک آثارنا تدل علینا　　فانظروا بعدنا الی الآثار

دار العلوم دیوبند اگر شاندار عمارتوں۔ درسگاہوں۔ اقامت خانوں اور وسیع و فراخ دروازوں اور اونچی اونچی دیواروں کا نام نہیں بلکہ درحقیقت وہ انھیں نفوس قدسیہ کا ایک پیکر محسوس اور انھیں ارواح طیبہ کا ایک مظہر مادی و جسمانی ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ حضرت الاستاذ اس عمارت کے ایک اہم ستون اور اس بزم انس و قدس کے ایک لعل شب چراغ تھے۔ گذشتہ

نصف صدی میں اس درسگاہ کو تعلیم و تعلم کے اعتبار سے جو شہرت و عظمت حاصل رہی ہے اس میں ایک بڑا حصہ حضرت مرحوم کا تھا۔

مولانا مرحوم علم و عمل۔ اخلاق و فضائل اور مکارم و شمائل کے لحاظ سے محاسن و محامد کا ایک گلدستۂ صد رنگ تھے۔ لیکن آپ کا سب سے نمایاں وصف و امتیاز جس میں کوئی ہم عصر شریک نہیں ہو سکتا تھا وہ یہ تھا کہ آپ "مثالی استاذ" تھے۔ وقت کی پابندی کا یہ عالم نہ کہیں دیکھا نہ سنا کہ گھنٹہ ابھی بجا ہی ہے کہ مولانا درس گاہ میں موجود ہیں۔ نہ ایک منٹ ادھر نہ ایک منٹ اُدھر، پھر جب تک درس گاہ میں ہیں کیا مجال کہ سوائے درس کے کوئی دوسری بات یا کوئی اور کام تو کریں، مسلسل پانچ پانچ اور چھ چھ گھنٹے سبق پڑھا رہے ہیں اور باضابطگی و باقاعدگی کی کیفیت یہ ہے کہ نہ ایک سبق کے گھنٹہ کا مداخل دوسرے سبق کے گھنٹہ میں ہوتا ہے نہ نشست بدلتی ہے نہ ٹیک لگاتے ہیں، نہ پان ہے نہ پانی، نہ ادھر اودھر کی کوئی بات طالب علم نے عبارت پڑھی اور تقریر شروع ہو گئی۔ عبارت پڑھنے میں اگر طالب علم نے غلطی کی ہے یا دوران تقریر میں وہ بے توجہی کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہے تو البتہ درس کے ساتھ ساتھ دو چار کلمات زجر و توبیخ کے اور دو چار لفظ نصیحت و تعبیر کے ضرور فرما دیتے ہیں۔ گھنٹہ جونہی بجا اور اس کے بعد اب کوئی دوسرا سبق نہیں ہے تو سیدھے کتاب اٹھا اپنے کمرہ میں تشریف لے گئے بظاہر دیکھنے میں ایسے خشک کہ درس کے درمیان شاید ہی کبھی کسی نے انھیں ہنستا دیکھا ہو، دیر آمیز اور کم آمیز اتنے کہ طالب علم کے ساتھ بے تکلف ہونا تو جانتے ہی نہ تھے۔ لیکن در حقیقت بے حد شفیق اور حد درجہ غمگسار تھے، جس طالب علم کو شوقین، ذہین اور محنتی پاتے تھے۔ دل و جان سے اس کی خدمت کر کے خوشی محسوس کرتے تھے، خارج اوقات میں بھی اسے پڑھاتے، چھٹی کے دن بھی درس دیتے گویا ان کا بس نہ تھا کہ علم و فن کے نکات کسی طرح اسے گھول کر پلا دیں پھر اپنے کام سے کام تھا نہ کسی سے کوئی غرض نہ واسطہ نہ اعزاز کی آرزو، نہ زیادہ تنخواہ کی طلب، ہمیشہ درویشانہ اور فقیرانہ زندگی بسر کی دن اور رات کا ایک ایک لمحہ علم اور دین اور طلبا کی خدمت کے لئے وقف تھا۔ درس و تدریس کی ذمہ داری کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے کبھی بغیر مطالعہ کے درس نہیں دیا درس کے علاوہ تصنیف و تالیف اور تحشیہ و تشریح کا کام بھی برابر کرتے رہتے تھے چنانچہ آج کون ایسا عربی کا طالب علم یا استاذ ہے جس نے دیوان متنبی اور دیوان حماسہ پر مولانا کے حواشی اور ان کے مقدمات نہ پڑھے ہوں۔

مولانا کی شہرت کا آغاز بحیثیت عربی زبان کے ادیب کے ہوا۔ مفردات پر غیر معمولی عبور تھا، علم معانی و بیان۔ عروض و صرف و نحو اور لغت یہ مولانا کے خاص فنون تھے۔ دیوان حماسہ یا مقامات حریری

پڑھاتے وقت جب ان علوم کے مسائل پر تقریر کرتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے جو اپنی موجیں چاروں طرف پھیلاتا ہوا امڈا چلا آرہا ہے اور جتنا وہ آگے بڑھتا ہے اس کی روانی اسی قدر تیز ہوتی جاتی ہے بعد میں فقہ کی طرف توجہ کی اور مسند افتا کی ذمہ داری بھی آپ کے ہی سپرد ہوئی تو اس میں بھی اپنا وہ رنگ دکھایا اور جمایا کہ شیخ الادب کی طرح شیخ الفقہ بھی ہو گئے، مولانا کا دارالعلوم سے تدریسی تعلق کم و بیش نصف صدی رہا۔ اس مدت میں دارالعلوم میں بڑے بڑے انقلابات رونما ہوئے۔ لیکن مولانا کا جس سے جو تعلق تھا سر مو اس میں فرق نہیں آیا اور وہ اپنے مشاغلِ یومیہ میں کچھ اس طرح مصروف رہے کہ گویا انھیں خبر نہ تھی کہ ان کی درس گاہ اور کمرہ سے باہر کیا ہو رہا ہے۔ فروتنی اور انکساری اس غضب کی کہ اپنے خدامانِ خدام سے بھی اس طرح ملتے کہ گویا وہ خود خادم ہیں اور خادم مخدوم! ادھر کئی سال سے انابت الی اللہ کا غلبہ ہو گیا تھا۔ مگر اس حالت میں بھی درس و مطالعہ کے معمولات میں فرق نہیں آنے دیا۔ انھیں دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ قدرت نے کام کرنے اور جفاکشی کی کس قدر غیر معمولی اور حیرت انگیز صلاحیت دکھی ہے، اخیر عمر میں بہت ضعیف اور کمزور ہو گئے تھے دو قدم چلنے میں سانس پھول جاتا تھا اور ہمارے قومی ادارے تو پنشن کے مفہوم و معنی سے ہی نا آشنا ہیں اس لئے اس ضعف اور کمزوری اور درازی سن کے باوجود مولانا اسی طرح اپنے فرائض منصبی انجام دیتے تھے

طبیعت کے حد درجہ مرنج و مرنجان تھے۔ باتیں کم کرتے تھے۔ مگر کسی مشورہ کے وقت جب کبھی کوئی بات کہتے تھے تو پوری قوت کے ساتھ اور جما کر کہتے تھے۔ مزاج میں شرم و حیا اس قدر رچی اور بسی ہوئی تھی کہ اکثر درس میں بھی نگاہ نیچی رکھتے تھے تہذیب اور شائستگی کا یہ عالم تھا کہ بے تکلف سے بے تکلف مجمعِ احباب میں بھی کبھی کوئی نامناسب لفظ زبان پر نہیں آتا تھا چھوٹے بچوں اور طالب علموں کو بھی تم نہ کہتے۔ آپ سے خطاب کرتے تھے پھر ساتھ ہی نہایت بیدار مغز اور روشن خیال تھے۔ اخبارات کا مطالعہ پابندی سے کرتے تھے اور عالم اسلام کے حالات و کوائف سے پورے باخبر رہتے تھے۔ "برہان" کے شروع سے مستقل خریدار تھے اور اس کے نظرات سے لے کر تبصروں تک ایک ایک لفظ پابندی کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اور جب کبھی کہیں کسی جگہ ایک لفظ بھی نامناسب نظر آیا فوراً خط لکھ کر اس پر متنبہ فرماتے تھے۔

پانچ سال کے بعد اسی سال کی ۸ر جنوری کو بمبئی میں ملاقات ہوئی تو فرطِ شفقت و محبت سے فوراً سینہ سے لگا لیا اور پھر شکایت کی کہ آپ نے تو دیوبند کو بالکل ہی بھلا دیا۔ اب ادھر آتے بھی نہیں میں نے اپنی مجبوریوں کا ذکر کیا۔ آہ کیا خبر تھی کہ بس زندگی میں یہ آخری ملاقات ہے اور اب اس کے بعد یہ شفقت

کائنات سے استفادے کے حدود

از

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی)

کس کے لئے؟ کے سوال کو عنوان بنا کر اب تک آپ کے سامنے انسانی زندگی کے دونوں خود ساختہ اور خود بافتہ طریقوں یعنی مادیت (میٹرلزم) اور روحانیت (اسپرچولزم) کے غیر عقلی اور غیر فطری نظریات و مسالک کے مقابلہ میں، اس

"قدرتی اساس حیات"

کو پیش کیا گیا ہے، جس کی پابندی کا مطالبہ خالق عالم کی طرف سے حضرات انبیاء و رسل علیہم السلام کے ذریعہ کیا گیا ہے، اسی کی تعبیر اسلامیت (اسلامزم) کے لفظ سے کر کے میں نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ شکوک و شبہات کی آلودگیوں سے صاف و پاک ہو کر اپنی مکمل ترین شکل میں

"الاسلام"

کے نام سے یہی "قدرتی اساس حیات"، ہمارے پاس موجود ہے یہ انبیاء و رسل علیہم السلام کے خاتم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری پیغام اور ان کی ہمہ گیر ہر جہتی زندگی ہے" بتا چکا ہوں کہ ایمان کا یہ ایک ایسا مکمل دائرہ ہے جس میں کہیں خلا نہیں ہے جس کا اول آخر سے قطعی طور پر مربوط ہے عقل وجدان حاسہ اخلاقی ضمیر انسانی آدمی کے ان سارے جبلی اقتضاؤں کی تشفی و تسکین کی بہترین ضمانت زندگی کے اسی نظام میں محفوظ ہے اس وقت تک اسی اسلامی نظام کا اجمالی خاکہ

---

[1] مقالہ نگار کی طویل علالت کی وجہ سے مضمون کا سلسلہ آئندہ جاری نہ رہ سکا، کافی وقفہ حائل ہو چکا ہے معلومات کو تازہ کرنے کے لئے اب تک جو کچھ عرض کیا گیا تھا اسی کا خلاصہ درج کر دیا گیا ہے اصل مضمون ان ذیلی سطروں کے بعد شروع ہوتا ہے ۱۲

آپ کے سامنے رکھا گیا تھا، اب اسی اجمالی خاکہ کے ہر ہر جزء کے اہم امتیازی پہلوؤں پر الگ الگ مستقل عنوانوں کے تحت انشاء اللہ تعالیٰ بحث کی جائے گی۔ واللہ ولی الامر والتوفیق

(مناظر احسن گیلانی)

عرض کر چکا ہوں کہ

"آدمی کو خالقِ کردگار نے خود اپنے لئے پیدا کیا ہے"

یعنی نبوات و رسالات کا متفقہ اجماعی کلمہ دعوت

یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ای قوم بندگی کرو اللہ کی تمہارے لئے نہیں کوئی معبود اس کے سوا

کا جو حاصل اور خلاصہ ہے، اسی کو "بنیادی محور" قرار دے کر زندگی کے اس طریقہ میں جس کا نام "الاسلام" ہے، ایک طرف تو اس کا اعلان کیا گیا کہ کائنات یعنی خدا کی مخلوقات سے استفادہ و تمتع، اسی بناء پر آدمی کا جائز پیدائشی اور آئینی حق ہے اور دوسری طرف "انسانیت" کے احترام و اکرام کا بھی آدمی اسی لئے ذمہ دار ٹھہرایا گیا، کہ جو خالق کے لئے پیدا کیا گیا ہے مخلوقات میں بھلا اس سے بڑا اور کون ہو سکتا ہے، انسانی وجود کے احترام و اکرام کے سلسلہ میں فرائض کی ایک طویل فہرست بن گئی یعنی ہم میں ہر ایک پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ ممکنہ حد تک مضرتوں سے بچاتے ہوئے چاہئے کہ اپنے آپ کو خود اپنے لئے بھی اپنے خاندان کے لئے بھی اور ان لوگوں کے لئے مفید ثابت کرے جن میں وہ بود و باش اختیار کرتا رہتا "سہتا جیتا مرتا" ہے اور ساری انسانی برادری جو کرۂ زمین کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کے فلاح و بہبود کو بھی اپنی زندگی کے اصلاحی نصب العین میں شریک کرتے ہوئے آئندہ پیدا ہونے والی نسلوں کے لئے بھی جس حد تک ممکن ہو نفع رسانیوں، اور سہولت آفرینیوں کی راہوں کو چاہئے کہ لوگ ہموار اور درست کرتے چلے جائیں، اور یوں شخصی فرائض، خاندانی فرائض، قومی فرائض، عام انسانی فرائض، نسلی فرائض کے ابواب اسلامی نظامِ حیات میں پیدا ہوئے جن میں ہر ہر باب اپنے اندر بے شمار مسائل کو سمیٹے ہوتے ہے۔

اس سلسلہ میں ارادہ یہی ہے خدا ہی جانتا ہے کہ یہ ارادہ پورا بھی ہوگا یا نہیں اور ہوگا بھی تو کب تک پورا ہوگا، بہر حال اسی کے بھروسے پر ارادہ کیا گیا ہے کہ سب سے پہلے اس قدرتی اور پیدائشی حق کے حدود متعین کئے جائیں جو کائنات سے استفادے کے سلسلہ میں بنی آدم کو عطا ہوا ہے، حق کے بعد ان فرائض پر بحث کی جائے گی، جن کے ہم ذمہ دار ٹھہرائے گئے ہیں، یعنی سلسلہ وار شخصی فرائض، خاندانی فرائض، قومی فرائض، عام انسانی فرائض، نسلی فرائض پر بحث کرنے کے بعد آخر میں اس

"کلیدی فرض"

کے اجمال کی تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ کی جائے گی، جس کے بغیر نہ کائنات سے استفادہ کا حق ہی ہمارا پیدائشی جائز آئینی حق باقی رہتا ہے اور "انسانی وجود" کے احترام و اکرام کے سلسلہ میں ہم پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں وہ بھی اپنی معنویت کھو بیٹھتے ہیں۔ اور منطقی روح کی نسبت باہی سے محروم ہو کر صرف قالب بے جان بن کر رہ جاتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ آدمی خدا کے لئے ہے؟ اسی مسئلہ پر بحث کر کے انشاء اللہ مضمون کہئے یا کتاب ختم کر دی جائے گی۔ اگرچہ اس مسئلہ کے بعض پہلوؤں پر تھوڑی بہت گفتگو کر بھی چکا ہوں لیکن اب تک جو کچھ بھی کہا گیا ہے سب کی حیثیت اجمالی مباحث ہی کی تھی، حقیقی تفصیل مسئلہ کی ہنوز تشنہ تفصیل ہے، چونکہ اسلامی دستورِ حیات کے قالب کی روح بھی مسئلہ ہے سارا نظام ہی اسلامی زندگی کا اسی محور پر گھومتا ہے۔ یہ ہے تو سب کچھ ہے حق بھی ہے اور فرض بھی ہے۔ اور یہ نہیں ہے تو آدمی کا حق اور آدمی کا فرض دونوں کے دونوں لغو بے معنی باتیں بن کر رہ جاتی ہیں۔ آخر آپ خود سوچئے آدمی کو خالق کائنات نے خود اپنے لئے پیدا کیا ہے انسانی وجود کے اسی خصوصی پہلو سے قطع نظر کر لینے کے بعد کیا کوئی معقول جواب اس سوال کا آپ دے سکتے ہیں کہ درخت ہی آدمی کے لئے کیوں کاٹے جاتے ہیں، آدمی ہی درخت کے لئے کیوں نہ کاٹے جائیں، پھولوں کو ان کی شاخوں سے آدمی کے لئے جدا کیا جاتا ہے آخر آدمی کے

بچوں کو پھولوں پر نچھاور کرنے کے لئے ماؤں کی گودوں سے کیوں نہ چھینا جائے۔ الغرض کائنات سے استفادہ، اس کو آدمی کا جو آپ آئینی جائز حق باور کئے بیٹھے ہیں کوئی صحیح معقول منطقی توجیہ اپنے اس وجدانی احساس کی آپ ہی نہیں بلکہ چیلنج کرتا ہوں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا مفکر بھی پیش نہیں کر سکتا اسی طرح سارے فرائض اور ذمہ داریاں جو انسانی وجود کے احترامی پہلوؤں کے ساتھ وابستہ ہیں، یہ مان لینے کے بعد کہ آدمی بھی زمین پر دوسرے رینگنے والے کیڑوں مکوڑوں، اور چلنے پھرنے والے چرندوں درندوں ہی جیسی ہستیوں میں ایک عام معمولی ہستی ہے انصاف سے پوچھتا ہوں بنی آدم کے احترامی فرائض کا کچھ بھی وزن اس احساس کے بعد باقی رہ جاتا ہے ایک مچھر ایک مکھی جیسے مسلی اور کچلی جاتی ہے اور کوئی نہیں پوچھتا کہ ایسا کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ اور آئندہ اس کے سدباب کی کیا صورت ہے؟ کیا بجنسہ آدمی بھی خدا سے کٹ جانے کے بعد مچھروں اور مکھیوں کے اسی مقام تک اتر کر نہیں پہنچ جاتا ہے، ایک کتا، ایک بکرا، بیل گھوڑا یقیناً وہی سب کچھ تو اپنے پاس رکھتا ہے جو آدمی کے پاس ہے وہی دو۲ آنکھیں دو۲ کان، ایک منہ ایک زبان وہی پیٹ، وہی جگر، وہی پھیپھڑے، وہی رگیں، وہی پٹھے، وہی خون، وہی گوشت، وہی چربی الغرض وہ سب کچھ ان غریبوں کو بھی ملا ہے جس سے آدمی سرفراز ہے پھر غریب کتے کیوں در در سے دھتکارے جاتے ہیں، اور حضرت انسان کو دیکھ کر بے تحاشا آپ تعظیم کے لئے سر و قد کیوں کھڑے ہو جاتے ہیں، بار بار کہتا چلا آرہا ہوں، کہ کبوتر کا یہی وہ پیر ہے، جس میں دلبر کا نامہ بندھا ہوا ہے قرآن کے پڑھنے والوں کو حیرانی ہوتی ہے ان کا دل پوچھتا ہے کہ اول سے آخر تک اسی مسئلہ کو یعنی آدمی کو خدا نے صرف اپنے لئے پیدا کیا ہے؟ اسی کو بیان کے مختلف پیرایوں میں وہ کیوں گردش دیتا ہے ہر پھر کر اسی مسئلہ پر کیوں اپنے بیان کو ختم کرتا ہے سچ تو یہ ہے کہ نہ سوچنے والے اس مغالطہ میں اگر مبتلا ہو جائیں کہ اس مسئلہ کے سوا قرآن شاید کچھ اور کہنا ہی نہیں چاہتا تو سطحی تلاوت کے اس نتیجہ پر تعجب بھی نہ ہونا چاہئے وجہ اس کی وہی ہے کہ دوسرے مسائل جن کا قرآن میں ذکر کیا گیا ہے ان کے مقابلہ میں اس مسئلہ کی حیثیت وہی ہے جو روح کی حیثیت جسمانی ہیکل کے ساتھ ہے

بقول امام غزالی گھوڑے کی یہ تعریف کہ وہ سمند بھی ہے، پنج کلیان بھی ہے اور سیاہ زانو بھی ہے یقیناً یہ تعریف اس وقت بے معنی تعریف بن کر رہ جائے گی، اگر اسی کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا جائے کہ

"لیکن گھوڑا مرا ہوا ہے"

اسی طرح آدمی کائنات سے استفادے کے حق کو جس پیمانے پر بھی حاصل کر رہا ہو اور انسانی وجود کے متعلق احترامی واکرامی فرائض جو آدمی پر عائد ہوتے ہوں ان کی تکمیل میں انتہائی ذمہ داریوں ہی سے کیوں کام نہ لے رہا ہو۔ لیکن اس حق اور ان فرائض کی بُنیاد جس مسئلہ پر قایم ہے، اس سے اگر لاپروائی اختیار کئے ہو تو یقیناً ایسا آدمی بھی وہی مرا ہوا گھوڑا ہے، جو سمند بھی تھا اور پنج کلیان، سیاہ زانو بھی تھا لیکن مرا ہوا تھا، بلکہ اپنے حق کی بُنیاد سے بیگانہ ہو جانے کے بعد بھی جو خدا کی پیدا کی ہوئی دنیا سے مستفید ہو رہے ہیں، اور باور کئے بیٹھے ہیں کہ کائنات سے استفادہ ان کا قدرتی اور پیدائشی حق ہے، سچ پوچھئے نمک حرامی کے جرم کی یہ انتہائی بدنجانہ شکل ہو گی۔

لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ سارے جرائم میں سب سے بڑا جرم یا "مہاپاپ" قرآن ان لوگوں کے طرزِ عمل کو کیوں قرار دیتا ہے جو اس مسئلہ کا یعنی آدمی کو خدا نے صرف اپنے لئے پیدا کیا ہے اس کا انکار کر کے دوسروں کو بھی آدمی میں خدا کا ساجھی اور شریک ٹھہراتے ہیں، حالانکہ سوچا جائے تو اس فیصلہ کے سوا کسی دوسرے فیصلہ کی گنجائش ہی کیا تھی؟ آدمی صرف خدا کے لئے پیدا ہوا ہے اس کا انکار صرف اسی مسئلہ ہی کا انکار تو نہیں ہے آپ دیکھ رہے ہیں یہ تو بنی نوع انسانی کے سارے حقوق اور سارے انسانی فرائض کا انکار ہے، ان حقوق اور فرائض کی اساسی بنیاد ہی کا یہ انکار ہے، انسانی زندگی کا جو "قدرتی نظام" ہے اس مسئلہ کے انکار کے ساتھ ہی درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔

خیر میں کیا کہنے لگا، اس سلسلہ میں پہلے بھی بہت کچھ کہہ چکا ہوں، بات جب سامنے آجاتی ہے تو قلم بے اختیار ہو جاتا ہے ورنہ مطلب تو یہ تھا کہ آئندہ جس ترتیب سے بحث ہونے والی ہے پڑھنے والوں کے سامنے بھی اس ترتیب کا نقشہ پیش کر دیا جائے۔

کائنات سے استفادہ اور تمتع کا قدرتی استحقاق آدمی کو جو حاصل ہے آیئے، اس مسئلہ کے متعلقہ پہلوؤں پر پہلے ہم غور کرلیں واقعہ تو یہ ہے کہ "نبوات و رسالات" کی تاریخ کا جو قیمتی حصہ قرآن میں محفوظ کر دیا گیا ہے، اگر اس کو پیشِ نظر رکھ کر سوچا جائے - تو یہ کہا جا سکتا ہے -

کہ کائنات سے استفادے کا "پروانہ" بنی آدم کے گھرانوں میں خالقِ کائنات کی طرف اس کے برگزیدہ راستباز نمایندے (انبیاء و رسل علیہم السلام) ہر زمانہ میں تقسیم کرتے چلے آتے ہیں -

یجعل لکم جنٰت ویجعل لکم انھارا　　خداوند خدا تمہارے لئے باغوں کو تیار کرے گا

(نوح)　　اور نہریں بھی تمہارے لئے بنائے گا،

کے الفاظ ہم ابو الانبیاء نوح علیہ السلام کے مواعظ میں اگر پاتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ زمین کی نباتاتی پیداواروں اور کھیتوں کو سرسبز و شاداب رکھنے والی نہروں سے استفادے کی صرف اجازت ہی عہد نوح کے لوگوں کو نہیں دی گئی تھی، بلکہ ان نعمتوں سے بہرہ اندوز ہونے کا خدا موقع دے گا، اس وعدے کا اعلان بھی خدا ہی کی طرف سے حضرت نوح علیہ السلام ان لوگوں میں فرما رہے تھے جن کی طرف وہ مبعوث تھے، فقط زمین ہی نہیں بلکہ آسمان کی نورانی ہستیوں (آفتاب و ماہتاب) سے جو منافع آدمی کو حاصل ہو رہے ہیں ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسی "نوحی خطبہ" میں ان الفاظ کو بھی ہمیں ملتے ہیں یعنی

الم تروا کیف خلق اللہ سبع سمٰوٰت　　کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے تہ بہ تہ ساتوں آسمانوں

طباقا وجعل القمر فیھن نورا وجعل　　کو کیسے پیدا کیا اور ان میں چاند کو روشن کیا، اور

الشمس سراجا　(نوح)　　سورج کو چراغ بنایا

ایک طرف نوح علیہ السلام کی تقریروں میں ہم مذکورہ بالا باتوں کو پاتے ہیں، تو دوسری طرف ہود پیغمبر علیہ السلام کو دیکھتے ہیں کہ اپنی قوم عاد کو مخاطب بنا کر فرما رہے ہیں کہ

واتقوا الذی امدکم بما تعلمون　　ڈرو! اس خدا سے جس نے تمہاری امداد ان چیزوں سے کی

امدکم بانعام وبنین وجنات وعیون　　جنہیں تم خود جانتے ہو، اس نے تمہاری مدد
(الشعراء)

مویشیوں سے کی، اور نرینہ اولاد سے کی، باغوں
سے کی اور چشموں سے کی،

جس سے معلوم ہوا کہ "انعام" یعنی جان رکھنے والے مویشیوں (بھیڑ بکری گائے بیل بھینس اونٹ وغیرہ) کی خدمات سے استفادے کو حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم کے لوگوں کا پیدائشی حق اور خداداد امداد و اعانت قرار دیتے تھے۔

اور یہی کیا، آپ قرآن کو کھولئے، اور ان خطبات و مواعظ کلجو اس کتاب میں گذشتہ پیغمبروں کی طرف منسوب کئے گئے ہیں مطالعہ کیجئے "

جو کچھ میں نے عرض کیا اس کی تائیدی شہادتیں آپ کو ملتی چلی جائیں گی۔ اور گو خاص تاریخی اسباب و وجوہ کے زیر اثر قرآن کے سوا ان کتابوں کی صحت کی ذمہ داری نہیں لی جا سکتی، جو دنیا کے مختلف مذہبی پیشواؤں اور دینی منادیوں کی طرف اس زمانہ میں منسوب ہیں، لیکن با ایں ہمہ جس شکل میں بھی ہو، نسلِ انسانی کے پہلے جوڑے (آدم و حوا علیہما السلام) کا ذکر کرتے ہوئے تورات کی کتاب پیدائش میں اس بیان کے سلسلہ میں یعنی

" خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا، خدا کی صورت پر اس کو پیدا کیا، نر و ناری (مرد و عورت) ان کو پیدا کیا اور خدا نے ان کو برکت دی، اور کہا کہ پھلو اور بڑھو، اور زمین کو معمور و محکوم کرو "

اس بیان کے اخیر میں بھی ان الفاظ کو پاتے ہیں کہ انسان سے کہا گیا

" سمندر کی مچھلیوں، اور ہوا کے پرندوں اور کل جانوروں پر جو زمین پر چلتے ہیں اختیار رکھو "

اور پہلے بھی تقریباً ان ہی الفاظ سے قصہ شروع بھی ہوا ہے لکھا ہے کہ خدا نے کہا

" اور وہ (انسان) سمندر کی مچھلیوں اور آسمان کے پرندوں اور چوپاؤں اور تمام زمین اور سب جانداروں پر جو زمین پر رینگتے ہیں، اختیار رکھیں " (پیدائش باب ۱)

اگر واقعی یہ خدائی الفاظ ہیں، تو کائنات سے استفادے کا شاید اسے ہم

پہلا خدائی منشور (چارٹر)

قرار دے سکتے ہیں، جو آدم اور آدم کی اولاد کو خالقِ کائنات کی طرف سے عطا کیا گیا، سچ پوچھئے

تو تورات کے مذکورہ بالا الفاظ قرآنی آیت

انی جاعل فی الارض خلیفہ   میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں

کے جامع مانع اجمالی الفاظ ہی کی گونہ یہ تفسیر ہے جس پر کافی بحث ہو چکی ہے اور ایک قرآن ہی

کیا، دنیا کے عام مذاہب و ادیان کی بنیادی کتابوں میں اگر ڈھونڈا جائے تو کسی نہ کسی شکل میں اسی

سب سے پہلے

آسمانی منشور، اور خدائی چارٹر

کو ڈھونڈھنے والے پا سکتے ہیں، چاہئے تو یہی تھا کہ کائنات سے استفادہ کا مسئلہ بنی آدم کے لئے

اس کے بعد ہر قسم کے شکوک و شبہات، ہچکچاہٹ اور جھجک سے پاک ہو کر سامنے آ جاتا، اُف

ہزارہا سال تک ذہنی کش مکش کی الجھنوں میں اپنے خود آفریدہ غلط نقاطِ نظر کی بدولت آدم کی اولاد

جو تڑپتی اور پھڑکتی رہی، اس "لاہوتی منشور" اور "آسمانی چارٹر" کا تقاضا تو یہی تھا کہ آدمی کو

ان ذہنی بےچینیوں کی ہوا بھی نہ چھوتی - مرا مطلب یہ ہے کہ دنیا بیزار رجحانات کی حوصلہ افزائیاں

روحانیت (اسپریچولزم) کے رعب انگیز نام سے دنیا کی قوموں میں ہوتی رہیں بجائے بھوگنے کے

سمجھانے والے یہی سمجھاتے رہے کہ آدمی کے سامنے یہ دنیا بھاگنے صرف بھاگنے ہی کے لئے پھیلائی

گئی ہے اسی بنیاد پر کائنات سے استفادہ نہیں، بلکہ استعاذہ اسی کو آدمی کا سب سے بڑا مذہبی

وظیفہ اور دینی فریضہ قرار دے دیا گیا،

آدمی، غریب آدمی جس کا بال بال، رواں رواں کائناتی حقائق سے بندھا ہوا ہے، اپنی

اپنی ایک ایک سانس میں دنیاوی امداد کا جو محتاج بنا کر پیدا کیا گیا ہے اسی بے کس پر یہ کتنا بڑا ظلم

تھا، جب کہا جاتا تھا کہ اسی دنیا سے بے تعلق ہو کر جینے کی مشق کو بہم پہونچاتے، اتنا غوغا

اتنا شور اور ہنگامہ برپا کیا گیا کہ دنیا سے بے تعلق ہو جانے کا غیر فطری نصب العین تو کیا پورا ہوتا

لیکن بین الاقوامی طور پر شاید یہ تسلیم کر لیا گیا کہ انسانیت کا بلند ترین نصب العین اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ روحانیت ہی ہے، باور کر لیا گیا کہ آدمی کی صحیح معیاری زندگی وہی ہو سکتی ہے جو دنیا سے بے زاری کے زیر اثر گذری ہو، آپ اندازہ کر سکتے ہیں اس ذہنی کوفت، اور دماغی لکد کوب کی تلخیوں کا جن سے اس راہ میں آدم کی اولاد کو گذرنا پڑا دنیا اور دنیا کی جن پیداوار وں کے محتاج بنا کر جو پیدا کئے گئے تھے عملاً وہ ان چیزوں سے نہ الگ ہوئے نہ الگ ہو سکتے تھے، لیکن جیتے جی یہی سوچتے رہے کہ کاش! دنیا سے ان کا یہ اختصاصی رشتہ ٹوٹ جاتا وہ خدا کی پیدا کی ہوئی نعمتوں کو کھاتے بھی جاتے تھے لیکن اسی کے ساتھ مسلسل یہ سوچتے بھی جاتے تھے کہ کاش ہم ان کو نہ چکھتے، کہتے ہیں کھانے میں ریت ملا کر اور ٹھنڈے پانی کو گرم کرنے کا مشغلہ روحانی مشغلہ قرار دیا گیا تھا، ذہنی احساسات کے متضاد قطعاً متضاد و متصادم اس قسم کی عملی زندگی آدمی کو جن فکری ہیجانوں میں مبتلا کر سکتی تھی، ان ہی کے شکار لوگ ہوتے رہے جس کے بچے کھچے آثار اگر دیکھا جائے تو کسی نہ کسی رنگ میں آج بھی باقی ہیں۔

اسی طرح مادیت کا وہ قدیم ادہامی چولا جس کا نام "مخلوق پرستی" ہے یعنی نفع اور ضرر کے تعلق سے خدا کی پیدا کی ہوئی مخلوقوں کی پوجا کا رواج، جن قوموں اور نسلوں میں ہوا یا اس وقت تک مادیت کی اس پرانی فرسودہ شکل پر ایک طبقہ اس لئے اصرار ہی کئے چلا جا رہا ہے کہ اس کے باپ دادوں کا طریقہ یعنی قومی کلچر ہے، یورپ کی جدید ذہنیت کا یہ نیا تحفہ ہے کہ "کلچر" کے لفافے میں جس رواج اور جس طریقہ کو بھی چاہا جائے خم ٹھونک کر باقی رکھنے پر اصرار آدمی کا منطقی اصرار ہے بہر حال بے چارے مخلوق پرست ایک طرف تو ان چیزوں کو اپنا مخدوم و معبود بنا کر پوجتے بھی رہے، اور دوسری طرف اپنے ان ہی معبودوں اور مخدوموں کے خدمات سے استفادہ بھی کرتے رہے وہ ان جانوروں کے آگے ماتھے بھی ٹیکتے رہے جن میں نفع رسانی کا کوئی پہلو پایا جاتا تھا، اور ان ہی کے کندھوں پر ہل رکھ کر اپنے کھیتوں کو جوتتے بھی رہے، گاڑیوں میں باندھ کر ان کو ہنکاتے بھی رہے، کوڑوں سے ان کو پیٹتے بھی رہے، لوہے کی کیلوں سے ان کے جسم میں چھید

بھی کرتے رہے، الغرض ایک ہی چیز کو مخدوم کے ساتھ خادم، یا معبود کے ساتھ اپنا عابد بنا لینا، یہ حرکت ہی ایسی ہے کہ کرنے کی حد تک لوگ اسے لاکھ کرتے رہے، لیکن باہر کا یہ عجیب و غریب متناقض طرز عمل ناممکن ہے کہ آدمی کے اندر ردِ عمل کی تلخیوں کو نہ پیدا کرے۔ لوگ عرب کے اس جاہل بت پرست کے قصے کو تعجب سے سنتے ہیں جو کھجوروں سے بنائے ہوئے بت کو پوجا کرتا تھا، مگر قحط کی مصیبت میں جب مبتلا ہوا، تو اپنے اسی معبود کو شدتِ گرسنگی میں دینی بد دبے چارچٹ بھی کر گیا، میں پوچھتا ہوں کہ یہ قصہ اسی جاہل بت پرست بدو کی حد تک کیا محدود ہے؟

آخر زندگی کی ضروریات میں ہر ہر قدم پر جن چیزوں کے خدمات سے مستفید ہونے پر آپ مجبور ہیں، یا جن چیزوں کے نقصان رساں پہلوؤں سے آپ بچنا چاہتے ہیں، ان ہی کو معبود بنا بنا کر آپ پوجنے بھی لگیں گے، تو قدرتاً ان ذہنی الجھنوں میں مبتلا ہو جانا آپ کے اس متضاد طرزِ عمل کا منطقی نتیجہ ہے، جوتیاں جنہیں ہم پہنتے ہیں ان ہی کی پوجا کے بھی ہم اگر پابند کر دیئے جائیں، تو ظاہر ہے کہ ان ہی جوتیوں کے آگے ہمیں سر بھی جھکانا پڑے گا اور پھر ان ہی کو پہن کر پاک و ناپاک چیزوں پر ہم چلیں گے بھی، الغرض ان ہی کو سر پر بھی رکھیں اور ان ہی کو پاؤں سے بھی روندیں ایسی صورت میں آپ ہی بتائیے ہم اور کیا کریں گے یا کیا کر سکتے ہیں، آپ اپنے ایندھن کے لئے درختوں کی لکڑیوں کے بھی محتاج ہیں پھر ان ہی درختوں کو آپ پوجنے بھی لگیں۔ تو یقیناً آپ کو یہی کرنا پڑے گا کہ اپنے ہاتھوں اپنے معبودوں کے تنوں پر کلہاڑے بھی چلائیے، ٹکڑے ٹکڑے کر کے چولہوں میں بھی ان کو پھونکیے، کسی گڑھے، یا نالے میں جمع ہونے والے پانی کی پرستش کرنے والوں کو آئے دن دیکھا جاتا ہے کہ اسی پانی سے برکت بھی حاصل کرتے ہیں، پاپ کے ناش کرنے کی خاصیت بھی ان میں مانتے ہیں، اس کی حمد کا بھجن بھی گاتے ہیں، گاتے میں تھرکتے ہیں، ناچتے ہیں اور پھر پانی کے اسی گڑھے یا نالی کے کنارے بیٹھ کر ضرورت ہوتی ہے تو قضائے حاجت سے بھی فارغ ہوتے ہیں اس کی پروا کئے بغیر فارغ ہوتے ہیں کہ اسی پوتر اور مقدس پانی میں آخر کن غلاظتوں اور نجاستوں کو اپنے ہاتھوں وہ خود شریک کر رہے ہیں، اسی میں سڑی گلی مردہ لاشوں

کو بھی بہاتے ہیں، آبادیوں کی گندی نالیوں کا رُخ اسی پاک پانی کی طرف پھیر دینے کا عام رواج ہے الغرض ایک ہی چیز کو مسلسل مخدوم و خادم، معبود و عابد کا چکر ایک ایسا بھول بھلیاں چکر ہے جس کے پھیرے میں پھنس جانے والوں کے دل پر دماغ پر دن کے چوبیس گھنٹوں میں تضاد و تناقض کی نہ ختم ہونے والی چوٹیں پڑتی رہتی ہیں، ان چوٹوں کے برداشت کرنے پر وہ مجبور ہیں سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ بجائے خود قدرتی حالات ہی ایسے تھے کہ دنیا کی چیزوں سے مستفید ہونا چاہیے تھا کیوں ہی اس کو آدمی اپنا قدرتی حق سمجھتا آخر پیاسے کے سامنے ٹھنڈا پانی اور بھوکے کے آگے روٹیاں لاکر رکھ دی گئی ہوں، طبعاً ایسی حالت میں چاہئے تو یہی کہ پیاسا پانی کو اور بھوکا روٹی کو استعمال کرنے لگے، سو جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اپنی حاجتوں اور ضرورتوں میں استعمال کرنے کا لائسنس یا اجازت نامہ حالانکہ ان چیزوں کے خالق کی طرف سے ہر زمانہ میں تقسیم بھی ہوتا رہا لیکن کسی خاص زمانہ ہی میں نہیں، بلکہ تاریخ کے ہر دور میں دنیا کی اکثر قوموں میں بلا وجہ یہ دونوں ذہنی وبائیں پھوٹتی رہی ہیں، یعنی خواص تو روحانیت (اسپریچولزم) کے نام سے خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے متعلق اپنے اندر نفرت اور چڑ کے جذبے کی پرورش بلا وجہ زور صرف کرتے رہے اور مخلوق پرستانہ اوہام کی تاریکیوں نے اسی قوم کے عوام میں ایک ایسی ذہنیت پیدا کی جس کے زیر اثر ہر ایسی مخلوق پُجنے لگی جس میں نفع یا ضرر کا پہلو نمایاں تھا یا [illegible] منسوب کرنے والوں نے ان کی طرف منسوب کر دیا، انہی کے آگے پیشانیاں جھکا دی گئیں، ہاتھ جوڑ کر آدمی اس کے آگے کھڑا ہو گیا گویا روحانیت والوں نے ٹھوکروں کا مستحق خدا کی جن پیدا کی ہوئی چیزوں کو ٹھہرا لیا تھا، ان ہی کی ٹھوکروں میں مخلوق پرستی کی ذہنیت نے آدم کو ڈال دیا، یعنی ایک طرف خواص میں کائناتی حقائق کی جانب سے دلوں میں نفرت و حقارت کی آگ بھڑکائی جاتی

تھی، دنیا جس کی نظروں میں جتنا زیادہ ذلیل ہو سمجھا جاتا تھا کہ روحانیت میں اسی قدر اس کا مقام بلند ہے اور دوسری طرف عوام میں ان ہی مخلوقات کی دلچسپیاں ترقی کر کے اس نقطہ تک پہنچ گئیں، بلکہ ان کی عظمت و عزت محبت و الفت نے عبادت اور پوجا پاٹ کا رنگ اختیار کر لیا تھا

اس میں شک نہیں کہ مادیت کی جدید مغربی ذہنیت کے زیر اثر جو تمدن پیدا ہوا ہے اس میں بھی دنیا، اور دنیا کی بعض خاص چیزوں سے گریز گیاں حد سے زیادہ متجاوز ہو گئی ہیں، دور کیوں جائیے کتوں کے ساتھ یورپ اور امریکہ کے باشندوں نے اپنے تعلقات کو جہاں تک پہنچا دیا ہے وہ ہم سب کے سامنے ہیں، لیکن کتے پوجے گئے ہوں، شاید خالص مادیت کے جدید مغربی دور میں اب تک یہ صورت پیش نہیں آئی ہے حالانکہ یہی مادیت جب مخلوق پرستی کے رنگ میں رائج تھی تو کہا جاتا ہے کہ کتے بھی پوجے گئے تھے[1]

بہر حال یہ عجیب بات ہے، کہ خدائی مخلوقات سے نفرت و حقارت جس پر رہبانیت کے سارے کاروبار کا دار مدار ہے اور ان ہی مادی حقائق کی قدر و قیمت عظمت و محبت جو مخلوق پرستی کے عہد میں ان کو معبودیت اور الوہیت کی شانِ رفیع تک چڑھا کر پہنچا دیتی تھی بذات خود ان دونوں نقاطِ نظر میں آسمان و زمین ہی کی نسبت کیوں نہ ہو لیکن خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں سے زندگی کی ضرورتوں میں استفادہ کا جو قدرتی حق آدمی کو حاصل تھا، آدمی کا یہ جائز قدرتی حق ان دونوں خود تراشیدہ نظریوں کے دباؤ سے متاثر اور بری طرح متاثر ہوتا رہا اور یوں یہ عجیب بات ہے کہ نتیجہ دونوں کا ایک ہی تھا، ویسے تو مخلوقات سے نفع گیری، اور فوائد اندوزی پر رہبانیت والے بھی مجبور تھے۔ اور مخلوق پرست بھی، کہ بغیر اس کے خدا کی اس دنیا میں ایک قدم کیا عرض ہی کر چکا ہوں کہ ایک سانس بھی کوئی لینا چاہے تو عام حالات میں نہیں لے سکتا لیکن کامل انشراحِ قلب، کھلے دماغ کے ساتھ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ظاہر ہے کہ دنیا کی چیزوں سے استفادہ کا ارادہ نہ وہی کر سکتے تھے جو ان ہی چیزوں کی نفرت کا اپنے آپ کو عادی بنا کر ان سے بھاگنے اور دور رہنے ہی کو اپنی زندگی کا آخری نصب العین بنائے ہوتے تھے (باقی آئندہ)

---

[1] جلد اور نمبر تو یاد نہیں ہے مگر "برہان" ہی میں خاکسار کا ایک مضمون "قدیم مصری تمدن" کے متعلق شائع ہوا تھا، زمین سے برآمد ہونے والے آثار کی روشنی میں دوسری باتوں کے ساتھ اس کا بھی تذکرہ کیا گیا تھا کہ مصر کے باشندوں کی مختلف ٹولیوں میں مختلف مخلوقات کی عبادت کا رواج تھا، جن میں بعض کتوں کو پوجتے تھے اور بعض بلیوں کے پرستار تھے، گبریلے کیڑے کے پجاریوں کی بھی کافی تعداد اس ملک میں پائی جاتی تھی، یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ اتفاقاً ان ٹولیوں میں لڑائی چھڑ جاتی تو بلیوں کے پوجنے والے تلاش کر کر کے کتوں کو اس لئے مارتے تھے کہ وہ ان کے دشمنوں کا معبود "اشٹ دیو" ہے اسی طرح بلیوں کو وہ قتل کرتے تھے جو کتوں کے پجاری تھے۔

البیرونی اور اصفہبذ جیلجیلان مرزبان بن رستم

(دیباچۂ کتاب مقالید الہیئۃ کی روشنی میں)

از

(جناب مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی استاذ شعبۂ عربی مدرسہ عالیہ کلکتہ)

(۲)

نسب نامۂ مرزبان علامہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی مرحوم تاریخ ابن اسفندیار کے قلمی نسخہ کے حوالہ سے رستم بن شروین کا نسب نامہ مرتب کر کے یہ ثابت کرتے ہیں[1] کہ صحیح سیاق نسب رستم بن شہریار بن شروین ہے - ان کی تحقیق کے بموجب "شہریار" کا نام قابوس نامہ (عنصر المعالی) سے ساقط ہو گیا ہے اور اس ایک پشت کے اضافہ سے مرزبان بن رستم کا اتصال کیوس بن قباد سے چودہویں پشت پر ہوتا ہے نہ کہ تیرہویں پشت پر۔

کسی ایک نام کا سقوط بنفسہٖ کچھ مستبعد نہیں جب کہ حذف و اختصار کا عمل بھی انساب میں عام رہا ہو تاہم علامۂ قزوینی کی اس تحقیق سے بوجوہ ذیل اتفاق نہیں کیا جا سکتا - اور ہمارے علم میں قزوینی کی مسامحت پر شاید سب سے پہلے پال کسنووا (Paul Casanova) نے تنبیہ کی تھی[2]۔

تاریخ ابن اسفندیار کے جس حصہ پر اعتماد کرتے ہوئے علامہ مرحوم نے رستم کو شہریار بن شروین کا فرزند قرار دیا ہے، وہ ابن اسفندیار کا خود نوشت ہونے کے بجائے بہت بعد کا الحاقی

---

[1] مقدمۂ مرزبان نامہ: ۵ - بحوالۂ نسخہ پیرس (ورق ۱۵۰-۱۵۳) زیر شمارہ: ۱۴۳۶ (ف) یہ نسخہ ۱۲۹۵ھ کا ہے

[2] عجب نامہ: ص ۱۱۷-۱۲۶ (کمبریج ۱۹۲۲ء) Les Ispehbeds de Firim - اس فرنچ مضمون کو برادر محترم ڈاکٹر صغیر حسن معصومی استاذ شعبۂ عربی ڈھاکہ یونیورسٹی نے راقم کی فرمائش پر اردو میں منتقل فرمایا - ہمارے مضمون میں پال کسنووا کے حوالجات اسی ترجمہ پر مبنی ہیں۔

حصہ ہے۔ جس کی تنہا شہادت ہرگز قابلِ وثوق نہیں ہو سکتی۔ اس حصہ کے الحاقی ہونے کا خیال ڈاکٹر ریو[1] (Rieu) نے ظاہر کیا تھا یا لُکسنو وا اور عباس اقبال[2] کو بھی اس خیال سے اتفاق ہے۔ ابن اسفندیار کے اصل نوشتہ میں شہریار کا ذکر نہیں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:— واصفہبذ مرزبان بن رستم بن شہردین پریم کہ کتاب مرزبان نامہ از زبان وحوش و طیور و انس و جن و شیاطین فراہم آوردہ اوست[3]۔ پھر اسی حصہ میں "رستم بن شہردین[4] کا ذکر آتا ہے اور درمیان میں "شہریار" کا نام نہیں آتا۔ خود الحاقی حصہ ہی میں ایک جگہ ۔"رستم بن شہردین بن شہریار باوند[5]"۔ مذکور ہے۔

(۲) آلِ باوند کا جو نسب نامہ سید ظہیر الدین مرعشی (م ۸۹۲ھ / ۱۴۸۷ء) نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے اس کے سیاق میں بھی "شہریار" کا نام مندرج نہیں۔ البتہ مرعشی کی یہ تصریح ہے کہ شہردین کا ایک فرزند شہریار نام کا تھا جس نے ۳۷ سال فرماں روائی کی غالباً اسی شہریار برادر رستم بن شہردین کو ابن اسفندیار کے الحاقی حصہ کے مجہول الحال مؤلف نے پدر رستم بن شہردین قرار دیا ہے۔ مرعشی کا بیان کردہ نسب نامہ درج ذیل ہے:

"...رستم[6] بن شہردین بن رستم بن سرخاب بن قارن بن شہریار بن قارن بن شہردین بن سرخاب بن (مہر مردان بن سہراب بن) باو بن شاپور بن کیوس بن قباد بن فیروز"

البیرونی کتاب الآثار الباقیہ میں قابوس وشمگیر کے مادری سلسلۂ نسب کے بیان میں رستم کو شہردین ہی کا فرزند قرار دیتا ہے چونکہ بیرونی کا پیش کردہ جریدۂ نسب ہمارے مآخذ میں قدیم تر ہے لہٰذا یہاں نقل کیا جاتا ہے لیکن اس کے سیاق میں بہت زیادہ حذف و اختصار یا سقوط پایا جاتا ہے

"...[7] وأما الاصل الآخر فملوك الجبال الملقبون باصفهبذية طبرستان

---

[1] فہرست نسخ فارسیہ موزہ بریطانیہ: ج ۱ ص ۲۰۲ - ۲۰۴ (نسخۂ ابن اسفندیار شمارہ: Add. 7633)
[2] تاریخ تبرستان: (مقدمہ) چاپ تہران (۳) ایضاً: ج ۱ ص ۱۳۷ (۴) ایضاً: ج ۱ ص ۱۴۳ تلخیص (براؤن): ص ۹۲ (۵) تلخیص (براؤن): ص ۲۲۵ (۶) تاریخ طبرستان و رویان و مازندران: ص ۲۷ (انساب آلِ باوند) ص ۳۲۳ (مدت ایالت و دولت آلِ باوند، قسم اول) طبعۂ برنہارد دارن)—سنۃ الطبع ۱۸۵۰ء — (۷) آثار باقیہ: ص ۳۹ (طبعۂ زخاؤ) اسی عبارت کو شیخ محمد خضری بک نے متعدد اغلاط کے ساتھ نقل کیا ہے دیکھو محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ (الدولۃ العباسیہ: صفحہ ۲۷۳: ۱۹۳۴ء)

والفرجوارحوشاهية وليس بنكر اعتزاء من كان منهم من اهل بيت الملك الى ما يجمعهم والا كاسرة في شعب واحد فان خاله هو الاصفهبد رستم بن شروين بن رستم بن قارن بن شهريار بن شروين بن سرخاب بن باو بن شابور بن كيوس بن قباد والد انوشيروان"۔

(۳) رستم کے دینار اصفہبذیت کے کئی سکے دریافت ہوئے ہیں اور ہر ایک پر "رستم بن شروین" کندہ ہے ان سکوں کا بیان ذیل میں موقع کے ساتھ آئے گا۔

وجوہ بالا کی بناء پر امیر عنصر المعالی کے بیان کے مستند ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ رستم اور شروین کے درمیان شہریار کے نام کا سقوط مان لیا جائے۔ پس مرزبان مصنف مرزبان نامہ رستم بن شروین بن رستم بن سرخاب کا فرزند ہے نہ کہ رستم بن شہریار بن شروین بن رستم کا، اور اگر یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ جائے کہ شہریار بن شروین برادر رستم بن شروین کا فرزند موسوم بہ "رستم" تھا تب بھی اس امر میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ مرزبان، پسر رستم بن شروین مذکور تھا۔

عنصر المعالی کے بیان کا آخری حصہ — "سیزدہم پدرش کایوس بن قباد ۔ ۔ ۔ بود" — مرعشی کے پیش کردہ نسب نامہ سے مختلف ہو جاتا ہے مرعشی کے یہاں "شہریار بن قارن بن شروین" مذکور ہے جب کہ قزوینی کے مرتبہ نسب نامہ میں "قارن" کا نام موجود نہیں۔ اگر مرزبان کا نسب چودھویں پشت پر کیوس سے اتصال پاتا ہے تو اس کی صحت کا مدار "قارن" ہے جو مرعشی کے سیاق میں ساتویں پشت پر ہے اور جسے قزوینی نے ساقط کر دیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مرعشی اور عنصر المعالی دونوں میں سے کسے ترجیح دی جائے؟ ہمارے خیال میں عنصر المعالی کا بیان معتبر اور قابلِ وثوق ہے قربِ زمانی کے علاوہ اپنے مادری سلسلۂ نسب کے متعلق اس کے معلومات حتماً طبقۂ اولیٰ کے ہیں وصاحب البیت ادریٰ بما فیہ۔ مرعشی یا دوسرے مورخین کے پیشِ نظر تاریخ آلِ باوند کے متعلق کوئی قدیم دستاویز یا قابلِ وثوق ماخذ نہیں رہا ہے ان لوگوں نے حتی الامکان

---

[۱] مرعشی کے اہم ماخذ میں مولانا اولیاء اللہ آملی (؟ ۷۶۰ھ)، علی بن جمال الدین رویانی کی کتابیں اور ابن (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

جو تحقیق و کاوش کی وہ مسلّم ہے پھر بھی آل باوند طبقۂ اول کے متعلق ان کے معلومات بے حد ناقص ہیں۔ مرعشی کے سیاق سے "مہر مردان بن سہراب" کے نام ساقط ہیں یہ سقوط کاتب الاصل کی بے اعتنائی سے ہوا ہوگا اس لئے کہ خود مرعشی کی اسی تالیف میں آل باوند کی حکومت کا اجمالی جائزہ جو ملتا ہے اس میں دونوں نام برموقع مذکور ہیں۔ تعجب ہے کہ مبینہ سقوط پر کتاب کا ایڈیٹر (Dorn) کوئی برمحل تنبیہ نہیں کرتا۔

باوندیہ طبقۂ اول جس سے زیر بحث اصفہبذ مرزبان اور اس کے باپ رستم بن شروین کا تعلق ہے عام روایت میں اس طبقہ کی اصبہبذیت کا دور ۴۵ھ/۶۶۵ء تا ۳۹۷ھ/۱۰۰۷ء ہے اس طویل مدت میں مرعشی کی تصریح کے بموجب اصبہبذان آل باوند کی تعداد تیرہ تک پہنچی ہے اصبہبذ رستم بن شروین اور اصبہبذ مرزبان پسر رستم مذکور کے ذکر سے مرعشی کی تاریخ یکسر خالی ہے۔ رستم کا نام صرف سیاق نسب میں آتا ہے پس اصبہبذ مرزبان سے پہلے اصبہبذ رستم سے بحث کرنا ہمارے لئے ناگزیر ہے۔

| رستم شروین پدر مرزبان | سلسلۂ باوندیہ کا دسواں اصبہبذ شروین بن رستم ۳۵ برس (۲۸۲ھ - ۳۱۷ھ) فرمانروائی کرتا ہے اس کے بعد علی الترتیب شہریار بن شروین (۳۱۷ھ - ۳۵۴ھ = ۳۷ سال) دارا بن رستم بن شروین (۳۵۴ھ - ۳۶۲ھ = ۸ سال) اور شہریار بن دارا بن رستم (۳۶۲ھ - ۳۹۷ھ = ۳۵ سال) بہ یم کوہ کی موروثی اصبہبذیت پر فائز رہے۔ یہ ترتیب مرعشی کے بیان سے مستخرج ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اسفندیار کی تاریخ ہے۔ ان مآخذ کے علاوہ اس کے ذاتی معلومات بھی ہیں۔ خود ابن اسفندیار کی تاریخ بہ قول دارن تقریباً ۶۱۳ھ/۱۲۱۶ء کی تالیف ہے اس کے مآخذ یہ ہیں۔ (الف) باوندنامہ: جس کی روایتوں کو تاریخ سے کم اور افسانہ سے زیادہ مناسبت تھی (ب) عقود السحر و قلائد الدرر مؤلفہ ابوالحسن (علی) بن محمد الیزدادی (معاصر قابوس وشمگیر): ابن اسفندیار کو یہ عربی تالیف جس میں تاریخی واقعات سے زیادہ انشار پردازی میں زور قلم صرف ہوا تھا مدرسۂ شہنشاہ غازی رستم بن شہریار سے ملحق ذخیرۂ کتب میں ملی تھی۔ نامۂ تنسر کا عربی ترجمہ (ابن المقفع کا) اس کو خوارزم کے ایک کتب فروش کے یہاں ہاتھ آگیا جس کو فارسی میں منتقل کرکے اپنی تاریخ کے شروع میں محفوظ کر دیا ہے۔ [۱] مرعشی: ص ۳۲۳ حبیب السیر (جزو: ۴ ص ۴۴ ۱۸۵۷ء بمبئی)

شہریار بن شروین کے بعد فریم کی اصبہبذیت اس کے بھائی رستم بن شروین کے تعاقب میں منتقل ہو جاتی ہے لیکن خود رستم بن شروین باوندی سپہبذوں کے سلسلہ میں نظر نہیں آتا بجز اس فقرہ کے جو ابن اسفندیار کے الحاقی حصہ میں ملتا ہے کہ — "و رستم ہم پسر شہریار بود و در عہد قابوس قایم مقام پدر بود در کوہستان پریم و شہریار کوہ" اور یہی فقرہ ہے جس سے قزوینی کو رستم کی ولدیت کے بارہ میں غلط فہمی پیدا ہوئی۔ عربی مراجع میں رستم کا ذکر ضمنی طور پر آتا ہے مثلاً ابن الاثیر[1] اور ابن خلدون کا بیان ہے کہ — "۳۶۶ھ میں بیستون بن دشمگیر ہفت سالہ عہد حکومت کے بعد جرجان میں فوت ہوا اس وقت اس کا بھائی قابوس اپنے ماموں رستم کے پاس شہریار کوہ میں مقیم تھا" رستم سے مراد یقیناً رستم بن شروین ہے کہ وہی قابوس کا ماموں تھا جیسا کہ بیرونی اور ابن اسفندیار کی تصریح گزر چکی ہے۔ غرض اس بیان سے مترشح ہے کہ ۳۶۶ھ میں شہریار کوہ کی اصبہبذیت پر رستم بن شروین متمکن تھا۔

اس کی اصبہبذیت کا قطعی ثبوت اس کے نام کے سکّے ہیں جن میں سے ایک درہم کی اطلاع ہمیں پہلی دفعہ رابینو (Rabino) کے ذریعہ[2] ملی یہ درم بمقام فریم (پریم کوہ) ۳۵۵ھ/۹۶۶ء میں مضروب ہوا، اس پر عباسی خلیفہ المطیع لِلّٰہ (م ۳۶۳ھ) بویہی فرمانروا رکن الدولہ (م ۳۶۶ھ/۹۷۶ء) اور مقامی فرمانروا "اصبہبذ رستم بن شروین" کے اسماء کندہ ہیں رابینو باوندیہ طبقۂ اول کی فہرست میں رستم کو بار ہواں اصفہبذ قرار دیتا ہے لیکن اس کی مدت اصبہبذیت کے متعلق زیادہ کچھ نہیں بتاتا۔ اس درم کی تاریخ کو ہم رستم کی اصبہبذیت کا آغاز قرار دے سکتے ہیں اور ابن الاثیر اور ابن خلدون کے حوالہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ ۳۶۶ھ میں بھی رستم شہریار کوہ کا اصبہبذ رہا تھا، پال کسنوا کے مقالہ سے رستم کے دو اور سکوں کا علم ہوتا ہے ایک ۳۶۱ھ میں بمقام فریم مضروب ہوا، المطیع اور رکن الدولہ کے نام اس

---

[1] ج ۲ ص ۲۵ (تہران) [2] الکامل: ج ۷، ص ۸۷ (الاستقامہ، مصر): العبر: ج ۴ ص ۴۹۷ (مصر)
[3] لوی رابینو دی برگومالہ: مازندران و استرآباد (انگریزی): ص ۱۳۵ ۱۹۲۶ء گب میموریل سلسلۂ جدیدہ
۷

پر بھی ملتے ہیں۔ دوسرا سکہ ۳۶۷ھ کا ہے جس پر خلیفہ کے نام کے ساتھ عضد الدولہ ابو شجاع (م ۳۷۲ھ / ۹۸۳ء) اور مؤید الدولہ ابو منصور (م ۳۷۳ھ / ۹۸۳ء) کے نام مطبوع ہیں۔ ۳۵۵ھ کے درہم کا ذکر فرائن (Fraehn) اسلامی مسکوکات کی ضخیم فہرست[1] میں کرتا ہے اس کی قراءت کے بموجب سکہ پر یہ عبارت کندہ ہے: "بسم اللہ ضرب ھذا الدرھم بفریم سنۃ خمسۃ (؟) وخمسین وثلثمائۃ"۔ اور اس کی قرارت میں اصبہبذ کا نام "رستم بن شرویہ" ہے جب کہ ۳۶۷ھ کے سکہ پر "رستم بن شروین" بلا التباس ہے۔ رابینو اپنا ماخذ بر موقع نہیں بتاتا لیکن فرائن کے حوالہ سے پال کسنووا اس درہم کا ذکر کرتا ہے اور یہ امر بالکل محقق ہے کہ فرائن کا دریافت کردہ سکہ بھی رستم پسر شروین باوندی ہی کا ہے۔ تینوں سکوں پر "علیؑ ولی اللہ" کا مقولہ ملتا ہے جس سے آل باوند کی شیعیت واضح ہوتی ہے۔ ان سکوں کی روشنی میں ہم اس دعوی میں حق بجانب ہوں گے کہ رستم بن شروین کی مدت اصبہبذیت علی الاقل ۳۵۵ھ سے ۳۶۷ھ ہجری تک کل تیرہ سال ضرور رہی ہوگی[2]، اور قرینہ غالب ہے کہ اس کی اصبہبذیت کا دور شہریار بن شروین کے بعد شروع ہوا۔ اصبہبذ رستم بن شروین کے بعد اس کا فرزند دارا بن رستم اصبہبذ ہوا جس کا زمانہ (۳۶۷ھ - ۳۷۵ھ) آٹھ سال ہے اور ہمارے خیال میں دارا بن رستم کی جانشینی اس کے بھائی مرزبان بن رستم نے کی۔

مرزبان بن رستم کی اصبہبذیت | ابن اسفندیار کا حوالہ گزر چکا ہے کہ وہ مرزبان کے نام کے ساتھ اصبہبذ کا لقب استعمال کرتا ہے، عنصر المعالی کی عبارت میں اس کو "ملک زادہ" کہا گیا ہے، لیکن قابوس نامہ کے قدیم ترین نسخہ کی عبارت ہمارے لئے مفید ہے قدیم نسخہ کے الفاظ یہ ہیں: — "جدہ تو[3] مادرم ملک زادہ

---

[1] یہ سکہ پال کسنووا کو مکتبۂ ملیہ پیرس کے شعبۂ مسکوکات میں نظر آیا تھا
Recensio Numorum Muhammedanorum
(Appendix Classis X) P. 600 - 1826 St. Petersbourg

[2] پال کسنووا کی مراد خلیفہ المطیع سے ہے حالانکہ اس کی خلافت ۳۶۳ھ / ۹۷۴ء تک باقی رہی ہے اس کے بعد الطائع کی خلافت شروع ہوئی۔ [3] زمباور اس کا زمانہ ۳۳۵ھ سے ۳۷۰ھ تک قرار دیتا ہے، ہمیں اس کے دلائل سے واقفیت نہیں۔ [4] قابوس نامہ: مرتبہ سعید نفیسی: صفحہ ۲ (۱۳۱۲ شمسی)، منتخب قابوسنامہ: صفحہ ۳

مرزبان بن رستم بن شروین دخت بود" بیرونی کی کتاب الآثار الباقیہ اور اس کی خود نوشت فہرست تالیفات کی محولہ بالا عبارت سے ابن اسفندیار کی کامل توثیق ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم دستاویز کتاب مقالید الاہیئۃ کا دیباچہ ہے جس میں مرزبان کے القاب شاہانہ مذکور ہیں۔ اور آپ کے ملاحظہ سے گذر چکے ہیں۔ پھر اسی دیباچہ میں بیرونی کی زبانِ قلم سے "ثبات دولت" و "دوام ملک وقوت" کی جو دعائیں جابجا نکلی ہیں ان کا تقاضہ یہی ہے کہ مرزبان بن رستم شروین کی اصبہبذیت کا ہمیں یقین حاصل ہو جائے۔

مرزبان کی اصبہبذیت کے ثبوت میں کسی سکہ کے انکشاف کی اطلاع نہیں جس کے ذریعہ اس کے عہد اصبہبذیت کی تعیین میں مدد ملتی، تاہم بعض قرائن کی بنار پر اس کے زمانہ کی تعیین کی جا سکتی ہے۔

(۱) باوندیہ طبقۂ اول کے اخیر اصبہبذ شہریار بن دارا کی مدت حکمرانی ۳۵ سال[1] بتائی جاتی ہے یہ بات قابلِ تسلیم نہیں، اس لئے کہ اسی شہریار کے بارہ میں مرعشی کی یہ تصریح ملتی ہے کہ "واو[2] مدت ہجدہ سال کہ قابوس بخوراسان بود بمصاحبت وخدمت مشغول بود"۔ جب اصبہبذ شہریار بن دارا نے اٹھارہ سال (۳۷۱ھ تا ۳۸۸ھ) قابوس کی ہمرکابی میں گذارے تو اس اثنار میں طبرستان و مازندران پر اس کی اصبہبذیت کس طرح قایم رہ سکی! حالانکہ یہ مدت اس کی پنج و سی سالہ اصبہبذیت میں ضرور شامل رہتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ فخر الدولہ بویہی کی وفات[3] (۳۸۷ھ ۹۹۷ء) کے بعد قابوس کے ساتھ شہریار بن دارا بھی ۳۸۸ھ میں شہریار کوہ کی تسخیر کے لئے پیش قدمی کرتا ہے اور اس مہم میں کامیاب ہوتا ہے پس تاریخی طور پر ۳۸۸ھ سے قبل اس کی اصبہبذیت قایم نہیں ہوئی جب سے ۳۹۷ھ تک تقریباً دس سال اس کی اصبہبذیت کا اصل دور ہے اس مختصر مدت کو ۳۵ سال بیان کرنے والوں نے رستم بن شروین (۳۵۴ھ - ۳۶۷ھ) اور مرزبان بن رستم

---

[1] مرعشی: ص ، رابینو: ص ۱۳۵ [2] مرعشی: ص ۲۰۹ - ابن اسفندیار: ج ۲ ص ۲۵ (قسم الحاقی)
[3] مرعشی: ص ۱۹۱

(۳۷۶ھ - ۳۸۸ھ؟) کی اصبہبذیت سے لاعلمی کی بنا پر ان دونوں کی مدت اصبہبذیت (۱۲+۱۴
= ۲۶ سال) بھی اصبہبذ شہریار بن دارا کے عہد (۳۸۸ھ - ۳۹۷ھ) میں ضم کر کے ۳۵ سال اس کے
عہد کے فرض کر لئے ہوں تو تعجب نہیں - غرض شہریار بن دارا کی بیچ دسی سالہ اصبہبذیت کا دعویٰ
ایک مفروضہ سے زیادہ نہیں اب سوال یہ ہے کہ دارا بن رستم کے بعد جس کا زمانہ تا اختتام ۳۷۵ھ
سمجھا جاتا ہے آل باوند کی موروثی اصبہبذیت کا زمام کن ہاتھوں میں رہا، شہریار بن دارا کا نام نہیں
لیا جا سکتا کہ وہ ۳۷۱ھ ہی سے قابوس کی مصاحبت میں حدود طبرستان و جرجان سے باہر رہا؛
لہذا ہمارے نزدیک ۳۷۶ھ سے مرزبان بن رستم شروین کی اصبہبذیت شروع ہوتی ہے -

(۲) مرزبان کے عہد کا اندازہ بیرونی کی کتاب المقالید کے زمانہ تالیف کو معلوم کرنے سے تعلق
رکھتا ہے اگرچہ اس تالیف کا زمانہ بہ تصریح مؤلف ثابت نہیں تاہم تخمینہ لگا لینا ممکن ہے - یہ بات
واضح رہے کہ کتاب مقالید الہیئۃ سے پیشتر بیرونی کے قلم سے کم از کم دو کتابیں تجرید الشعاعات اور
اور کتاب البرہان المنیر فی اعمال التسایر نکل چکی تھیں اور دونوں کے صریح حوالے مقالید میں[۱] ملتے ہیں
کتاب استیعاب الوجوہ کی منقولہ بالا عبارت سے یہ بات محقق ہو جاتی ہے کہ زیر بحث کتاب الاستیعاب
سے پہلے اور کتاب الآثار الباقیہ سے یقیناً بہت پہلے لکھی گئی - اس لئے کہ الاستیعاب کا آثار باقیہ پر
مقدم ہونا طے شدہ[۲] امر ہے - کتاب الاستیعاب، مقالید اور آثار باقیہ کے درمیان شمس المعالی قابوس
سے وابستگی سے پہلے بیرونی نے تالیف کی ہے، اور اس کتاب کی تالیف کے زمانہ میں بیرونی کو اطمینان
و سکون نصیب نہیں تھا جب کہ مقالید اس زمانہ میں لکھی گئی کہ وطن سے دور رہ کر بھی بیرونی کو ہر
قسم کی آسائش میسر تھی، الاستیعاب میں اقلاً دو مقام پر اس نے اپنی پریشانی و زبوں حالی کا شکوہ کیا ہے
اولاً نجومی آلات کے سلسلہ میں اس کا بیان ہے کہ

---

[۱] مقالید الہیئۃ: برگ ۱۴ ب سطر ۱۲ و برگ ۲۱۹ ظ سطر ۶ اس کتاب کا ذکر بیرونی خود نوشت فہرست میں کرتا ہے (دیکھو الآثار: مقدمہ زخاؤ - xxxxii ص)- برگ ۲۱۷ ظ سطر ۳ - البرہان المنیر کا ذکر بھی فہرست میں موجود ہے (دیکھو مقدمہ زخاؤ ۔ xxxxvii ص) [۲] الاستیعاب کا حوالہ الآثار الباقیہ (ص۳۵۷) میں آتا ہے: نیز دیکھو مقدمہ کتاب التفہیم (از جلال ہمائی)

ومن[1] عزمی انشاء اللہ تعالیٰ ان اجمع ماتبدد فی هذا المعنی واصلح الفاسد واسهل العسیر ان نفس اللہ تعالیٰ فی مدة حیاتی ویسر لی ماتعذر علی من الوصول الی کتبی ومجموعاتی والتعلیقات والنکت التی افنیت فیها عمری۔

"میرا پختہ ارادہ ہے اگر اللہ نے چاہا تو اس سلسلہ کے منتشر مواد یک جا کروں گا اور قابلِ اصلاح باتوں کی اصلاح کے ساتھ مشکلات کو سہل کردوں گا۔ بشرطیکہ اللہ تعالیٰ ہماری زندگی کو خوش گوار بنا دے اور اپنی کتابوں، مجموعوں، یادداشتوں اور نکتوں (جن کی تحصیل میں اپنی زندگی صرف کی ہے) تک رسائی میں جو دشواری پیش آرہی ہے اس کو آسان کردے۔"

ثانیاً ایک خاص مسئلہ کے سلسلہ میں ابوسہل القوہی کے مسلک سے بحث کرتے ہوئے اس کا عذر یہ ہے کہ

"ولن[2] یمکن استقصاء حکایة ماأورده ابوسهل القوهی لما لا یخفی من تعذر الوصول الی الکتب ومادفعنی المحن الیه من الخاطر الفاسد والطبع الفاسد (کذا) وان من اللہ بکشف النوائب واصلاح العواقب تمکنت من تلافی ذلک۔"

ابوسہل قوہی نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کو پوری طرح نقل کرنا ممکن نہیں ہے کہ کتابوں تک رسائی جیسی مشکل ہے اور مصائب نے مجھے جس تکدر ودل برداشتگی میں مبتلا کر دیا ہے وہ مخفی نہیں۔ اگر انعام خداوندی ان مصیبتوں کو دور فرمادے اور میری حالت سنوار دے تو اس کی تلافی اپنے مقدور میں ہوگی۔

بیرونی کا سفر بقول بروکلمان ۳۸۲ھ[3] کا واقعہ ہے، بروکلمان کے ماخذ کا ہمیں علم نہیں، اگر غزنی

[1] استیعاب الوجوه: برگ ۵ب ظ نسخہ جمعیت اسیویہ زیر شمارہ II. 32 / (کارڈ) [2] الاستیعاب: برگ ۱۰۰ب، نسخہ مذکورہ۔ [3] بروکلمان تاریخ کی تصریح نہیں کرتا ہے اس کا بیان یہ ہے کہ "بیرونی ۲۰ برس کی عمر میں رے، پھر جرجان گیا۔" ضمیمہ ج ۱ ص ۸۷۱۔

کی وفات کا سال یہی ہے جیسا کہ سید حسن برنی کی تحریر ہے تو یقیناً قُبَیل وفات خجندی ۳۸۲ھ میں بیرونی
ملک رے پہنچا جہاں اس نے خجندی کے بعض اہم اختراعات آلہ اسدس الفخری وغیرہ دیکھے اور شکل
مغنی کا ذکر قانون الہیئۃ کے نام سے خجندی کی تالیف میں پایا، اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کتاب مقالید
الہیئۃ ۳۸۲ھ کے بعد تالیف کی گئی اس سفر کی صحت تاریخ کی تقدیر پر جناب سید حسن برنی کے
خیال سے ہمیں کچھ اختلاف ہو جاتا ہے اور خوارزم کے قدیم خانوادۂ شاہیت[1] آل عراق سے بیرونی
کا تعلق ۳۸۵ھ سے قبل ۳۸۱ھ کے اواخر یا ۳۸۲ھ کے اوائل ہی سے منقطع ہونا قرین صواب معلوم
ہوتا ہے[2] قرینہ غالب یہ ہے کہ اسی سفر میں بیرونی طبرستان کے کوہی علاقہ میں پہنچا اور اصبہبذ پریم
(شہریار کوہ) مرزبان بن رستم کی بارگاہ میں باریاب ہوا۔ قابوس سے بیرونی کے تعلق کا آغاز اگر ۳۸۸ھ
سے مان لیا جائے تو نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ ۳۸۲ھ سے ۳۸۷ھ تک کا زمانہ (تقریباً پانچ چھ سال)
اصبہبذ مرزبان کی سرپرستی و قدردانی میں بسر ہوا اور اسی دوران میں کتاب مقالید الہیئۃ لکھی گئی
اور اگر یہ صحیح ہے کہ بیرونی ۳۸۵ھ تک آل عراق سے ضرور وابستہ رہا تو ۳۸۷ھ کے نصف ثانی تک
تقریباً دو سال تو یقیناً اسی باوندی اصبہبذ کے عتبۂ عالیہ پر گذارے ہوں گے کہ کتاب المقالید جیسی
تالیف کو ترتیب دینے کے لئے دو سال کا عرصہ بھی کافی ہے۔ لیکن دیباچہ کتاب میں جن لفظوں میں
اصبہبذ کی معارف نوازی و کرم فرمائی کا ذکر کیا گیا ہے ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس دربار میں بیرونی
کا قیام دو سال سے زیادہ ہی رہا ہوگا۔ بہرحال ۳۸۵ھ اور ۳۸۸ھ کے مابین بیرونی کی تاریخ حیات
میں اس کے تذکرہ نگار جو خلا محسوس کرتے رہے ہیں وہ اس طرح دور ہو جاتا ہے کہ یہ درمیانی زمانہ
اصبہبذ مرزبان باوندی کے دامن عاطفت میں بسر ہوا۔

ہمارے خیال میں ۳۸۷ھ کے نصف آخر میں اصبہبذ مرزبان فوت ہوا اس لئے کہ اس
سنہ کے اخیر میں فریم (پریم) کا اصبہبذ ایک اور شخص نظر آتا ہے جس سے ہمیں ذیل میں بحث
کرنا ہے۔

---

[1] البیرونی - ص ۱۲ ج ۱ [2] البیرونی ص ۴۵ تا ۴۶

اصبہبذ مرزبان کا جانشین | جب قابوس جرجان و طبرستان کی بازیافت کے لئے روانہ ہوا اور اسی کے تحت شہریار بن دارا نے خاص طور پر شہریار کوہ کی تسخیر کے لئے اقدام کیا تو دشمن کے مقابلہ کو شہریار کی طرف سے جو شخص روانہ ہوا تھا وہ رستم ابن مرزبان تھا جو بہ ظاہر زیر بحث اصبہبذ مرزبان بن رستم شروین کا فرزند تھا۔ عموماً رستم بن مرزبان کا نام اصبہبذ کے لقب کے ساتھ نہیں آتا لیکن عتبی کی بعض عبارتوں سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت رستم بن مرزبان کی اصبہبذیت قائم تھی قابوس اور شہریار بن دارا کی فوج کشی کے ذکر میں عتبی رقمطراز ہے:

"... اذ سرب الاصبہبذ شہریار[1] بن شروین (؟) الی الجبل شہریار[2] لاستصفائہ فسار نحوہ تحت لوائہ وعلی الجبل یومئذ رستم بن المرزبان خال الامیر ابی طالب رستم بن فخر الدولۃ صاحب الری..."	(قابوس کے عازم جرجان ہوتے ہی) سپہبذ شہریار پسر شروین (؟) شہریار کوہ کی تسخیر کے ارادہ سے چل پڑا اور قابوس کے زیر علم ہو گیا اس وقت شہریار کوہ کی حکومت پر رستم بن مرزبان ماموں تھا جو امیر ابو طالب رستم بن فخر الدولہ کا ماموں تھا۔

پھر مجد الدولہ کی تخت نشینی اور اس کی والدہ کے ذکر میں اسی مورخ کے یہ الفاظ ہیں کہ:

"... فلما اخترمتہ المنیۃ[3] بایع الناس مجد الدولۃ الا ان التی قامت عنہ کانت اختا للاصفہبذ بفریم وسائر ممالکہ	فخر الدولہ کی وفات کے بعد لوگوں نے (اس کے فرزند) مجد الدولہ کو منتخب کیا لیکن اس کی نیابت جس ذات نے کی وہ فریم اور مملکت جبل کے اصبہبذ کی بہن تھی اور خاندانی قوت

---

[1] تاریخ یمینی: صفحہ ۲۰۸ (سطر ۱۲-۱۵) دہلی ۱۸۴۷ء؛ الیضاح ج اص ۳۹۵ مصر ۱۲۸۶ھ
[2] المنیتی: ج ۲ ص ۳ "صح بالباء الموحدۃ وسمی عندھم شہریار کوہ"
[3] یمینی: صفحہ ۳۶۶ (سطر ۷-۱۰) دہلی

الجبل وھی فی منعۃ من اھلھا — وشوکت کے اعتبار سے ممتاز تھی۔"

وعزۃ من جانب ا رضھا"

فخرالدولہ بویہی کی وفات شعبان ۳۸۷ھ / ۹۹۷ء میں واقع ہوئی[1] مجدالدولہ اس کا جانشین مقرر کیا گیا لیکن اس کی عمر صرف چار سال کی تھی لہذا حکومت کا نظم ونسق اس کی ہوشمند والدہ نے سنبھالا دہ فریم (شہریار کوہ) کے کسی اصبہبذ کی دختر تھی، عتبی کے الفاظ سے ثابت ہے کہ اس وقت فریم کی اصبہبذیت پر اسی خاتون کا بھائی فائز تھا اور سابق اقتباس سے ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس شخص کا نام رستم بن مرزبان ہے۔ لہذا ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ علی الاقل فخرالدولہ کی وفات کے وقت سے رستم بن مرزبان کی اصبہبذیت کا آغاز ہوا۔ زامبور "فرمانروایان اسلام کے انساب[2]" میں اسی رستم کے دعوی سلطنت کی تاریخ ۴۰۳ھ سے قرار دیتا ہے، اس کے خیال سے ہمیں اتفاق نہیں۔ تعجب ہے کہ زامبور بادندی اصبہبذان[3] کی صف میں رستم بن المرزبان کو نہیں رکھتا حالانکہ عتبی کے بیان سے اس کی اصبہبذیت ثابت ہو جاتی ہے۔

مرزبان خال مجدالدولہ؟ — رابینو (Rabino[3]) کا خیال ہے کہ مرزبان بن رستم شردین، والدہ مجدالدولہ ملکہ رے کا بھائی اور اس بنا پر وہی مجدالدولہ کا ماموں تھا، رابینو حسب عادت بر محل حوالہ نہیں دیتا لیکن اس کا ماخذ یقیناً یاقوت رومی ہے یاقوت "سید آباد" کے ذکر میں والدہ مجدالدولہ کا نام شیریں بتاتا ہے اور اس کو اصبہبذ رستم کی دختر کہتا ہے اس کے الفاظ درج ذیل ہیں:

"قصئ بالری وقریۃ من قراھا — "(سید آباد) ملک رے کا شاہی قصر اور مضافات
وکلاھما انشأتھما السیدۃ — کا ایک قریہ ہے۔ دونوں مجدالدولہ (پسر فخرالدولہ)
شیرین[5] بنت رستم الاصبھبذ — کی والدہ سیدہ شیریں دختر اصفہبذ رستم کے بنا

[1] یمینی: ص ۱۲۸ (سطر ۱۰-۱۱)، تاریخ گزیدہ، ص ۴۲۶ (عکسی گب میموریل) وابن الاثیر (ج، ص ۱۸۵-۱۸۶)
تاریخ بخارا: ص ۲۰۲ شیفر، پیرس ۱۸۹۲ء
[2] Zambaur: manuel. p. 189-1927
[3] مازندران واسترآباد: ص ۱۳۵ (گب میموریل)
[4] معجم البلدان: ج ۳ ص ۲۱۱ ووستنفیلد، لیپزک ۱۸۶۸ء،
[5] ہمارے علم میں یاقوت تنہا شخص ہے جس کی زبانی والدہ مجدالدولہ کا نام معلوم ہوتا ہے، ورنہ عام تاریخوں
(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

ام مجد الدولة ابن بویہ أما القصر کردہ تھے قصر کی تعمیر ۳۹۴ھ میں ہوئی۔
فانشأته فی سنة اربع وتسعین
وثلثمائة"

بعد میں پال کسنووا کے محقق مقالہ سے معلوم ہوا کہ یاقوت کے بیان پر اولاً ڈارن (Dorn) کی نگاہ پڑی اور بعد کے مستشرقین اسی کی تحقیق پیش کرتے گئے۔ پال کسنووا بھی یاقوت کے بیان پر اعتماد رکھتا ہے اور اس شبہ میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ تاریخوں میں خال مجد الدولہ کی حیثیت سے رستم بن مرزبان کا جو ذکر آتا ہے وہ کسی قدیم تر مآخذ (مثلاً عتبی) کا غلط اثر ہے جو برابر قایم رہا اور عمل تناقل کے ذریعہ عام ہو گیا۔ پال کسنووا اپنے انکشاف پر کمال وثوق رکھتے ہوئے یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ اس نام کو مرزبان بن رستم ہونا چاہیے۔ ابن الاثیر اور ابن خلدون کی ظاہری عبارتوں سے اس تجویز کو کچھ قوت پہنچتی ہے[1]، لیکن ہمیں ان لوگوں کے خیال سے اختلافِ کلی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) میں اس کو "سیدہ" کہا گیا ہے فخر الدولہ کی ایک بیگم قابوس وشمگیر کی دختر تھی، اور آل سامان کے زیر سایہ خراسان میں رہتے ہوئے اس نے کسی اور خاتون سے شادی کی تھی اور یہ بات قابوس کو ناگوار ہوئی تھی (تاریخ گزیدہ: ص ۴۱۹ - ۴۲۰، گب میموریل) والدہ مجد الدولہ کس زمانہ میں فخر الدولہ کے حبالۂ عقد میں آئی ہمیں معلوم نہ ہو سکا:

[1] ابن خلدون کا ماخذ ابن الاثیر کی تاریخ ہے، پال کسنووا نے جس عبارت کی بنا پر ابن اثیر کے یہاں مرزبان بن رستم شروین کے ذکر کا دعویٰ کیا ہے وہ حسب ذیل ہے:

"فلما کانت هذه السنة (۳۸۸ھ) بعد موت فخر الدولة سیّر شمس المعالی قابوس الاصبهبذ شهریار بن شروین (؟) الی جبل شهریار وعلیه رستم بن المرزبان خال مجد الدولة بن فخر الدولة، فاقتتلا فانهزم رستم واستولی اصبهبذ علی الجبل وخطب لشمس المعالی...... ثم ان الاصبهبذ حدث نفسه بالاستقلال والتفرد من قابوس واغتر بما اجتمع عنده من الاموال والذخائر فسارت الیه العساکر من الری وعلیها المرزبان خال مجد الدولة فهزموا اصبهبذ واسروه ونادوا بشعار شمس المعالی لوحشة کانت عند المرزبان من مجد الدولة......"

(ابن اثیر: ج ۷، ص ۱۹۱ الطباعة المنیریة ۱۳۵۳ھ) اس عبارت میں المرزبان کے مکرر لفظ سے پال کسنووا غلط فہمی میں مبتلا ہوا ہے، پوری عبارت کے تسلسل کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ابن الاثیر کی مراد (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

پال کسنودا یا اس کے پیشرو دارن نے یاقوت کی عبارت کا خواہ مخواہ یہ مطلب نکال لیا کہ والدۂ مجد الدولہ، رستم بن شروین پدر مرزبان کی دختر تھی، حالانکہ یاقوت کے بیان میں اس رستم کی ولدیت سے قطعاً بحث نہیں ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ابن الاثیر اور ابن خلدون کی کتابیں مرزبان بن رستم شروین کے ذکر سے یکسر خالی ہیں۔ اور یہ دونوں رستم بن مرزبان خال مجد الدولہ کے ذکر میں عام تاریخی روایت سے الگ نہیں ہوئے۔ عتبی کی تاریخ یمینی میں رستم بن مرزبان کا نام کئی بار آیا ہے اور اس کی مختلف صورتیں[1] رہی ہیں لیکن عتبی نے کسی ایک جگہ بھی خال مجد الدولہ کو مرزبان بن رستم کے نام سے یاد نہیں کیا،

اس مسئلہ میں زامبور[2] (Zambaur) کو سخت اضطراب لاحق ہوا ہے، آل باوند کے شجرۂ نسب میں معلوم نہیں کس دلیل کی بنا پر سیدہ کو رستم بن شہریار بن دارا بن رستم بن شروین کی دختر قرار دیا ہے اس کے بعد آل کاکویہ کے نسب نامہ میں رستم بن مرزبان اور سیدہ دونوں کو مرزبان بن رستم شروین کی اولاد ظاہر کیا ہے، اس دوسرے شق کی بنیاد بظاہر وہی عام روایت ہے جس کی اصلاح کی کوشش پال کسنودا کے یہاں نظر آتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) "المرزبان" کے لفظ سے رستم بن مرزبان کے سوا اور کوئی شخص نہیں لیکن پال کسنودا کے خیال میں ابن الاثیر نے سطور ما بعد میں مذکورۂ بالا غلط نام کی گویا غیر شعوری طور پر خود ہی تصحیح کر دی ہے حالانکہ عبارت کے اسلوب سے ظاہر ہے کہ بعد میں المرزبان کا لفظ صرف اس سیاسی منصب کو ظاہر کرنے کے لئے آیا ہے جو رستم بن مرزبان کو فرمانروائے رے مجد الدولہ کی طرف سے حاصل تھا، یہی حال "اصبہبذ" اور الاصبہبذ کا ہے کہ صرف شہریار بن شروین (؟) کے لئے بہ طور لقب استعمال کیا گیا ہے چونکہ پال کسنودا یاقوت کی عبارت سے ایک اور غلط فہمی میں مبتلا تھا شاید اسی بنا پر اسلوب کلام کی طرف متوجہ نہ ہو سکا، ابن خلدون کی عبارت کے لئے دیکھو العبر ج ۴ ص ۴۶۶۔ [1] تاریخ یمینی: ص ۲۰۸ رستم بن مرزبان)، ص ۲۲۵، ۲۲۶ (رستم بن المرزبان) ص ۲۲۹ (ابو علی رستم بن المرزبان بن خال ابی طالب؟ بہ ظاہر ابو علی رستم بن المرزبان خال ابی طالب (مجد الدولہ) صحیح ہے)، ایضاً (ابو علی بن رستم؟ صحیح ابو علی رستم ہے)۔ طبع دہلی ۱۸۴۷ء، المینی: ج ۲ ص ۱۴۸ (ابو علی رستم بن اصبہبذ؟) مصر: حمد اللہ مستوفی، خال مجد الدولہ کا نام سالار ابراہیم بن مرزبان دیلمی بتاتا ہے (نزہۃ القلوب ص ۵۵ یورپ) [2] انساب سلاطین اسلام (Manuel.): ص ۱۸۹، ص ۲۱۷

تینوں شق غیر مسلّم ہیں اور امیر عنصر المعالی کی شہادت اس بحث کا قطعی فیصلہ کر دیتی ہے کہ:

"بشنودم اے پسر کہ وقتے در شہر رے، پیرزنے بود ملک زادہ، و عفیفہ و زاہدہ، و دخترِ عم مادرِ من بود و زنِ فخر الدولہ بود - و چون فخر الدولہ فرمان یافت او را پسرے ماند خورد، مجد الدولہ لقب نہادند و نامِ پادشاہی بر وے افگندند"[1]

قابوس نامہ کے ایک نسخہ میں یہ الفاظ ہیں کہ - "و دخترِ عم زادۂ مادرم بود الخ"[2] بہر حال عنصر المعالی کو والدۂ مجد الدولہ کی اصلیت و نسب سے جس قدر واقفیت ہو سکتی ہے وہ روشن ہے پس اس کی شہادت رد نہیں کی جا سکتی نسخوں کے اختلاف سے کچھ پیچیدگی ضرور پیدا ہو گئی ہے: لیکن اس حد تک تو اس بیان کا فائدہ قطعی ہے کہ والدۂ مجد الدولہ:

(الف) دخترِ رستم بن شروین نہیں ہو سکتی،

(ب) اس کو دخترِ مرزبان بن رستم شروین کہنا بھی غلط

(ج) اور دخترِ رستم بن شہریار بن دارا قرار دینا بھی محض غلط ہے،

رستم بن مرزبان (بشرطیکہ مرزبان بن رستم شروین ہی کا فرزند ہو) نسخۂ اول کی بنا، پر والدۂ مجد الدولہ کا ابن عم ہوتا ہے اور اس پر خالِ مجد الدولہ کا اطلاق صحیح ہو سکتا ہے لیکن نسخۂ ثانی کی تقدیر پر اس کی گنجائش نہیں نکلتی:

رستم بن مرزبان کا باوندی اصل سے ہونا بالکل واضح اور اس کے خلاف ہمارے علم میں کوئی شہادت نہیں - لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آل باوند کی تاریخ سے بحث کرنے والے اس کی اصلیت سے کچھ تعرض نہیں کرتے، رستم کو فخر الدولہ بویہی کے بعد سیدہ ملکہ رے کی بدولت زبردست عروج حاصل ہوا، اور سلطنت رے کے نظم و انصرام میں وہ پوری طرح دخیل ہو گیا تھا، شہریار کوہ (فریم) کی اصبہبذیت جس طرح رستم بن شروین کے عہد میں آل بویہ کے ماتحت تھی اصبہبذ مرزبان اور

---

[1] قابوس نامہ: صہ ۲۰ (گب میموریل سنہ ۱۹۵۱ء)
[2] ایضاً: صہ ۱۰۴ (سعید نفیسی، ۱۳۱۲ شمسی، تہران) منتخب قابوس نامہ: صہ ۱۴۶ (سنہ ۱۳۲۰ شمسی)

رستم بن مرزبان کے عہد میں بھی فخر الدولہ اور اس کے جانشین کے ماتحت رہی ہوگی اور رستم بن مرزبان تو یقیناً سلطنت رے کے ماتحت تھا، ۳۸۸ھ میں شہریار کوہ پر شہریار بن دارا (رستم بن مرزبان کا ابن عم) کا قبضہ ہوگیا اور رستم بن مرزبان حدود مملکت رے میں یہاں کی سلطنت سے وابستہ اور ملکۂ رے کا معتمد بنا رہا۔ لیکن وہ اپنے حریف مقابل شہریار بن دارا کی طرف سے غافل نہ ہوا، تسخیر شہریار کوہ کے بعد قابوس بن وشمگیر اور شہریار بن دارا کے دیرینہ تعلقات میں بتدریج کمی آتی گئی دوسری طرف رستم بن مرزبان اور مجد الدولہ کے روابط میں بھی نمایاں تغیر پیدا ہوگیا چنانچہ رستم نے قابوس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے شہریار کوہ پر حملہ کردیا اور اصبہبذ شہریار بن دارا کو شکست دی اور اسے گرفتار کرکے قابوس کے پاس بھیج دیا رستم نے قابوس کو اپنی اطاعت گزاری کا یقین دلانے کے لئے شہریار کوہ میں اس کے نام کا خطبہ[1] جاری کیا یہ واقعہ ۳۹۶ھ کا ہے اصبہبذ شہریار بن دارا بحکم قابوس قتل کیا گیا اور عام تاریخی روایات میں اسی پر باوندیہ طبقہ اول کا زمانہ ختم ہوگیا۔

شہریار کوہ کا علاقہ قابوس کے قلمرو سے متعلق ہوگیا لیکن یہاں کی مقامی حکومت (اصبہبذیت) ابھی انقراض پذیر نہ ہوئی تھی، بلکہ ۴۱۶ھ تک باقی رہی، چنانچہ ۴۰۷ھ میں آل بویہ کے خوان کرم کا ریزہ[2] ابن فولاذ کی مخالفت جب مجد الدولہ اور ملکۂ رے سے شروع ہوئی تو اس موقع پر آخر الذکر فریق کی امداد کو پریم کوہ کا اصبہبذ ایک جرار لشکر لے کر آیا اور ابن فولاذ کو ہزیمت دی، عتبی[3] اس واقعہ کا راوی ہے وہ اصبہبذ کا نام نہیں بتاتا ابن الاثیر بھی خاموش رہ جاتا ہے، ہاں کسنودا اپنے مزعومہ کی بنا پر اس اصبہبذ کو مرزبان بن رستم فرض کرتا ہے اور ہمارے خیال میں یہ رستم بن مرزبان ہو تو بعید نہیں۔ اسی طرح ۴۱۶ھ میں علاء الدولہ بن کاکویہ کے ایک مقابلہ میں اصبہبذ طبرستان مقتول ہوا تھا، اس اصبہبذ کی شناخت سے ہم قاصر ہیں البتہ دہخدا اس کا نام[4] رستم بن شہریار بتاتا ہے،

---

[1] تاریخ یمینی: صفحہ ۲۲۹ (سطرہ-۱۴)، المنینی: ج ۲ صفحہ ۱۴ مصر ۱۲۸۶ھ، مرعشی: صفحہ

[2] یمینی: صفحہ ۳۶۵ (سطرہ-۱۲)، المنینی: ج ۲ صفحہ ۱۹۶ [3] کامل: ج ۷ صفحہ ۲۰۳ (حوادث ۴۰۷ھ) الاستقامہ [4] لغت نامہ: ج ا صفحہ ۱۵۶ (۱۳۲۵ خورشیدی)

عثمانؓ

صرف تاریخ کی روشنی میں

از

(جناب ڈاکٹر طٰہٰ حسین)

مترجم

(مولانا عبدالحمید صاحب نعمانی)

عہد فاروقی کے عمّال اور حضرت عثمانؓ

یہ عامل جن کے نام حضرت عثمانؓ نے یہ فرمان لکھے تھے سب کے سب حضرت عمرؓ کے مقرر کردہ تھے، حضرت عثمانؓ نے ان کو اپنے عہدوں پر سال بھر باقی رکھا جس کی خود حضرت عمرؓ نے وصیت کی تھی، دور اندیشی اور معاملہ فہمی کے پیش نظر اس سے صحیح کوئی اور وصیت نہیں ہو سکتی تھی، حضرت عمرؓ کو خطرہ ہوا کہ کہیں اقتدار سے مستفید ہونے میں خلیفہ عجلت کر بیٹھے، بعض جدید تقررات یا بعضوں کو معزول کر دے ایسی حالت میں عُمّال نے جن کاموں کا آغاز کر رکھا ہے اس میں رکاوٹ یا تعطل پیدا ہو جائے گا جس سے سرحدوں اور شہروں میں مسلمانوں کے معاملات میں ایک گونہ بدنظمی اور انتشار پھیلے گا۔ حضرت عثمانؓ نے اس وصیت پر پوری شدت کے ساتھ عمل کیا اور عاملین کے لئے ضروری قرار دیا کہ وہ عثمانی عہد میں یا اس کے پہلے سال تک اسی سیاست پر عمل درآمد کرتے رہیں جو حضرت عمرؓ چلاتے رہے، حضرت عثمانؓ نے پورے سال بھر عزل و نصب کی کوئی کارروائی نہیں کی اور جو کچھ عُمّال کی طرف سے ہوتا رہا اسے منظور فرمایا۔

مکہ کے گورنر نافع بن عبد الحارث خزاعی تھے اور جیساکہ آپ جانتے ہیں وہ قریشی نہیں ہیں، اور طائف کے گورنر سفیان بن عبد اللہ ثقفی تھے اور وہ بھی قریشی نہیں ہیں طائف بنی ثقیف کا شہر ہے، صنعا کی گورنری یعلی بن منیہ تھے اور وہ بھی صلبی قریشی نہیں ہیں بلکہ بنی نوفل بن عبد مناف کے حلیف ہیں جند کے گورنر عبد اللہ بن ابو ربیعہ تھے جو بنی مخزوم سے ہیں اور قریشی ہیں کوفہ کے گورنر مغیرہ بن شعبہ تھے جو ثقفی ہیں بصرہ کے گورنر ابو موسیٰ اشعری تھے جو نہ قریشی ہیں، نہ مضری اور نہ عدنانی بلکہ یمنی ہیں مصر کے گورنر عمرو بن عاص تھے جو بنی سہم سے ہیں اور قریشی ہیں حمص کے گورنر عمیر بن سعد تھے جو انصاری ہیں اور دمشق کے گورنر معاویہ بن ابی سفیان تھے وہ بنی امیہ سے ہیں اور قریشی ہیں فلسطین کے گورنر عبد الرحمٰن بن علقمہ تھے اور وہ کنانی ہیں، بحرین اور اس کے مضافات کے گورنر عثمان بن ابی عاص ثقفی تھے۔

یہ عاملوں کی اور ان کے مقامات کی تفصیل ہے حضرت عثمانؓ نے وصیت کے مطابق اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی، اور اپنی خلافت کے پورے ایک سال تک نہ کوئی جدید تقرر کیا اور نہ کسی کو معزول کیا لیکن اس کے سوا معاملات میں انھوں نے اقدامات کئے، چنانچہ عبید اللہ بن عمرؓ کے مقدمے کا فیصلہ کرنے، گورنروں، افسروں اور عوام کے نام فرامین لکھنے کے بعد سب سے پہلا کام جو آپ نے انجام دیا وہ لوگوں کے وظیفوں میں اضافہ کر دینا تھا، آپ نے مقررہ روزینے میں سو، سو کا اضافہ کر دیا، حالانکہ آپ کی خلافت اور حضرت عمرؓ کے وصال پر ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی گذرنے نہ پائے تھے، اور اس وقفے میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں ہوئی تھی جسے اس غیر معمولی اضافے کا باعث بتایا جا سکے، تب اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ اپنی خلافت کا آغاز لوگوں کی خوش حالی اور فارغ البالی سے کرنا چاہتے تھے، لیکن معلوم نہیں خلیفہ، اس قسم کی عام خوش حالی کے لئے بیت المال سے اخراجات کرنے کا جب کہ نہ تو لوگوں کی ضروریات کا تقاضا ہو اور نہ بیت المال کی آمدنی غیر معمولی طور پر بڑھ گئی ہو کہاں تک مجاز ہے؟

لیکن کم از کم اتنا تو بہر حال ماننا پڑے گا کہ حضرت عثمانؓ کا یہ اضافہ، حضرت عمرؓ کے مالی مسلک سے کچھ تھوڑا سا انحراف ہے، جس میں بیت المال کی بچت اور بقدر ضرورت خرچ، دونوں باتیں پیش نظر تھیں، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کو حضرت عمرؓ کی مالی سیاست میں ایک قسم کی سختی محسوس ہوتی تھی اور وہ دل ہی دل میں اس شدت کو ناپسند فرماتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ فاروق اعظمؓ جو کچھ لوگوں کو دیتے ہیں بیت المال میں اس سے زیادہ دینے کی گنجائش ہے، لیکن یہ بالواسطہ حضرت عمرؓ کی اس زندگی پر تنقید ہے جس کا تعلق بیت المال کی سیاست سے ہے۔

اور کیوں نہ ہم اشارات اور کنایات کا پردہ ہٹا کر کھلے طور پر عرض کریں کہ حضرت عثمانؓ نے خود عوام کے خرچ پر عوام تک پہنچنے کی کوشش کی کہ بیت المال خلیفہ کا نہیں عام مسلمانوں کا بیت المال تھا، اور ایسا کرنے میں وہ حق بجانب تھے اس لئے کہ اگر وہ مسلمانوں کی طرف سے اس کے مجاز تھے کہ ان کے لئے روزینے مقرر کریں تو وہ اس کے بھی حقدار تھے کہ بیت المال کے حالات کے ماتحت وظیفوں کی مقدار بڑھا دیں یا گھٹا دیں لیکن یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت عثمانؓ کے اس اضافے نے وہ دروازہ کھول دیا جس کے بند کرنے کی کوئی صورت نہ تھی اس لئے کہ اضافے کی تو حد ہی نہیں ہے پھر خلیفہ آج اگر عوام کے وظیفے بڑھا سکتا ہے تو کل اپنے خواص کے لئے بھی گنجائش نکال سکتا ہے اور پھر اس کے بعد عوام کی دولت کے لئے حرص و طمع کی راہیں کھل جاتی ہیں، حضرت عثمانؓ ایک فیاض اور دریا دل سخی تھے اللہ کی راہ میں اپنی دولت بے حساب خرچ فرماتے تھے، اپنے دوستوں اور عزیزوں پر بھی بے شمار صرف کرتے تھے ان کا یہ عمل نہ صرف یہ کہ قابل اعتراض نہ تھا بلکہ خدا کی طرف سے جزائے خیر کا مستحق ہے لیکن حضرت عثمانؓ کی دولت بہر حال عوام کی گنجائش کے لئے تنگ تھی اور وہ اس میں سے عوام کے وظیفوں کی مقدار نہیں بڑھا سکتے تھے۔ اس لئے انھوں نے خود عوام ہی کی دولت سے ان کے روزینوں میں اضافہ کر دیا اور ایک ایسا دروازہ کھول دیا جس میں داخل ہونا تو لوگ جانتے تھے لیکن اس سے نکلنا انھیں معلوم نہ تھا۔

پس یہ بات صحیح نہیں کہ حضرت عثمانؓ اپنی خلافت کے ابتدائی ایام میں بڑی احتیاط کے

کے ساتھ حضرت عمرؓ کے طریق پر کاربند رہے، محض منصب خلافت کے حاصل ہونے پر یکایک وظیفوں میں اضافہ فاروق اعظم کا طریق کار نہ تھا، حضرت عثمانؓ نے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کیا اور اُن کی روزی بڑھادی، ظاہر ہے کہ یہ بات عوام کی نگاہ میں قابل اعتراض نہیں ہو سکتی اس لئے کہ اپنی خوش حالی میں اضافہ سے کوئی رنجیدہ نہیں ہوتا، بلکہ فطری بات تو یہ ہے کہ لوگوں نے اس بات پر ٹھنڈی سانس لی ہوگی کہ حضرت عثمانؓ نے خلیفہ ہوتے ہی ان کی آمدنی بڑھادی، ان کو فاروقی شدت سے رہائی دلائی، اُن کی معتدل فراغت میں جو حضرت عمر کی مالی سیاست کا نتیجہ تھی غیر معمولی وسعت پیدا کردی بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے زندگی بھر اس سلسلے میں قرآن مجید کی یہ آیت پیش نظر رکھی :۔

ولا تجعل یدک مغلولۃ الیٰ عنقک

ولا تبسطھا کل البسط فتقعد

ملوما محسورا

وظیفوں میں اضافہ | پھر حضرت عثمانؓ نے وظیفوں میں اضافے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ بقول مورخین شہروں سے وفود طلب کئے تاکہ لوگ وظیفے اور مراعات پا سکیں، اخراجات میں اضافے کی یہ وہ مدتھی جس کا حضرت عمرؓ خیال بھی نہیں فرما سکتے تھے، حضرت عمرؓ نے تو مدینہ والوں کے لئے رمضان کے دنوں میں جو خصوصی اضافہ منظور فرمایا تھا وہ ہر ایک کے لئے روزانہ ایک ایک درہم اور ازواج مطہرات کے لئے دو دو درہم تھا، یہ اضافہ ان کی فارغ البالی کے لئے کافی تھا اور وہ بال بچوں سمیت اس سے خوش تھے حضرت عمرؓ نے لنگر خانوں میں بھی اضافہ فرمایا جب آپ نے محسوس کیا کہ اس طرح لوگوں کی خودداری بھی باقی رہتی ہے اور ان افراد کے لئے بھی سہولت ہوتی ہے جو دوسروں کے کفیل ہیں لیکن جب حضرت عثمانؓ کے عہد میں رمضان کے دن آئے تو انھوں نے فاروقی اضافے کے علاوہ لنگر خانوں کو تمام ضرورت مندوں اور ہر وقت آنے والوں کے لئے عام کر دیا۔

بلاشبہ حضرت عثمانؓ کا یہ طریقہ نیکی اور سلوک میں ڈوبا ہوا طریقہ تھا، لیکن اس میں بھی شک

نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے عوام کے مال میں لوگوں کے لئے حرص وطمع کی ایک راہ نکلتی تھی اور زیادہ سے زیادہ اپنا بھلا کرنے کا جذبہ رغبت پا رہا تھا، ہر آدمی اپنی خواہش پر اتنا قابو یافتہ کہاں کہ انتہائی مجبوری ہی پر لنگر خانوں میں داخل ہو، بلکہ بہت سے لوگ ایسے ہو سکتے ہیں کہ اپنے عام مقررہ روزینے میں روزے کا اضافہ شامل کر لینے کے بعد بھی لنگر خانے چلے جائیں اور ضرورت مندوں اور تازہ واردوں کی طرح شکم سیر ہوں۔

یہ سب کچھ حضرت عثمانؓ کی فیاضی اور دریا دلی ہے اور یقیناً اس میں اچھائی اور بھلائی کے مواقع ہیں لیکن یہ بعض ان خطرات سے خالی نہیں جو سیاسی اور اخلاقی پہلو رکھتے ہیں پھر اس میں بدگمانی اور فضول گوئی کے لئے بھی گنجائش ہے اور ایک نقاد کو کون روک سکتا ہے کہ وہ خود خیال کرے یا لوگوں تک اپنا یہ خیال پہنچائے کہ یہ دریا دلی درحقیقت ایک پبلسٹی تھی جو ایک خلیفہ نے اپنے حق میں سخاوت اور فیاضی کے نام پر کی۔

جلیل القدر صحابہ پر نظر کرم پھر حضرت عثمانؓ کی سخاوت یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ جیسے جیسے دن گذرتے گئے اور آپ کی خلافت آگے بڑھتی گئی، آپ نے ممتاز صحابہ کو ان کے مقررہ وظیفے پر مستزاد عطیات دیئے ابن سعد کی روایت کے مطابق آپ نے زبیر ابن عوام کو ۶ لاکھ، طلحہ کو ۲ لاکھ کا عطیہ دیا اور ان پر آپ کا جو کچھ قرض تھا وہ بھی معاف کر دیا، ابن سعد کہتے ہیں کہ زبیر کو جب یہ عطیہ ملا تو وہ لوگوں سے پوچھتے پھرتے تھے کہ کوئی بہتر سے بہتر کاروبار بتاؤ، جس میں، میں اپنا سرمایہ لگا کر نفع حاصل کر سکوں چنانچہ انھیں بتایا گیا کہ شہروں اور صوبوں میں مکانات تعمیر کرا لیجئے۔

عام معاملات میں فاروق اعظمؓ کی سیرت سے ہٹنے میں حضرت عثمانؓ یہیں آ کر نہیں رک گئے بلکہ انھوں نے اس سے بھی زیادہ خطرناک مخالف قدم اٹھایا اور جلیل القدر صحابہ کو اجازت دے دی کہ وہ حجاز سے باہر نکلیں اور مختلف مقامات پر جا کر بسیں حالانکہ حضرت عمرؓ نے ان کو مدینہ میں روک رکھا تھا اور اپنی خاص اجازت کے بغیر کسی کو باہر نہیں جانے دیتے تھے، وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ میں قریش اور فتنہ وفساد کے درمیان ایک دیوار ہوں، حضرت عثمانؓ نے یہ دیوار گرا دی۔

جب حضرت عثمانؓ نے لوگوں کے گذارے میں اضافہ کر دیا، اور انعام واکرام کے طور پر بڑی بڑی رقمیں عنایت کر دیں پھر ان انعام واکرام پانے والوں کو اس بات کی اجازت بھی دے دی کہ وہ ممالکِ محروسہ میں جہاں جی چاہے جاکر فاتح فوجیوں اور محکوم رعایا سے اپنے تعلقات بڑھائیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ ایک طرف ان کی ثروت اور دولت میں غیر معمولی ترقی ہو، دوسری طرف ان کے متبعین اور ماننے والوں کی تعداد بڑھے، اور پھر ان میں سے ہر ایک اپنی پارٹی کا لیڈر بنے اور اپنے آپ کو مسلمانوں کے معاملات کا والی بننے کا زیادہ حقدار خیال کرنے لگے اور اس کے لئے فرصت اور مواقع کی تلاش میں بھی رہنے لگے؟

ابھی ابھی ہم نے وہ فرامین نقل کئے ہیں جن میں حضرت عثمانؓ نے فاروق اعظم اور صدیق اکبر کے طریقِ عمل کی اتباع اپنے لئے ضروری قرار دی ہے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے کیوں ایک دوسری راہ اختیار کی؟ اس میں شک کی مطلق گنجائش نہیں کہ دین کے بارے میں انھوں نے کوئی لیپا پوتی نہیں کی، یہ بھی یقینی ہے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی انھوں نے اپنے مسلک کو شیخین کے طرزِ عمل کا مخالف خیال نہیں کیا، آپ نے جو کچھ کیا اس کا مقصد جان بوجھ کر کوئی زیادتی یا ہوس نہ تھی، لوگوں کا مال تھا لوگوں تک پہنچا دیا، بیت المال میں دولت جمع دیکھی، اس کے باقی رکھنے کی زیادہ فکر نہیں کی لوگوں کو دے دینا زیادہ مناسب جانا اور اس میں کیا حرج ہے کہ وہ اس مال میں سے کم یا زیادہ نبیؐ کے ان اصحاب کو بطور صلہ دے دیں جو اسلام کے امام اور حکومت کے بانی کی حیثیت رکھتے ہیں، جنہوں نے نبیؐ کی زندگی میں بڑی بڑی مصیبتیں برداشت کیں اور شدید ترین آزمائشوں میں مبتلا کئے گئے اللہ نے دولت کی فراوانی کر کے اپنا وعدہ پورا کیا، پھر ان مہاجرین کے علاوہ وہ کون لوگ ہیں جنہیں اس دولت سے مستفید ہونے کا حق ہے۔

بلاشبہ حضرت عثمانؓ کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ وہ موروثہ سنت کی کوئی خلاف ورزی کر رہے ہیں انھوں نے جو کچھ کیا وہ ان کی کریمانہ افتادِ طبع تھی، اور مسلمانوں کو

خوش حال بنانے کا جذبہ، نیز اصحاب رسول پر نظر عنایت، اور ان میں سے ایک بات بھی ایسی نہیں جسے گناہ کہا جا سکے، یہ تو آپ کی خوبی تھی، بھلائی تھی اور نیکی،

لوگوں کو بھی اس میں کوئی حرج کی بات نظر نہ آئی، انھیں دولت ملی انھوں نے ناپسند نہیں کیا اور نہ واپس کیا، ان میں سے کسی کو اس میں بھی کوئی حرج نظر نہیں آیا کہ نبی کے ممتاز اصحاب اور مہاجرین میں سے سابقین اولین انعام و اکرام کے مستحق بنیں، اور میرا خیال ہے کہ اگر حضرت عثمانؓ عوام کی خوش حالی اور جلیل القدر صحابہ کی قدر دانی پر ہی اکتفا فرماتے تو لوگ ان سے ناراض نہ ہوتے اور شاید اسی مفہوم کی تعبیر مؤرخین کا یہ متفقہ بیان ہے کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کا ابتدائی دور سکون اور خوش دلی کا دور تھا، نرمی، سہولت اور چشم پوشی نے مسلمانوں میں عثمانی خلافت کو حضرت عمرؓ کے مسلک سے کہیں زیادہ مقبول بنایا جس کی بنیاد شدت اور تدبر پر تھی، اور شدت اور تدبر کا تقاضا ہے کہ لوگ صبر کریں غیر معمولی ثابت قدمی اور ناقابل برداشت مصائب برداشت کریں۔

مناسب ہوگا کہ ہم حضرت عثمانؓ کو ان کی خلافت کے پہلے برس یا ابتدائی برسوں میں نرم اور فیاض پالیسی پر گامزن رہنے دیں اور ایک نظر اس جماعت پر ڈالیں جو اس عثمانی مسلک کی پیدا کردہ تھی تاکہ اس بات کا اندازہ لگایا جا سکے کہ حضرت عثمانؓ کی سیاست کامیابی سے ہم کنار ہو بھی سکتی تھی یا نہیں؟

حضرت عثمانؓ کی رعایا

طبری سری سے اور وہ شعیب سے اور وہ سیف سے اور وہ عمارۃ بن قعقاع سے اور وہ حسن بصری سے روایت کرتے ہیں کہ

"حضرت عمرؓ نے ممتاز قریشی صحابہ پر پابندی لگا رکھی تھی کہ وہ مدینہ چھوڑ کر باہر نہ جایا کریں اور اگر جانا ہو تو مقررہ مدت کے لئے اور وہ بھی خاص اجازت لے کر، اور جب ان لوگوں نے اس کی شکایت کی اور یہ شکایت حضرت عمرؓ تک پہنچی تو آپ کھڑے ہوئے اور فرمایا ــــ سن لو میں نے

اونٹ کی طرح اسلام کی منزلیں مقرر کی ہیں، ابتدا میں اونٹ نوخیز ہوتا ہے، پھر اس کے آگے کے دانت ٹوٹتے ہیں، پھر اس کے بازو کے اس کے بعد وہ سدیس ہوتا ہے یعنی عمر کا پختہ اس کے بعد بازل یعنی بوڑھا، بوڑھے سے ترقی کی امید نہیں کی جاسکتی، ہاں سن لو یہ اسلام کے لئے انحطاط کا دور ہے قریش والے چاہتے ہیں کہ اللہ کا مال اس کے بندوں کے سوا دوسری مزدوریوں میں رکھ لیں لیکن یاد رکھو کہ جب تک عمرؓ کی جان میں جان ہے ایسا نہیں ہوسکتا میں مکہ کے پہاڑ حرہ کی گھاٹی پر قریش کی گردن اور کمر پکڑے کھڑا رہوں گا اور ان کو آگ پر ٹوٹ پڑنے سے روکے رکھوں گا۔"

طبری ہی سری سے اور وہ شعیب سے اور وہ سیف سے اور وہ محمد اور طلحہ سے روایت کرتے ہیں کہ

"جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے ان ممتاز صحابہ پر وہ نظر نہیں رکھی جو حضرت عمرؓ رکھتے تھے چنانچہ وہ شہروں میں جا بسے جہاں جاکر انھوں نے دنیا دیکھی اور دنیا نے ان کو دیکھا پھر کیا تھا عوام کا وہ طبقہ جس کا کسی ایثار و قربانی میں حصہ نہ تھا اور جو کسی اسلامی خصوصیت کا مالک نہ تھا، جماعتیں بن بن کر ان حضرات کے گرد جمع ہونے لگا ان کو ہر قسم کی امیدیں دلاتی اور حوصلے بڑھاتے تاکہ ان کے مقتدر ہونے کے بعد اس کو مُقرّب اور ساتھی بننے کا موقع ملے، یہ سب سے پہلا رخنہ تھا جو اسلام میں پڑا اور یہ سب سے پہلا فتنہ تھا جس کے عوام شکار بنے۔"

پھر طبری ہی سری سے اور وہ شعیب سے اور وہ سیف بن عمر اور شعبی سے روایت کرتے ہیں کہ

"حضرت عمرؓ کا وصال اس حالت میں ہوا کہ قریش ان سے تنگ آچکے تھے جن کو انھوں نے مدینہ میں بند کر رکھا تھا اور ان کو مخاطب کرکے فرماتے تھے کہ مجھے قوم کے لئے سب سے زیادہ خطرہ شہروں میں تمہارے پھیل جانے سے ہے، ان میں سے کبھی کوئی اگر جہاد میں جانے کی اجازت بھی چاہتا تو آپ فرماتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شرکت کرکے آپ نے اپنے لئے

بہت کچھ کرلیا ہے، اب تو تمہارے لئے جہاد سے بھی اچھا یہ ہے کہ نہ تم دنیا دیکھو اور نہ دنیا تم کو
دیکھے، پھر جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے ان کے لئے راستہ صاف کردیا اور وہ
شہروں میں پھیل گئے اور لوگ ان کی طرف جھک پڑے، چنانچہ اس نقطہ نظر سے حضرت
عثمانؓ حضرت عمرؓ سے زیادہ مقبول تھے[1]

اب ہم حضرت عثمانؓ کی قریشی رعایا سے بحث کی ابتدا کرتے ہیں اور بتانا چاہتے ہیں کہ اس
عایا کے متعلق حضرت عمرؓ کا نقطہ نظر کیا تھا؟ فاروق اعظم کو قریش سے جس قدر خطرہ تھا اتنا کسی
ر سے نہ تھا، ساتھ ہی وہ اس سے بھی انتہائی خائف تھے کہ کہیں خود قریش فتنوں کا شکار نہ ہوجائیں،
س لئے کہ وہ اس قبیلے کی رگ رگ سے واقف تھے، وہ خوب جانتے تھے کہ اس میں بڑی سے
ی قوت کیا ہے اور چھوٹی سے چھوٹی کمزوری کہاں ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ قریش جس میں خود حضرت
رؓ نے پرورش پائی تھی اسلام کی حلقہ بگوشی سے پہلے قوت اور کمزوری یا خوبی اور خرابی دونوں
یں ممتاز حیثیت کا مالک قبیلہ تھا، اس کی قوت کا سرچشمہ اس کا وہ پوزیشن تھا جو کعبۃ اللہ کی وجہ سے
س کو حاصل تھا، حج کے مناسک تمام تر اسی کے ساتھ وابستہ تھے۔ یہی قبیلہ تمام عربوں کو حج کراتا تھا
وران پر ایک رہنمایانہ فوقیت اور غلبہ رکھتا تھا، اور یہ اس کا وہ امتیاز تھا جس میں کوئی اس کا
ریک اور حصہ دار نہ تھا، اور اس لئے وہ خیال کرتا تھا کہ تمام دوسرے عربی قبائل پر اس کو ایک
یادت اور سرداری حاصل ہے، اور خود عربوں کو اس کی برتری اور سرداری کا اعتراف تھا اس لئے
ہیں کہ وہ کوئی غیر معمولی جنگجو اور بہادر قبیلہ ہے یا اس کی تلوار کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے، قریش
عربوں کی نگاہ میں لڑاکو اور شمشیر آزما تھے ہی نہیں بلکہ اس لئے کہ دین کے تمام معاملات کا اسی
قبیلے سے تعلق تھا اور دین کی ہر چھوٹی بڑی بات اسی کے ذریعے انجام پاتی تھی، اس کی قوت اور
قتدار کا دوسرا سرچشمہ اس کی وہ زبردست اور غیر معمولی تجارت تھی جو پورے عرب کے کاروبار پر
الب اور حاوی تھی، ان قوتوں کی بنا پر قریش نے اپنے قدم جما رکھے تھے اور حرم اور اس کے گردوپیش

---

[1] تاریخ طبری ۳۵ھ کے حالات

کے مقامات کو امن اور سلامتی کا گہوارہ بنا دیا تھا۔ قوت کے انھیں دو چشموں نے ان میں ہمت، حوصلہ تدبر اور چالاکی کے وہ اوصاف پیدا کر دیے تھے جن سے بنی ثقیف کے علاوہ تمام عربی قبیلے محروم تھے، بیوپار اور تجارت کی سرگرمیوں نے ان کو اس درمیانی کڑی کا درجہ دے دیا تھا جو مشرق قریب کو مشرق بعید سے ملا دیتی ہے اور اس اتصال کی وجہ سے مشرق اور مغرب کے یا یوں کہئے کہ روم اور ہندوستان کے درمیان تعلقات کا سبب یہی قریش تھے، قریشیوں نے اپنے اس پوزیشن کی بدولت غیر معمولی دولت پیدا کی اور دولت سے بھی کہیں بڑھکر تجربات حاصل کئے اور معاملات میں پختگی پیدا کی بہرحال وہ دولت کی کثرت نے ان کو حرص کا سبق بھی دیا حفاظت کرنا اور انتہائی احتیاط اور باریک بینی سے نفع اندوزی کے لئے سرمایہ لگانا بھی سکھایا، پھر مسلسل تجربات، مختلف قوموں سے معاملات اور میل جول نیز دور دراز مقامات کے لمبے لمبے سفروں نے ان کو مشکلات کا مقابلہ کرنا، مصائب سے گذر جانا، اور دشواریوں پر قابو پالینا سکھایا، ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش عربی قبائل میں سب سے زیادہ پختہ کار ماہر اور چالاک قبیلہ بن گیا۔

یہ وہ اسباب تھے جس کے نتیجے میں قریشیوں کے حوصلے بڑھے، ان کی خواہشوں کی کوئی حد نہ رہی، ان کی طاقتِ برداشت نے مصائب کو آسان کر لیا، مشکلات کی ہنسی اڑائی اور ان کو حل کیا، وہ اس سے بھی آگے بڑھے اور اس سے بھی خطرناک منزل میں قدم رکھا، انھوں نے سماج کی مقررہ قدروں کو پامال کیا، عوام کے مراسم اور دینی معتقدات کا مضحکہ اڑایا، اور اپنے نزدیک یا دور کے مفاد کی راہ میں سب کچھ مباح کر دیا دین کی امانت کا پردہ اپنی تدبیروں کے لئے استعمال کرتے رہے، حالانکہ دین سے ان کو کوئی تعلق نہ تھا، اس لئے کہ قریش کے سردار دین کو زیادہ سے زیادہ وسیلہ تصور کرتے تھے مقصد نہیں، ان کی نگاہ میں بتوں کے مجسمے رزق اور اقتدار کا ذریعہ تھے اور کچھ نہیں قریش کا ایک مطلبی، چالاک، اور دبنگ سردار جب مشکلات میں گھر جاتا تو وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کس طرح بھنور سے صحیح سلامت نکل سکے گا۔

حضرت عمرؓ قریش کا یہ سب کچھ دیکھ چکے تھے، اس لئے ان کے فریب میں نہ آسکے اور اپنی رائے ان کے متعلق اس وقت بھی نہ بدل سکے جب قریشی اسلام کی طاقت کا یقین کر کے اس کے حلقہ بگوش ہو چکے یہی وجہ تھی کہ آپ نے پوری احتیاط برتی اور اپنے مسلک میں ان کے لئے کسی نرمی اور چشم پوشی کی گنجائش نہیں رکھی اور کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ ان کو ہوس پورا کرنے، بڑے بڑے مقاصد پا لینے، اپنی شان بڑھانے اور دوسروں کو گھٹانے کا موقع ملے، بلاشبہ حضرت عمرؓ کی نگاہوں سے مہاجرین کی فضیلت اور امتیاز کا وہ درجہ اوجھل نہیں تھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا تھا چنانچہ انھوں نے ان کو ہر طرح مکرم اور معزز رکھا، اور اپنی بہت سی عنایتوں اور الطاف سے نوازتے رہے لیکن اعزاز و اکرام کی یہ تمام باتیں حضرت عمرؓ کو اس بات پر مطمئن اور رضامند نہ کر سکیں کہ اپنی خلافت کے دور میں مہاجرین کو ان کے من مانے مقاصد کے لئے آزاد چھوڑ دیں۔ قریش کے بارے میں حضرت عمرؓ کا نقطۂ نظر آپ کے اس طرز عمل سے واضح ہو جاتا ہے پھر آپ کا یہ فرمانا کہ میں حرہ کی گھاٹی پر کھڑا قریش کو آگ میں کودنے سے روکے رکھوں گا، اسی طرح جہاد میں شرکت کی اجازت مانگنے والے مہاجر صحابہ سے آپ کا یہ ارشاد کہ آپ نے رسول اللہ صلعم کے ساتھ جہادوں میں شرکت کر کے اپنے لئے بہت کچھ کر لیا ہے اب آپ کے لئے جہاد سے بھی اچھا یہ ہے کہ دنیا کا منہ نہ دیکھیں اور نہ دنیا آپ کا منہ دیکھے آپ کا نقطۂ نظر اور زیادہ واضح کر دیتا ہے اور غالباً حضرت خالد بن ولید کے معاملے میں شدت، ان کی معزولی اور ان پر سخت احتساب، بحث کے وہ پہلو ہیں جو حضرت عمرؓ کے نقطۂ نظر کو سب سے زیادہ اُجاگر کرتے ہیں، حالانکہ خالد بن ولید خدا کی ان پر رحمت ہو عہد نبوی میں، پھر دورِ صدیقی میں، عربی رومی جنگ کے سلسلے میں تمام آزمائشوں میں ثابت قدم رہ چکے ہیں لیکن حضرت عمرؓ کے اس طرز عمل کا سبب یہی تھا کہ وہ قریش کو اچھی طرح جانتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ قوت مل جانے کے بعد کس طرح وہ اس کا غلط استعمال کرنے لگتے ہیں اور اپنی کمزوریوں پر غالب آتے ہیں، اوپر کی سطروں میں قریش

کی جس قوت کی ہم نے تصویر کھینچی ہے یہی درحقیقت ان کی کمزوری یا خرابی کا سرچشمہ ہے، اس لئے کہ یہی قوت انھیں غلو پر آمادہ کرتی اور وہ نخوت اور تکبر کے بھنور میں پھنس جاتے، یہی قوت ان میں مال کی محبت اور پھر مال کی حرص پیدا کرتی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ استحصال اور ناحق وصولی کی زد میں آجاتے، یہی قوت ان کو اپنا بھلا چاہنے پر راغب کرتی اور وہ تیار ہو جاتے کہ فوری اور سہولت سے حاصل ہونے والے منافع سے لطف اندوز ہوں اور اس قسم کے منافع بسا اوقات گناہ سے خالی نہیں ہوتے، یہی قوت ان کو حرص وطمع کی دعوت دیتی جس کی کوئی حد ہی نہیں ہے چنانچہ حرص وطمع کے ہاتھوں وہ حدود سے بڑھ جاتے، جن باتوں کی خواہش مناسب نہیں ان کے حوصلے کرتے، اسی طرح جبر اور زیادتی کے مواقع بھی آجاتے۔ فاروق اعظم کو جب ان مہاجرین سے بھی یہ تمام خطرات تھے جنھیں نبی صلعم کی طویل صحبت حاصل تھی جو تمام مواقع پر آزمائشوں میں ثابت قدم رہے تو پھر وہ قریشی جو بہت بعد میں مسلمان ہوئے ان سے تو حضرت عمرؓ کو بہت زیادہ محتاط اور پرحذر رہنا ضروری تھا۔

یہ بعد میں اسلام لانے والے قریشی جن میں بہت سے جوان اور بوڑھے شامل ہیں ہنسی خوشی مسلمان نہیں ہوئے تھے، کچھ لوگ تو فتح کے نقارچی بن کر جب دیکھا کہ اسلام کا پلہ بھاری نظر آتا ہے تو اس طرف جھک پڑے اور کچھ لوگ مجبور ہوئے کہ سارا مکہ اُمڈ آیا ہے اب ان کے لئے کوئی چارۂ کار نہیں، مسلمان ہو گئے، بہرحال اسلام کے متعلق ان ایمان لانے والوں کا یہ خیال نہیں تھا کہ وہ ایک دین ہے جس کا تعلق دلوں کی دنیا سے ہے جو اللہ کے شعائر اور حقوق سے وابستہ ہے بلکہ وہ تو اس کو ایک غیر معمولی "چانس" تصور کرتے تھے جس طرح کہ وہ اور بہت سے مواقع سے کبھی اپنے ملک میں اور کبھی بیرونی ممالک میں فائدہ اٹھاتے رہے، اسلام قبول کرتے وقت ان کے پیش نظر تھا کہ نبیؐ نے قریش سے اسلامی دعوت کے سلسلے میں وعدہ کیا ہے کہ وہ دنیا کی عزت اور عقبیٰ کا ثواب دونوں دیں گے چنانچہ بہت سے تو دنیا کی عزت اور خوش حالی کے خیال سے اور کچھ لوگ آخرت کے ثواب کا خیال کر کے مسلمان ہوئے، پھر اسی خیال سے انھوں نے جہاد اور فتوحات کی راہ میں مصائب برداشت کئے، قربانیاں کیں۔ اور یہ مصائب اور وہ قربانیاں بعض مواقع پر اوروں سے بڑھ چڑھ کر رہیں۔

مثنوی رومی میں بے جا تصرفات

از

(جناب ڈاکٹر محمد احمد صدیقی ام۔ اے ڈی فل الہ آباد یونی ورسٹی)

مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ ایک طویل مگر دقیق اور فلسفیانہ مثنوی ہے اور اہل دل اور اہل علم حضرات میں اس کی بڑی قدر و منزلت ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ مولانا جامی علیہ الرحمۃ نے اس کے علوشان کو یہ کہہ کر ظاہر کیا ہے کہ

مثنوی مولوی معنوی ہست قرآں در زبانِ پہلوی

یعنی چونکہ اس مثنوی میں مابعد الطبیعیاتی مسائل قرآن وحدیث کے عین مطابق بیان ہوئے ہیں گو فلسفیانہ رنگ میں ہیں اور زبان ہے فارسی قدیم پہلوی اور دری داری اس لئے یہ مثنوی گویا زبان فارسی میں قرآن کی تفسیر بلکہ خود قرآن (پڑھنے کے قابل چیز) ہے۔

پھر جب خود قرآنِ عربی، اہلِ زیغ و اہلِ ہوئی کی شرارت آمیز تصرف و تحریف سے نہ بچ سکا اگرچہ بفحوائے

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالےٰ نے لے لیا

تو یہ قرآن پہلوی متنطعین اور محرفین کی شرارتوں سے کیوں بچ جاتا چنانچہ یہی ہوا کہ اہلِ غرض نے اس میں بھی عجیب عجیب تصرفات کئے، معنوی تصرفات و تحریفات تو انھوں نے اس میں کئے ہی تھے چنانچہ عالم نما جاہلوں نے اس کے بعض اشعار کا مطلب کچھ کا کچھ بتایا اور پھیلایا ہے۔ مثلاً مثنوی کا ایک شعر ہے:-

(۱) روزہا گر رفت۔ گو، رو، باک نیست تو بماں، اے آنکہ چوں تو پاک نیست

اس کا مطلب عموماً یوں کہہ دیا جاتا ہے کہ زمانہ گذرا چلا جاتا ہے تو گذرنے دو کچھ پروا نہیں۔ اے وہ ذات جس کے برابر کوئی دوسرا پاک نہیں تو رہ جا۔ مگر اس شعر میں روز کا لفظ دراصل حضرات صوفیہ کی ایک اصطلاح کے طور پر بولا گیا ہے زمانہ اور دن کے متعارف معنوں میں نہیں بولا گیا ہے۔ روز کہتے ہیں کیفیات ولذات واحوال کو۔ مولانا کا مطلب یہ ہے کہ مبتدی صوفی کیفیات ولذات کو بہت کچھ سمجھتے ہیں اور عمل اور ذکر کو وہ ابالی کھچڑی اور بے مرچ کا سالن جانتے ہیں بغیر کیفیات ولذات کی چٹنی کے عمل و ذکر کا لقمہ ان کے حلق کے نیچے نہیں اترتا۔ حالانکہ عارف کو ذات کا طالب ہونا چاہئے لذات کا نہیں۔

اس پر مولانا فرماتے ہیں کہ اگر کیفیات و لذات چلی جائیں تو چلی جائیں ۔ لذات نہ ہوں تو بلا سے نہ ہوں ہم ان سب کی کچھ پروا نہیں کرتے اے ذاتِ حق بس تو ہم کو مل جا اور ہمارے پاس رہ جا۔ فنا و عدم سے اور بُعد و غیبت سے بجز تیرے کوئی دوسرا پاک نہیں ۔ دوسری مثال مثنوی کا ایک مشہور شعر ہے :-

(۲) دل بدست آور کہ حج اکبر است   از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

اس شعر کا مطلب یہ کہتے ہیں کہ اس میں مولانا نے خدمتِ خلق اور ہمدردی و دلدہی کرنے کی ترغیب دی ہے فرماتے ہیں "کسی حاجتمند کی ضرورت پوری کر کے اس کا دل فتح کر لو اس کا ثواب بے انتہا ہے" حالانکہ مولانا کا یہ مطلب نہیں ہے مولانا تو یہاں اصلاحِ نفس اور تزکیۂ قلب کا مضمون فرما رہے ہیں کہ "اپنے قلب پر قابو حاصل کر دلے اس کی خواہشات اور مرغوبات میں بگٹٹ نہ چھوڑ دکیوں کہ ہوائے نفس اور تمنائے دل کی پابندی تمام گناہوں کی جڑ اور اسی کو قابو میں رکھنا ہزاروں طوافِ کعبہ سے بہتر ہے" [صوفی کو اہلِ دل اور صاحبِ دل اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ دل پر قابو پالیتا ہے] غور کیجئے کہاں وہ مطلب اور کہاں یہ ع فاین الثریا واین الثریٰ ۔ خیر یہ معنوی تحریف و تصرف کی دو مثالیں تو بر سبیل تذکرہ عرض کر دی گئیں لیکن مثنوی میں بعض تصرفات تو ایسے کئے گئے ہیں جنہیں لفظی تحریف کہنا غالباً بے جا نہ ہو گا یعنی دوسرے دوسرے شعرا کے اشعار کو مولانا روم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور غضب یہ کہ غلط سلط مضامین جو ان اشعار میں ہیں ان کو علمی مضمون ۔ اسلامی تعلیم اور صوفیہ کے مسائل سمجھا جاتا ہے ۔ یہ تصرف و تحریف اگر عام بہاد واعظین اور اہلِ علم نے کیا ہے اور دانستہ کیا ہے تو ان کی بدترین علمی خیانت ہے اور اگر نادانستہ کیا ہے تو ان کی بہترین علامتِ جہالت ہے لیکن اگر کسی شاعر نے اس نیت سے غلط اشعار کہے کہ آج نہیں تو کل ۔ یا دس بیس پچاس برس کے بعد میرے ایسے اشعار خلط ملط ہو کر مثنوی کے اشعار اور مولانا روم کے زادۂ فکر مشہور ہو جائیں تو اسے عارفِ شیرازی کا یہ شعر نہ بھولنا چاہیے

ے کس نیاید بزیر سایہ بوم   ور ہما از جہاں شود معدوم

یعنی ہما اگر جہاں سے معدوم بھی ہو جائے تب بھی کوئی شخص الو کے سایہ میں آنا تو کبھی پسند نہ کرے گا ایسے سوقیانہ مضامین تو کوئی سمجھ دار شخص کبھی مثنوی کا تسلیم ہی نہ کرے گا۔

آیئے اس وقت میں آپ کو چند ایسے اشعار سناؤں جن کے متعلق غالباً ۹۸ اور ۹۹ فی صدی لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ اشعار مولانا روم کی مشہور عالم مثنوی کے ہیں حالانکہ مولانا کے چھیوں دفتروں میں کہیں ان کا پتہ نہیں اور پتہ ہوتا تو کیوں کر ہوتا ان کے مضامین ہی صحیح اور تعلیماتِ اسلامی

کے موافق نہیں۔

صاحبِ علم و فہم فوراً سمجھ لیتے ہیں کہ یہ کسی چالاک اور بد عقیدہ شخص کا کلام ہے جو اہل اسلام کے عقائد میں رخنے اور وسوسے ڈالنا چاہتا ہے۔ لیکن اب تک اہل علم ایسے اشعار کو سن کر صرف لاحول الخ پڑھ کر گزر جاتے تھے وہ اس کو شاید اپنے مرتبہ سے فروتر سمجھتے تھے کہ اس کا علم عام لوگوں میں بھی پھیلائیں تاکہ لوگ علم صحیح حاصل کر کے ایسی تلبیس سے چوکنا ہو رہیں مگر میں اسے علم کی خدمت بھی سمجھتا ہوں اور عوام کی خدمت بھی سمجھتا ہوں کہ ایسی معلومات کو عام کر دیا جائے وباللہ التوفیق۔

۱۔ ایک شعر بہت مشہور ہے :۔

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر   ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

اکثر لوگ تو اسے مولانا روم کی مثنوی کا شعر سمجھتے ہیں اور بعض جو واقف کار ہوں گے وہ بھی شاید اسے الحاقی کہہ دیں گے مگر جیسا میں آگے چل کر بتاؤں گا یہ شعر الحاقی بھی نہیں ہے الحاقی تو اس شعر کو کہتے ہیں جو اصلی مشہور شاعر کا نہ ہو کسی بد نیت گمنام شاعر نے کہہ کر اس مشہور شاعر کی تصانیف میں چپکے سے ملا دیا ہو اور اس مشہور شاعر کی تصانیف میں ...... وہ الحاقی شعر موجود بھی ہو یہاں تو یہ صورت ہے کہ مولانا کی مثنوی میں اس شعر کا کہیں پتہ نہیں۔ اور یہ شعر ایک معلوم الاسم شاعر کا اس کی ایک تصنیف میں موجود ہے اب یہ واعظین ہیں کہ ایک شاعر کا کلام دوسرے کے نام سے پڑھتے پھرتے ہیں۔ خیر اب اس کا مطلب سنیے "اگر کوئی شخص زبان سے اللہ کا ذکر (سبحان اللہ یا الحمد للہ وغیرہ) اس طرح کئے جا رہا ہو کہ اس کے دل میں ادھر اُدھر کی فضول دنیوی باتیں بھری ہیں تو ایسا ذکر بے کار ہے" ظاہر نظر میں یہ مضمون صحیح معلوم ہوتا ہے ہم لوگ بھی بعض وقت بعض نمازیوں اور ذکر کرنے والوں کو یہ نصیحت کر گزرتے ہیں مگر آپ ذرا ڈوب کر دیکھئے گا تو آپ بھی کہہ اٹھئے گا کہ ع غلطیہائے مضامین مت پوچھ! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر کسی مریض کا دل دوا پینے کی طرف مائل نہیں اور دل سونٹ طبیب اس مرض کی ایک خاص دوا کی تاثیر کو حق الیقین کے درجہ میں جانتا ہے تو کیا اس طبیب کا مریض سے یہ کہنا کوئی عقل کی بات ہوگی کہ اگر تمہارا دل دوا پینے کو نہیں چاہتا تو جلتے رہو نہ پیو؟ یا ایک بد شوق طالب علم سے اس کا شفیق باپ یا استاد آیا یہ کہے گا کہ تمہیں شوق نہیں ہے تو نہ پڑھو یا یہ کہے گا کہ میاں تم بد شوقی ہی کے ساتھ سہی کچھ دنوں پابندی سے پڑھتے تو جاؤ۔ خیر یہ تو دو عام مثالیں تھیں جن میں اس کا بھی امکان و احتمال ہے کہ دوا اور علم کا اثر کسی پر کچھ نہ ہو لیکن اللہ کے

ذکر میں تو یہ احتمال بھی نہیں کیونکہ قرآن میں ہے

"لَہٗ دَعْوَۃُ الْحَقِّ مفید پکارنا تو بس اللہ ہی کا ہے

دوسری جگہ ہے

تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ تیرے رب کے نام میں عجیب برکت اور تاثیر ہے

اس لئے اس کا نام لینا اور ذکر و تسبیح بے دلی سے کرنا بھی تاثیر اور برکت سے خالی نہیں ہاں یہ بات ضرور صحیح ہے کہ اگر دل سے ذکر ہو تو اس میں تاثیر زیادہ اور جلد ہوگی۔

۲- دوسرا شعر یہ ہے:-

من ز قرآں مغز را برداشتم استخواں پیشِ سگاں انداختم

شعر کا مطلب یہ نکلتا اور یہی کہا جاتا ہے کہ "قرآن کا گودا گودا تو میں نے لے لیا باقی ہڈی کتوں کے سامنے ڈال دی کہ باہم لڑیں" بظاہر شاید اس مضمون میں بھی کوئی قباحت نہ معلوم ہو اول تو میری سمجھ میں یہی نہیں آتا کہ اگر یہ شعر مولانا روم کا ہے تو اس کے نظم کے وقت مولانا کس عالم میں تھے کہ برداشتم کا قافیہ انداختم لکھ گئے کیونکہ "شتم" یہاں حرف قید ہے لہذا برداشتم کی جگہ پر داختم وغیرہ قافیہ ہونا چاہیے تھا تاہم اگر آپ اس مشکل سے اس طرح عہدہ برآ ہو جائیے کہ مولانا روم کو اس لحاظ سے کہ وہ شعر کی مصطلحہ پابندیوں کی پروا نہیں کرتے مولانا شبلی کے الفاظ میں آپ بھی کہہ دیجئے کہ شاعری کی شریعت کے کافر تھے تو پھر دوسری دقت مضمون کی لغویت کی سامنے آتی ہے۔

مگر اس سے یہی مطلب نکلتا ہے کہ قرآن میں کچھ تو تھا مغز اور مرغوب چیز اور کچھ تھی ہڈی اور اور غیر مرغوب چیز۔ مغز اور کام کی چیزیں میں نے لے لی اور بے کار چیزیں دوسروں نے لے لیں مگر حاشا کہ کلام الٰہی میں ایک لفظ ایک نقطہ اور شوشہ بھی بے کار نامرغوب چیز ہو اگر آپ قرآن فہمی کے مختلف مراتب کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہوں تب بھی آپ کو ایسی چیز سے قرآن کی تشبیہہ دینی چاہیے جو اپنے ہر مرتبہ میں صحیح۔ مرغوب۔ نافع۔ مقصود اور متبرک ہو مثلاً بچوں کی مٹھائی جس میں کئی رنگین تہیں ہوتی ہیں پہلی پرت چوس لینے کے بعد دوسرے رنگ کی پرت جو اس کے نیچے نکلتی ہے وہ بھی پہلی پرت اور تہہ ہی کی طرح مرغوب اور مقصود ہے۔ اس کا کوئی حصہ زائد۔ نامرغوب غیر مقصود بے کار ہے ہی نہیں یہ مضمون اس قرآن کے بارہ میں جسے اللہ نے آنحضرت صلعم پر اتارا اور خود اس کی حفاظت کا وعدہ اور سامان کیا جو مسلمانوں کے سینوں میں موجود اور محفوظ ہے اس کے متعلق مولانا روم تو کیا کوئی معمولی مسلم بھی نہیں کہہ سکتا اور کیوں کر کہہ سکتا ہے جب کہ حضور صلعم

نے ایک ایسے شخص کو بھی دو ثواب کی بشارت دی ہے جو صرف اس کے الفاظ بہت مشکل سے اٹک اٹک کر پڑھ رہا ہو ظاہر ہے کہ ایسے شخص کا منتہائے مقصود صرف تلاوتِ الفاظ ہی ہو سکتا ہے نہ کہ اس کے مطلب اور مغز کا سمجھنا

یاد رہے کہ اس شعر کو صحیح ثابت کرنے کے لئے یہ کہہ دینا ایک مغالطہ دہی اور وسوسہ اندازی ہوگا کہ شاعر نے استخوان ان فضول باتوں کو کہا ہے جن پر اسلام کے مختلف فرقے اور گروہ باہم اختلاف اور بحث وجدال کرتے رہتے ہیں کیوں کہ یہ تو اہلِ غرض کی غرض پرستی ہے جو وہ قرآن کے مضامین کو اپنی خواہشات کی تائید میں استعمال کرتے ہیں خود قرآن کی خرابی اور قرآن میں ہدٰی اور بے کارشی کا وجود تو اس سے ثابت نہیں ہوتا۔

تیسرا شعر سنئیے:۔

۳۔ ہفصد و ہفتاد قالب دیدہ ام ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام

اس کا ترجمہ یہ ہے کہ میں نے سات سو ستر چولے بدلے ہیں میں گھاس کی طرح نہ معلوم کتنی بار اگ چکا ہوں یہ خیال تناسخ اور آواگون کے معتقدین کا ہو سکتا ہے یا شعراکی مضمون آفرینی اور حسن تعلیل کا شعر ہو سکتا ہے یہ کوئی صحیح علمی مضمون یا اسلامی عقیدہ تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک ہی انسان کے بار بار اس دنیا میں آنے کو تین باتیں لازم ہیں ایک یہ کہ عالم قبر سے اس دنیا میں آنا ممکن ہو دوسری یہ کہ خدا کے یہاں انسانوں کی روحیں اور سانچے محدود ہی ہوں کہ وہ ایک بار آئی ہوئی روحوں ہی کو پھر بدل کر بھیجتا رہتا ہے تیسرے یہ کہ انسان جو ایک چولے اور جسم میں اشرف المخلوقات تھا وہ دوسری بار کتے اور سور کی ذلیل شکلوں میں پھر اسی دنیا میں پیدا ہو۔ اور یہ تینوں باتیں غلط ہیں پہلی بات یوں غلط ہے کہ قرآن نے عالمِ قبر سے دنیا میں واپس آنے کو محال بتایا ہے فرماتے ہیں

۱۔ وحرام علی قریۃ اھلکناھا انھم لا یرجعون

۲۔ ومن ورائھم برزخ الی یوم یبعثون

ان اسلامی عقیدوں کے بعد یہ بات کوئی منکر قرآن ہی کہہ سکتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد پھر اس دنیا میں آتا ہے رہا یہ کہ شکم مادر میں انسان سات اطوار وادوار سے گزرتا ہے یا صلب پدر میں نطفہ کا مادہ کچھ جماد سے بنتا ہے کچھ نبات سے اور کچھ حیوان سے تو ہمیں اس کا انکار نہیں ہے گفتگو تو سات سو ستر چولے بدلنے اور بار بار ایک ہی شکل میں پیدا ہونے اور اس دنیا میں واپس آنے کی ہے۔

یہاں ہم پھر یاد دلا دیں کہ مرزا غالب کا یہ شعر ؎

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں

یا عمر خیام کے ایسے اشعار ؎

ہر سبزہ کہ بر کنار جوئے رستہ است گویا ز لب فرشتہ خوی رستہ است

یا دوسرے شعرا کے اس مضمون کے اشعار محض شاعرانہ مضمون ہیں اور شعراء کا یہ مایۂ خمیر بقول قرآن "فی کل وادٍ یھیمون" ہے اس کا اسلامی تعلیمات۔ حیات و ممات اور عقاید موت و برزخ سے کیا تعلق؟

چوتھا شعر ملاحظہ ہو:-

۴- دینِ حق را چار مذہب ساختند رخنہ در دینِ نبی انداختند

اس کا ترجمہ یہ ہے "لوگوں نے خدا کے بھیجے ہوئے ایک مذہب کو چار مذہب بنا دیا اور اس فعل سے دینِ نبوی میں خرابی ڈال دی" اس شعر میں فقہ اسلامی کے چار مذاہب (حنفی۔ شافعی۔ مالکی۔ حنبلی) پر چوٹ کی ہے اس کے انداز سے معلوم ہو رہا ہے کہ شاعر ان چاروں سے یکساں طور پر خفا ہے وہ شاید فقہ اربع کو اغراض اور ہوائے نفسانی سے ناشی سمجھتا ہے اس کے نزدیک شاید فقہ کے چار ہو جانے میں سوا ایک دوسرے کی مخالفت اور مقابلہ کے اور کوئی پہلو ممکن ہی نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اس شاعر کے نزدیک آنحضرتؐ کے ارشادات کا مطلب ایک سے زائد نکالنا قابلِ اعتراض ہے تو شاید اس کے نزدیک غالب کے اشعار کے کئی کئی پہلو نکالنا بھی قابلِ اعتراض ہوگا اور اسی منطق سے خود حق تعالیٰ کے کلامِ پاک کے مطالب اور تفسیر میں بھی ایک سے زائد پہلو نکالنا قابلِ اعتراض ہوگا نیز دنیوی حکومتوں کے لیجسلیچر میں قوانین کی موشگافیاں اور ایک سے زائد تشریح کرنا سخت جرم اور قوانین میں رخنہ ڈالنا ہوگا اور اس کے نزدیک ایسے مقنن تو یقیناً گردن زدنی ہوں گے اس بے علم کو معلوم ہونا چاہئے کہ ارشاداتِ نبوی متعلق دینِ حق میں سہولت آمیز لچک ہے۔ چاروں اماموں نے جو کچھ قانون ایک ارشادِ نبوی سے سمجھا سب درست ہے ہر امام کے ماننے والے کا عمل اپنے اپنے امام کی تشریح کے مطابق جو کچھ ہو گا وہ عین منشاء رسول اور مرضیِ حق ہے۔ اللہ کو بندوں کے ساتھ سہولت آسانی ملحوظ ہے یہ بات نہیں ہے کہ منشاء نبوی صرف ایک ہو اور کسی ایک امام نے تو اسے ٹھیک سمجھا باقی تین اماموں نے غلط سمجھا ہو یہ کسی سخت گیر آقا کے قوانین کا حال ہو سکتا ہے رب العلمین کے قوانین میں لچک اور سہولت رکھی گئی ہے۔

بہر حال ایسی ناواقفی اور بے عقلی کی بات اور وہ بھی بدگوئی کے لب ولہجہ میں کسی

دشمنِ اسلام کی تو ہو سکتی ہے مولانا روم کا یہ شعر کبھی نہیں ہو سکتا۔

پانچواں شعر ملاحظہ ہو:-

چوں صحابہ حبِّ دنیا داشتند مصطفیٰ را بے کفن بگذاشتند

یہ شعر تو پکار پکار کہہ رہا ہے کہ مولانا روم تو کیا ایک معمولی مسلمان زبان پر تو کیا لاتا خیال میں بھی نہیں لا سکتا تھا اس میں نہ صرف انصارؓ کو بلکہ تمام صحابہ کو اور در پردہ حضرت علیؓ کو بھی بُرا کہنا چاہتا ہے اور سب سے لوگوں کو بدظن کرنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے کہ "چونکہ سب صحابہ دنیا کی محبت رکھتے تھے دین کی محبت ان میں نہ تھی اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بے کفن چھوڑ کر (دنیا داری کی فکر میں) چلے گئے" حالانکہ وفات نبوی کے وقت تمام اہلِ تاریخ متفق اللفظ ہیں کہ

۱۔ جب حضرت ابوبکرؓ اسی روز حضور کی حالت میں افاقہ پا کر اپنی سسرال چلے گئے تھے وہاں سے یہ خبر وحشت اثر سن کر دوڑے ہوئے جب آئے تو کاشانۂ نبوت میں دیکھا کہ صحابہ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ بھی بدحواس ہیں [اس سے ثابت ہوا کہ وفات نبوی کے وقت صحابہؓ، حضرت عمرؓ جسدِ اطہر کے پاس تھے]

۲۔ حضرت ابوبکرؓ نے جسدِ اطہر کی چادر اٹھا کر روئے انور کو بوسہ دیا باہر آ کے تقریر کی جس میں آیت مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْل پڑھی اس وقت تمام صحابہ کے ہوش بجا ہوئے [اس سے بھی ثابت ہوا کہ صحابہ جسدِ اطہر کے پاس تھے]

۳۔ بخاری ج ۲ صفحہ ۱۰۰۹ (کتاب المحاربین) ابن عباس کی روایت میں ہے

"من خبرنا حین توفی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان الانصار خالفونا واجتمعوا باسرھم فی سقیفۃ بنی ساعدۃ وخالف عنی علیؓ والزبیر ومن معھما واجتمع المھاجرون الی ابی بکر فقلت لہ انطلق بنا الی اخواننا الانصار	"یعنی حضور کی وفات کے وقت تین گروہ تھے تمام انصار کا ایک گروہ حضرت زبیرؓ اور علیؓ کے ساتھ ان کے چند ہم خیال (یعنی حضرت عباسؓ اور ابوسفیان بن عبدالمطلب) کا گروہ اور بقیہ تمام مہاجرین کا ابوبکرؓ کے ساتھ ایک گروہ میں نے ابوبکرؓ سے کہا ہمیں ہمارے انصار بھائیوں کی جماعت کے پاس لے چلئے"

اور موطا کی روایت میں ہے کہ "بیت فاطمہ میں حضرت علیؓ و زبیر وغیرہ جمع ہوئے کہ خلافت کا فیصلہ کریں حضرت عمرؓ نے کہا کہ انھیں چھوڑیئے انصار کے گروہ میں چلئے [کیوں کہ

ان کا مجمع زیادہ تھا ان کے اختلاف سے خطرات زیادہ تھے)"۔ یہ تھے حالات ۔ بیت فاطمہ کی یہ خفیہ کمیٹی اگرچہ اصولاً غلط تھی کیونکہ حضور فرما گئے تھے کہ "ابو بکرؓ کے سوا کسی دوسرے کے خلیفہ ہونے پر نہ خدا راضی ہوگا نہ عام مسلمان (بخاری)"۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان عام مسلمان (صحابہؓ) ہی کی رائے عامہ دراصل منشاء خداوندی کا معیار تھی نہ کہ چند افراد خاندان کی خفیہ کمیٹی بہرحال انصار الگ خلیفہ بننے کا خواب دیکھ رہے تھے اور اپنی ایک چوپال میں جمع تھے اور حضرت علیؓ وغیرہ الگ خلیفہ بننا چاہتے تھے اور حجرہ اطہر سے الگ بیت فاطمہ میں کمیٹی کر رہے تھے ابو بکرؓ اور عمرؓ اور جملہ مہاجرین تو حجرۂ اطہر کے پاس ہی تھے اب صاف ثابت ہو گیا کہ اس شعر کا ناظم دراصل حضرت علیؓ کو اور انصار کو برا کہنا چاہتا ہے اب اگر آپ اس شخص کا نام معلوم کرنا چاہتے ہیں تو زیادہ بہتر ہوگا کہ آپ اس کو میری زبان سے نہیں ایک محقق عالم اور مسلم الثبوت ولی اللہ اور بزرگ کی زبان سے سنئے :۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ جنہوں نے متعدد بار مثنوی شریف کا درس از اول تا آخر دیا ہے اور جنہوں نے اس کی مستند ترین شرح "کلید مثنوی" کے نام سے بھی لکھی ہے وہ فرماتے ہیں :۔

"۔ من ز قرآں مغز را برداشتم استخواں پیش سگاں انداختم

یہ شعر جاہلوں نے مولانا (مولانا روم) کی طرف منسوب کیا ہے اور بھی بہت سے اشعار مولانا کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں مگر مثنوی میں ان میں سے ایک بھی نہیں۔ چنانچہ یہ اشعار بھی مولانا کی طرف منسوب ہیں

۔ ہفصد و ہفتاد قالب دیدہ ام من چو سبزہ بارہا روئیدہ ام

۔ دین حق را چار مذہب ساختند رخنہ در دین نبی انداختند

۔ چوں صحابہ حب دنیا داشتند مصطفےٰ را بے کفن بگذاشتند

(الاستماع والاتباع ص۲۲ سلسلہ التبلیغ)

یہی عالم محقق اور عارف مدقق دوسری جگہ فرماتے ہیں :۔

"... اب یہاں سے میں جواب دیتا ہوں ایک شعر کا جو مثنوی کا نہیں بلکہ نان دھلوا کا ہے جس کا مصنف شیعی ہے بہاؤ الدین عاملی۔ مگر واعظوں نے اس شعر کو مثنوی کی طرف منسوب کر کے عوام کا ناس کر دیا وہ عام طور پر اپنے مواعظ میں اس پر زور دیتے ہیں کہ آج کل لوگوں کا نماز روزہ کچھ نہیں ہے محض بے کار ہے کیوں کہ نماز کی حالت میں وسوسے ان کو

گھیرے رہتے ہیں ذکر میں خیال منتشر ہوتا ہے اور اس پر یہ شعر پڑھ دیتے ہیں :-

برزبان تسبیح و در دل گاؤ خر — ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

مگر میں تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ

ع ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر

(خیر الحیات و خیر الممات ص ۵۰ سلسلہ التبلیغ)

لیکن ختم سے پہلے اس بہاؤ الدین عاملی (؟ آملی) کے چند اور اشعار بھی سن لیجئے جو اس کی اسی مثنوی نان و حلوا کے ہیں جس میں اس نے اپنے "مقتضائے طبیعت" سے مجبور ہو کر مولانا روم کو گالیاں دی ہیں کہتا ہے :-

ایں کلامِ صوفیانِ شوم نیست — مثنوی مولوی روم نیست

صوفیاں در ذکر چوں ہو، ہو کنند — قمریاں بر حالِ شاں کو، کو، کنند

مگر ان عالم نما جاہلوں سے اللہ ہی سمجھے کہ ایک شخص جو مولانا روم کو شوم تک کہہ رہا ہو یہ لوگ اسی کے "غلطیہائے مضامین" والے اشعار کو مولانا کی طرف مشہور و منسوب کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے فیا للعجب ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

العلم والعلماء

یہ بہت بڑے امام حدیث علامہ ابن عبد البر کی شہرۂ آفاق کتاب "جامع بیان العلم و فضلہ" کا نہایت نفیس ترجمہ ہے کتاب کے مترجم مشہور ادیب اور بے مثال مترجم عبد الرزاق صاحب ملیح آبادی ہیں یہ ترجمہ مولانا ابو الکلام آزاد کے ارشاد کی تعمیل میں کیا گیا تھا جو اب ندوۃ المصنفین سے شائع کیا گیا ہے۔

علم و فضیلت علم و علماء پر اس درجے کی کوئی کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔ صفحات ۳۰۰، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت، طباعت بہت عمدہ قیمت چار روپے آٹھ آنے مجلد پانچ روپے آٹھ آنے

طوطئ ہند حضرت امیر خسروؒ کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر

از

(جناب مولانا محمد اشرف حسین ام۔اے۔محکمہ آثار قدیمہ ہند۔دہلی)

(۲)

جان زتن بُردی، و در جانی ہنوز | دردہا دادی، و درمانی ہنوز
ہر دو عالم قیمتِ خود گفتۂ | نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز
ملکِ دل کردی خراب از تیغِ ناز | واندریں ویرانہ سلطانی ہنوز
پیری و شاہد پرستی ناخوش است | خسروا تا کے پریشانی ہنوز

اگرچہ اکثر نامور شعراء کی قدر دانی ان کی زندگی میں کما حقہٗ نہیں ہوئی، لیکن یہ ایک خاص بات ہے کہ حضرت امیر خسروؒ کی قدر دانی سلطان غیاث الدین بلبن سے لے کر سلطان محمد شاہ تغلق تک (یعنی ۶۶۴ھ سے ۷۲۵ھ تک)، تمام سلاطین و امراء کرتے رہے اور بڑے بڑے تحائف و انعامات سے نوازتے رہے۔آپ کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ آپ بالطبع سلاطین و امراء کی جھوٹی تعریف لکھنی پسند نہ فرماتے تھے بلکہ اکثر ان کو اخلاقی و انتظامی تعلیم شیخ سعدیؒ کی طرح دیا کرتے تھے وہ عربی، فارسی، ترکی اور ہندی چاروں زبانوں کے فاضل اور نظم و نثر میں یکساں کمال رکھتے تھے۔صرف منظوم کتابیں ان کی ننانوے بیان کی جاتی ہیں اور اشعار کی تعداد (علاوہ کلام ہندی کے) چار اور پانچ لاکھ کے درمیان بتائی جاتی ہے، ممکن ہے کہ اس میں کچھ مبالغہ ہو، لیکن صاحب تذکرہ آتش کدہ کہتے ہیں کہ خسرو کے ایک لاکھ اشعار تو خود میری نظر سے گذرے ہیں۔ضیاء الدین برنی (صاحب تاریخ فیروز شاہی) لکھتے ہیں کہ نظم و نثر میں گویا انھوں نے ایک کتب خانہ تصنیف کر دیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ خسروؒ نے

وہ وہ معرکۃ الآرا کتابیں لکھی ہیں کہ سبعہ معلقہ و سواطع الالہام کی طرح ان کا جواب نہ نکل سکا، مگر افسوس کہ امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں یہ قابلِ ناز علمی خزانہ قریب قریب برباد ہو گیا۔ جو کچھ باقی رہ گیا ہے اُس پر تفصیلی بسیط تبصرہ کافی موجبِ دلچسپی ہوتا، لیکن بحث طویل ہے اور وقت قلیل، اس لئے اس وقت صرف ان کے نام ہی گنوانے پر اکتفار کی جاتی ہے۔

مثنوی قران السعدین۔ مثنوی مطلع الانوار۔ مثنوی شیریں خسرو۔ مثنوی لیلےٰ مجنوں۔ مثنوی آئینۂ اسکندری یا سکندر نامہ۔ مثنوی ہشت بہشت۔ مثنوی خضر نامہ یا خضر خاں و دول رانی۔ مثنوی نُہ سپہر۔ مثنوی تغلق نامہ۔ خزائن الفتوح یا تاریخ علائی۔ انشائے خسرو یا خیالاتِ خسرو۔ رسائل الاعجاز یا اعجازِ خسروی۔ افضل الفوائد راحت المحبین۔ خالق باری (اس میں کچھ اختلاف ہے)۔ جواہر البحر۔ ان کے علاوہ پانچ دیوان ہیں۔ دیوان تحفۃ الصغر (یعنی وہ تصنیفات جو امیر خسروؒ نے ۱۶ برس سے ۱۹ برس تک کی عمر میں کیں)۔ دیوان وسط الحیات (یعنی وہ تصنیفات جو انھوں نے بیس برس کی عمر سے چونتیس برس تک کیں)۔ دیوان غرۃ الکمال (یہ خسروؒ کا تیسرا اور سب سے بڑا دیوان ہے) دیوان بقیہ نقیہ (یعنی وہ دیوان جس میں خسروؒ کی تصنیفات ۵۰ برس سے ۶۴ برس تک کی عمر کی ہیں)۔ نہایۃ الکمال (یہ آخری دیوان ہے)

ان سب پر مستزاد یہ ہے کہ تذکرۂ عرفات میں اوحدی کا بیان ہے کہ امیر خسروؒ کا جتنا کلام فارسی میں ہے تقریباً اتنا ہی برج بھاشا میں ہے،

مگر افسوس کہ اُس گنجِ شایگاں کا آج کہیں نشان تک نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ اتنی سی عمر میں انھوں نے کس طرح اتنی تصنیفات کیں جب کہ وہ ملازمت پیشہ تھے اور مصروفیتیں بہت تھیں جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں

ے باشم ز برائے نفس خود رای | بیش چو خودے ستادہ بر پای
تا خوں نرود ز پائے تا سر | دستم نشود ز آب کس تر

ان باتوں کے پیش نظر یہ کہنا پڑتا ہے کہ صانعِ حقیقی کی قدرت کے وہ ایک خاص شاہکار تھے۔

اُردو بولنے والے اصحاب جانتے ہیں کہ ہماری زبان اردو کی ماں برج بھاشا ہے جو ہندوستان میں اسلام آنے سے پہلے شمالی ہند میں بولی جاتی تھی۔ جو مسلمان ہندوستان میں آئے وہ فارسی بولتے تھے جس میں عربی و ترکی الفاظ بکثرت موجود تھے۔ ہر وقت ایک جگہ رہنے سہنے اور ملنے جلنے سے ایک تیسری زبان پیدا ہوگئی۔ امیر خسرو کی اختراع پسند طبیعت نے اس میں بہت کچھ جوہر دکھائے یعنی برج بھاشا کی زمین میں فارسی کا بیج بویا پہلے وہ ہندی بنی، پھر ریختہ کہلائی، اور آخر کار اُردو کے نام سے مشہور ہوئی۔ امیر خسرو کی پہیلیاں، مکرنیاں، انمل، دوسخنے، وغیرہ وہ یادگاریں ہیں جو کبھی مٹ نہیں سکتیں۔

چونکہ امیر خسروؒ حتی الوسع کسی کو آزردہ نہ کرتے تھے اس لئے فرمائش پر وہ پہیلیاں انمل وغیرہ بھی نظم کر دیتے تھے جو آج تک لوگوں کی زبان پر ہیں۔ اگرچہ فن شاعری کے لحاظ سے یہ بلند مرتبہ چیزیں نہیں ہیں لیکن ان سے مصنف کی جدت پسندی و خوش مذاقی کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً ان کی ایک مشہور پہیلی ہے۔

"چار مہینے بہت چلی اور آٹھ مہینے تھوری   میر خسرو یوں کہیں تو بوجھ پہیلی موری"

اس پہیلی کا آخری لفظ "موری" ہے جو ذو معنین ہے یعنی ہندی زبان میں "میری" کو "موری" بولتے ہیں اور "موری" "پانی نکلنے کی نالی" کو بھی کہتے ہیں جو کہ اس پہیلی کا صحیح حل ہے۔

اُن کی انمل نویسی کی بھی ایک مثال لے لیجئے۔ ایک مرتبہ کا مشہور واقعہ ہے کہ چار عورتیں ایک کنوئیں پر پانی بھر رہی تھیں۔ امیر خسرو ادھر سے گذرے پیاس لگ رہی تھی پانی طلب کیا۔ چوں کہ ہر دل عزیز تھے اور سب آپ کے کمالات شاعری کے معترف تھے اس لئے ان عورتوں نے بھی کہا کہ ہم لوگ اس وقت اپنے آج کے واقعات کا ذکر کر رہے تھے

ان کو نظم کر دیجئے اُس وقت ہم پانی پلائیں گے۔ چنانچہ پہلی عورت نے کہا کہ آج میں نے نہایت لذیذ کھیر پکائی ہے اور ایندھن جب کم پڑ گیا تو اس دوسری عورت نے اپنا پرانا ٹوٹا ہوا چرخہ مجھے دے دیا کہ اس کا ایندھن بناؤ۔ جب کھیر پک چکی تو تیسری عورت جو ڈھول بجا رہی تھی ہم دونوں اس کے پاس تھوڑی دیر کے لئے جا بیٹھے اور اس درمیان میں ایک کُتّا آ گیا اور کھیر کھا گیا۔ فی البدیہہ امیر خسرو نے ان بے ربط باتوں کو ایک شعر میں نظم کر دیا جو حسب ذیل ہے:

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا آیا کتا کھا گیا، تو بیٹھی ڈھول بجا۔ لا پانی پلا

علاوہ ان تاریخی و ادبی خدمات کے جو امیر خسرو نے اپنی تصانیف سے انجام دیں، فنِ موسیقی پر بھی اُن کا بڑا احسان ہے۔ بڑے بڑے صاحبِ کمال گویّے ان کی شاگردی کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے۔ صاحب مطلع العلوم تحریر کرتے ہیں کہ اُس زمانے کے مشہور ترین گویّے مثلاً جگت اُستاد نائک گوپال اور حسن سادنت نے جن کے ہزاروں شاگرد تھے آپ ہی سے استفادہ حاصل کیا تھا۔ دربارِ شاہجہانی کا مورخ ملا عبد الحمید لاہوری بادشاہ نامہ میں ۱۰۴۸ھ کے واقعات میں رقمطراز ہے کہ امیر خسرو نے فنِ موسیقی میں ایجاد و اختراع کی۔ چار خاص نئے راگ ایجاد کئے اوّل قانون۔ دوم فارسی۔ سوم ترانہ۔ چہارم تصانیفی جن میں خیال وغیرہ شامل ہیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ امیر ہندی اور فارسی دونوں راگوں سے بخوبی واقف تھے۔

صوفیانہ طریقہ سماع میں بہت سی نئی باتیں اور قاعدے ایجاد کر کے اُس کو "قوالی" کے نام سے موسوم کیا۔ سفینۃ الاولیار، سبع سنابل، اور تذکرہ اولیائے ہند میں لکھا ہے کہ اسی بنا پر حضرت محبوب الٰہی حضرت امیر خسرو کو "مفتاح السماع" کے خطاب سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ مطلع العلوم و آبِ حیات میں مذکور ہے کہ "بہاؤ راگ" اور ستار کی ایجاد کا فخر حضرت امیر خسرو ہی کو حاصل ہے۔

چونکہ مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے اس لئے سر دست امیر خسرو کی شاعری پر مزید

روشنی ڈالنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ انشاء اللہ اس موضوع پر پھر کبھی تفصیل کے ساتھ قلم اٹھایا جائے گا۔

امیر خسرو کے کلام کی خصوصیات پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ مولانا جامی، میر غلام علی آزاد بلگرامی، ضیاء الدین برنی، شاہزادہ دارا شکوہ، کاتبی نیشاپوری، دولت شاہ، مولانا شبلی نعمانی وغیرہم نے کافی شرح وبسط سے داد نقادی دی ہے لیکن پھر بھی یہ بحث تشنہ رہ گیا ہے مختصراً یہ بلا حرف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں پہلے سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا بلکہ سچ پوچھئے تو اس قدر گوناگوں اوصاف کے جامع، ایران وروم کی مردم خیز خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو چار ہی پیدا کئے ہوں گے صرف ایک شاعری کو لیجئے تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے فردوسی، سعدی، انوری، حافظ، عرفی، نظیری بے شبہ اقلیم سخن کے نامور تاجدار گذرے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کے حدود حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں جاتے فردوسی رزمیہ مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا، سعدی قصیدہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتے، خاقانی وانوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتے، حافظ، عرفی، نظیری غزل کے دائرہ سے باہر کامیابی کے ساتھ قدم نہیں نکال سکتے۔ لیکن اس خسرو اقلیم سخن کی جہانگیری میں تمام اصناف شاعری مثلاً غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی سب کچھ داخل ہے جس صنف پر قلم اٹھایا کمال کر دکھایا اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن یعنی تضمین، مستزاد، اور صنائع وبدائع کا تو گننا بھی مشکل ہے۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھئے تو اس خصوصیت میں کوئی ان کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔

ان مختلف الحیثیات مشغلوں کے ساتھ فقر وتصوف کا یہ عالم تھا کہ گویا عالم قدس کے علاوہ دنیائے فانی کی طرف انھوں نے نظر اٹھا کر بھی کبھی نہیں دیکھا۔ ریاضات شاقہ کی یہ کیفیت تھی صاحب خزینۃ الاصفیاء لکھتے ہیں کہ چالیس سال تک آپ برابر صائم الدہر رہے اور مستند کتب تواریخ وسیر ہم زبان ہیں کہ آپ کا معمول رہا کہ ہر شب کو ایک کلام مجید

ختم کیا کرتے تھے اور نماز تہجد میں سات پارے پڑھا کرتے تھے۔

حضرت امیر خسرو کے اخلاق و آداب کے متعلق آپ کے سوانح نویس بالاتفاق لکھتے ہیں کہ آپ بہت خوش مزاج، خوش اخلاق، خدا سے ڈرنے والے، اور غریبوں اور کمزوروں کی مدد کرنے والے تھے۔ آپ کا مقولہ تھا "ہر کہ خود را نبیند، خدائے را نہ بیند، وہر کہ از خدا نہ ترسد، از و باید ترسید (یعنی جو اپنے آپ کو دیکھتا ہے خدا کو نہیں دیکھ پاتا، اور جو خدا سے نہیں ڈرتا اس سے ڈرنا چاہیئے) کسی کی دل شکنی کو گناہِ عظیم سمجھتے تھے اور اہلِ علم کی بہت عزت کرتے تھے باوجودیکہ سلاطین و امراء کے مصاحب قریب رہے، اپنے کو ہمیشہ کمترین مخلوقات سمجھتے رہے ان میں تعصب نام کو بھی نہ تھا۔ ہر مذہب و ملت کے لوگوں سے محبت کے ساتھ ملتے جلتے تھے اور ان کے آڑے وقت میں کام آتے تھے۔ اگرچہ بالطبع آپ تعصب کو برا سمجھتے تھے لیکن اس خیال کو استوار کرنے والا اور اس حسن کو جلا دینے والا ان کے مرشد کی صحبت کا فیضان تھا اس لئے کہ حضرت محبوب الٰہی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند — کہ در آفرینش زیک جوہر اند

آپ سلاطین و امراء کی بے جا تعریف کرنے سے بالطبع متنفر تھے اور جو رقم قصیدہ گوئی سے ملتی تھی وہ سب محتاجوں پر تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اپنے صرف میں صرف وہ رقم لاتے تھے جو خود کسب و محنت سے حاصل کرتے تھے۔ یہی وہ صفاتِ حسنہ ہیں جو خداوندِ عالم کی نظر میں ایسی مقبول ہوئیں کہ آج بھی ان کا مزار مرجعِ عوام بنا ہوا ہے۔

کاش خداوندِ عالم ہم کو بھی یہ توفیق عطا فرمائیں کہ ہم بھی ان کے نقشِ قدم پر چل کر خود پسندی، خود غرضی، ناخدا ترسی، بد اخلاقی، فرقہ وارانہ تعصب، وغیرہ سے اپنے دامن کو پاک رکھیں اور اس طرح اپنے ملک ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام عالم کے لئے بہترین نمونۂ انسانیت اور موجبِ رحمت بن جائیں۔

ادبیات

غزل

از

(سعید احمد اکبر آبادی)

زمانہ چلتے چلتے رک گیا ہے
کسی کے رُخ سے کیا پردہ اُٹھا ہے

سرورِ جاودانی ہے اسی کو
جو غم کی آگ پر برسوں تپا ہے

متاعِ عظمتِ آبا وہیں ڈھونڈھ
جہاں کل کارواں تیرا لٹا ہے

قیامت ہے بصد اہلِ گلشن
جلو گیرِ خزاں برقِ بلا ہے

نہ ہو دشمن کو بھی مقسوم یارب
وفا کا جو صلہ ہم کو ملا ہے

"نہ تھی خالی غرض سے عاشقی بھی"
بجا ارشاد ہے بالکل بجا ہے

وہ آئے بھی گئے بھی کب کے آکر
دل اب تک راہ کس کی تک رہا ہے

دمِ گریہ تسلّی کی یہ باتیں!
یہ چشمہ جب کھلا تو کب رُکا ہے

نہیں پرسش سے مانع غیران کو
بس اک حائل وہ اندازِ حیا ہے

زہے آسانیِ راہِ محبت
تمہیں گردن جھکا کر پا لیا ہے

بھلا کیا اعتبارِ دولت و جاہ
رہینِ بوم جب بالِ ہما ہے

کھنڈر پر بیٹھ کر اے رونے والے
یہیں تو تیرا گنجینہ چھپا ہے

سعیدِ زار کی حالت عجب ہے
سنجانے عارضہ کیا ہو گیا ہے

مادہ تاریخ بصنعتِ نادرہ ترجمہ

بروفات حسرت سمات شہیدِ علومِ دینیات استاذ العلما حضرت علامہ مولانا حافظ محمد اعزاز علی صاحب

نائب شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند رحمۃ اللہ

از یکے تاریخ گو شاگرد علامہ

۱ ۹ ۶ ۵ ۵

اعوذ باللہ القادر من الشیطٰن الرجیم — ۱۹ ۶ ۵۵

بسم اللہ التواب المعز الرحمٰن الرحیم — ۱۳ ھ ۷۴

نستغفر الصمد — ۱۹۶۵۵

آھنی غم اعزاز — ۱ ۹ ۶ ۵ ۵

غفر عزیز — ۱۳ ھ ۷۴

ا	ھ	ن	ی	غ	م	ا	ع	ز	ا	ز
یک	پنج	پنجاہ	دہ	یکہزار	چہل	یک	ہفتاد	ہفت	یک	ہفت
۳۰	۵۵	۶۱	۹	۲۴۳	۳۸	۳۰	۴۸۹	۴۸۵	۳۰	۴۸۵

۱ ۹ ۶ ۵ ۵

نوٹ (۱) آہنی غم اعزاز کے اعداد بحساب ابجد ۱۱۹۲ ہیں مگر مورخ نے ترجمہ کی صنعت کے ذریعہ ۱۹۵۵ برآمد کئے ہیں۔

(۲) فن تاریخ گوئی کا دار و مدار حروف مکتوبی کے اعداد و شمار پر ہے یہی وجہ ہے کہ رحمان بالالف کے اعداد ۲۹۹ ہیں اور رحمٰن بلاالف کے ۲۹۸۔ تاریخ گو حسب صوابدید جو رسم الخط چاہے اختیار کر سکتا ہے چنانچہ مذکورہ بالا مشکل مزین میں (جس کے اندر صرف ایک اکائی کا ہند ۹ ی کے ترجمہ دہ سے حاصل ہوتا ہے) اسی اختیار سے فائدہ اٹھا کر صرف ہفتد بلاالف لکھ کر ۱۹۵۵ء حاصل کئے گئے ہیں۔ نسیم دہلوی غفرلہٗ

تبصرے

میر تقی میر | از ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ریڈر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی ۔ تقطیع متوسط ضخامت ۶۳۲ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد بارہ روپیہ پتہ :- انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڈھ

میر تقی میر اردو ادبیات میں ایک نہایت بلند شخصیت کے مالک ہیں جس کا اعتراف مرزا غالب تک نے کیا ہے وہ جتنے بڑے شاعر تھے ۔ اتنے ہی بڑے زبان کے نکتہ سنج اور فن شعروادب کے نقاد تھے انھوں نے خود شاعری نہیں کی بلکہ درحقیقت غزل گوئی نئے اسالیب بیان اور زبان کی صفائی ستھرائی کی ایک تاریخ پیدا کی اور اس کو استوار کیا ہے انھوں نے ۱۰۰ برس کے لگ بھگ عمر پائی ۔ اس مدت میں نادر شاہ کا دہلی پر حملہ اور قتل و غارتگری ۔ مرہٹوں ۔ جاٹوں اور افغانوں کی یورشیں احمد شاہ ابدالی کے پے بہ پے حملے ۔ سکھوں کی چیرہ دستیاں ۔ مشرق میں انگریزوں کی فتنہ سامانیاں ۔ دربار شاہی میں ایرانیوں اور تورانیوں کی چپقلشیں ۔ احمد شاہ کی معزولی اور اس کا نابینا کیا جانا ۔ عالمگیر ثانی کا قتل ۔ روہیلوں کی سفاکی اور بے رحمی ۔ شاہ عالم اور اس کے خاندان کا کئی روز تک فاقہ کشی کرنا اور آخر اس کا نابینا کر دیا جانا ۔ ان میں سے کون سا انقلاب اور کون سی تباہی و بربادی تھی جس کی خونیں موجوں سے میر خود نہ گذرے تھے ۔ پھر میر آگرہ میں پیدا ہوئے دلی میں رہے اور آخر لکھنؤ میں جا بسے اور وہیں دفن ہوئے اور چونکہ اس زمانہ میں ہندوستان کی مخصوص ملی جلی تہذیب کے یہی شہر بڑے مرکز تھے اس بنا پر میر کی شاعری صرف شاعری نہیں بلکہ اس پُرآشوب عہد کی ایک بڑی قیمتی یادگار اور بین السطوری تاریخ بھی ہے ۔ میر کی حیات اور شاعری پر کافی مقالات و مضامین لکھے

آ چکے ہیں لیکن ضرورت تھی کہ کوئی ایسا صاحب نظر ہوتا جو اس عہد کی تاریخ ادب، تہذیب اور فن ان سب پر یک جائی گفتگو کر کے ان میں باہم جو ربط و تعلق اور ہم آہنگی و ہم آوازی ہے اس کی نشاندہی کرتا، خوشی کی بات ہے کہ یہ سعادت اور فخر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے مقدر میں تھا جو ہر طرح اس کارنامۂ عظمیٰ کے اہل تھے۔ موصوف نئی نسل کے ادیبوں میں بھی سنجیدہ نگاری۔ شگفتہ بیانی اور میانہ روی کے لئے مشہور ہیں لیکن اس کتاب میں انھوں نے تلاش و تحقیق اور تنقید و تبصرہ کا جو کمال دکھایا ہے اس نے کتاب کو اردو ادبیاتِ عالیہ کا شاہکار بنا دیا ہے۔ میر کی حیات اور شاعری سے متعلق کوئی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ مقالہ یا کتاب ایسی نہیں ہے جس کو انھوں نے نہ پڑھا ہو۔ لیکن مختلف فیہ مسائل و مباحث مثلاً میر کا سن ولادت۔ میر کا مسلک و مذہب۔ میر کے والد کا نام۔ خان آرزو کے ساتھ میر کے تعلقات کی بدمزگی۔ میر کی نازک دماغی یا بددماغی۔ میر کے محسن۔ میر کا لکھنؤ خود جانا یا بلایا ہوا جانا وغیرہ سے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے بہت سوچ سمجھ کر اور غور و فکر کے بعد لکھا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مصحفی۔ محمد حسین آزاد۔ عبدالحق۔ شیروانی عاسی۔ اثر۔ عبدالودود وغیرہم سے جہاں کہیں اختلاف کیا ہے بڑی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ کیا ہے اور جو رائے دی ہے وہ بڑی نپی تلی اور متوازن دی ہے۔ مثلاً میر کی خصوصیات مزاج پر آزاد اور شیروانی کا اختلاف نقل کرنے کے بعد انھوں نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ

> "اصل یہ ہے کہ میر کی سیرت اور کلام میں بہت سے تناقضات ملتے ہیں اور بعض وقت تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو میر ہیں" ص ۲۱۴

یہ کتاب تین حصوں اور پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں میر اور ان کے خاندان کے حالات و سوانح اور ان کے تاریخی ماحول کا ذکر ہے جو صفحہ ۴۹ سے شروع ہو کر صفحہ ۲۷۷ پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرے باب میں میر کی سیرت کا تذکرہ اور اس سے متعلق مختلف مباحث پر گفتگو ہے۔ تیسرا باب جو در حقیقت فاضل مصنف کی تنقید کی اعلیٰ

صلاحیت اور قوت انشا کا بہترین مظہر ہے۔ میر کی تصانیفِ نظم پر ہے اور اس سلسلہ میں انھوں نے میر کے فن اور ان کے کلام پر بڑی جامع اور سیر حاصل بحث کی ہے۔ باب چہارم میں میر کی تصانیفِ نثر اور ان کی خصوصیات کا تذکرہ ہے۔ باب پنجم میں مختلف مخطوطات کے اقتباسات نقل کر کے میر کے مرتبہ کا تعین کیا گیا ہے اور سب سے آخر میں نہایت قیمتی ضمیمے ہیں جن میں سے اکثر اب تک مخطوطات کی ہی شکل میں موجود ہیں۔ اس کے بعد ماخذ کی ایک طویل فہرست ہے اس طرح میر پر یہ ایک کتاب نہیں بلکہ انسائیکلوپیڈیا ہے جو لفظاً و معناً۔ ظاہراً و باطناً ہر اعتبار سے بے حد قابلِ قدر اور لائق داد ہے امید ہے کہ اربابِ ذوق اس کے مطالعہ سے لطف اندوز ہو کر فاضل مصنف کی محنت و جستجو اور تحقیق داد بیت کی داد دیں گے۔

اقبال اور اسلام از جناب سحر عظیم آبادی تقطیع خورد ضخامت ۵۶ صفحات، کتابت وطباعت بہتر قیمت درج نہیں پتہ :۔ حاجی محمد سعید اینڈ سنز تاجر کتب ۵۵ خلاصی ٹولہ۔ کلکتہ نمبر ۱۳

یہ دراصل ایک مقالہ ہے جس میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کے کلام کے جستہ جستہ اقتباسات سے یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال صرف ایک اسلامی شاعر تھے اور انھوں نے اپنی شاعری کی بنیاد قرآن پر رکھی تھی۔

لائق مقالہ نگار کا یہ دعوی بالکل صحیح ہے لیکن اسلام سے مراد اقبال کے نزدیک وہ کوئی خاص محدود تصور نہیں ہے جو کسی قومیت اور وطنیت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہو اور جس کی وجہ سے انسان، انسان میں تفرقہ و امتیاز کی دیوار حائل کی جائے۔ بلکہ اسلام سے مراد وہ مکمل ضابطۂ حیات ہے جو تمام انسانوں کے لئے ہے اور جو اپنے پیروؤں میں تمام بنی نوع انسان بلکہ پوری کائنات عالم کے لئے جذبۂ ہمدردی و محبت اور ان کی خدمت و خیر سگالی کا ولولہ پیدا کرتا ہے اس بنا پر اقبال ایک اسلامی شاعر ہونے کے باوجود ایک عالمی شاعر ہیں اور ان کو کسی خاص فرقہ یا گروہ کا شاعر یا اس کا ترجمان سمجھنا صحیح نہ ہو گا۔ مقالہ بہرحال لائق مطالعہ ہے

برہان

جلد ۳۴ — شمارہ نمبر ۵

مئی ۱۹۵۵ء مطابق رمضان المبارک ۱۳۷۴ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

بمبئی کے دینی تعلیمی کنونشن میں جو سنٹرل بورڈ بنا تھا گذشتہ مارچ کی آخری تاریخوں میں اس
بورڈ کا پہلا جلسہ دلی میں ہوا۔ جس میں بورڈ کا دستور مرتب کرکے پیش کیا گیا اور وہ منظور ہوگیا اس
کے علاوہ بورڈ سے متعلق جو بعض انتظامی امور تھے وہ طے ہو گئے گویا اس طرح کام کرنے کی ایک
لائن بچھ گئی ہے اور اب صرف کام کا شروع کر دینا باقی ہے۔

اس موقع پر یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جمعیۃ علمائے ہند نے بطور خود یہ کام بہت پہلے سے ہی
شروع کر رکھا ہے اور اس نے کنونشن کے انعقاد کا انتظار نہیں کیا۔ چنانچہ ابھی حال میں دفتر جمعیۃ
کی طرف سے جو ایک پمفلٹ شائع ہوا ہے اس میں جمعیۃ کے اس کارنامے کی مفصل اور معلومات افز
تفصیل دے دی گئی ہے۔ یعنی مثلاً یہ کہ مشرقی پنجاب میں کہاں کہاں کس علاقہ میں اب مسلمانوں کی
کتنی آبادی ہے۔ جمعیۃ نے ان علاقوں میں کہاں کہاں دینی مکاتب قائم کئے ہیں اور ان مکاتب میں طلب
یا طالبات کی تعداد کتنی ہے۔ حق یہ ہے کہ اس پمفلٹ کے مطالعہ سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ عام
خیال کے مطابق جمعیۃ علمائے ہند صرف ہنگامی اور وقتی مسائل پر ہی اپنی صلاحیت و قوت خرچ نہیں
کر رہی ہے۔ بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کا جائزہ اس نے بڑی دیدہ وری اور روشن
خیالی کے ساتھ لیا ہے اور اس جائزہ کی روشنی میں اس نے مسلمانوں کے دینی تحفظ کے لئے جو پروگرام
سوچ سمجھ کر طے کیا ہے اس پر اپنی بہترین تنظیمی صلاحیتوں کے ساتھ بڑی خاموشی اور استقلال
سے عمل بھی کر رہی ہے۔

دینی تعلیمی سنٹرل بورڈ کے قیام کے بعد اب ان دینی مکاتب کو قائم کرنے کی جدوجہد عام در

ئیرہو جانی چاہتے اور اس کو ایک ایسے وسیع پیمانہ پر چلانا چاہیے کہ ہندوستان کا کوئی قصبہ ۔ کوئی
ؤں ایسا نہ رہے جہاں مسلمانوں کا ایک بھی گھر ہو اور وہاں مکتب نہ ہو، بورڈ کے سامنے یہی کام ہے
ریہی اس کو کرنا ہے ۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس میں خاطر خواہ کامیابی اس وقت تک نہیں ہو سکتی
ب تک کہ عام مسلمان پوری تندہی اور جوش کے ساتھ اشتراکِ عمل نہ کریں اس سلسلہ میں سب
ے مقدم سوال فنڈ کا ہے ہندوستان میں اگر مسلمانوں کی آبادی چار کرور بھی مان لی جائے جو یقیناً
صل آبادی سے کم ہے تب بھی ۲ / فی کس کے حساب سے رقم جمع کی جائے تو پچاس لاکھ روپیہ
مع ہو جاتے ہیں ۔ کہنے کو یہ بہت بڑی رقم ہے لیکن جس اہم اور عظیم الشان کام کو انجام دینا ہے
س کے لئے یہ کچھ ایسی زیادہ بڑی رقم بھی نہیں ہے ۔

دنیا میں ہر قوم اور ہر جماعت کی زندگی اسی وقت تک قایم رہتی ہے جب تک کہ وہ اپنی
ڈیالوجی پر مضبوطی کے ساتھ قایم رہے اور اس کے اعمال و افعال ۔ اطوار و اخلاق اور بود و ماند
یں اُس آڈیالوجی کے اثرات پائے جائیں ۔ جب یہ قاعدہ عام اور کلیہ ہے تو مسلمان اس سے کس طرح
ستثنیٰ ہو سکتے ہیں ۔ پھر مسلمانوں کا معاملہ تو یہ ہے کہ ان کے لئے صرف مادی زندگی کا اور دنیا میں
بحیثیت ایک قوم کے زندہ رہنے کا سوال نہیں ہے بلکہ اُن کی آخرت میں نجات اور کامرانی ان
سب کا دار و مدار اسی اپنی آڈیالوجی کے ساتھ گہری وابستگی اور اس پر عمل کرنے پر ہے پس جب
یہ بات طے شدہ ہے اور اس سے انکار کسی کو بھی نہیں ہو سکتا تو اب سوال یہ ہے کہ مکتب کی دینی
تعلیم کے بغیر ایک قطعاً غیر اسلامی ماحول اور سوسائٹی میں زندگی بسر کرنے کے باوجود یہ مقصد کس
طرح حاصل ہو سکتا ہے ۔ ممکن ہے انفرادی طور پر کوئی ایک شخص اپنے گھر پر اس کا انتظام کر سکے
لیکن چند ایک لوگوں کا ایسا انتظام کر لینے سے پوری قوم کی مشکل تو حل نہیں ہو سکتی ۔ اس بنا پر
مسلمانوں کا نہایت اہم فرض ہے کہ وہ اپنے فروعی اختلافات کو پس پشت ڈال کر ہم آہنگی اور یک جہتی
کے ساتھ دینی تعلیمی سنٹرل بورڈ کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں اور اس کی امداد کرنے میں پس و پیش نہ کریں ۔

"برہان" کی گذشتہ اشاعت میں ڈاکٹر محمد احمد کا ایک مضمون "مثنوی رومی میں بے جا تصرفات"
کے عنوان سے شائع ہوا تھا اس سلسلہ میں مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی اپنے ایک والانامہ میں لکھتے ہیں
"برہان کا اپریل نمبر کل پڑھنے کا موقع ملا۔ مضمون "مثنوی رومی" میں متعدد خامیاں ہیں
صرف چند کی مختصر نشاندہی کئے دیتا ہوں

(۱) ص ۲۴۰۔ من ز قرآن الخ۔ صحیح شعر یوں ہے

ما ز قرآن برگزیدیم مغز را پوست را پیش سگاں انداختیم

شعر مثنوی کا نہیں غزل کا ہے۔ پوری غزل ۱۳ شعر کی کلیات شمس تبریز (نول کشور)
ص۵۴۶ پر چھپی ہوئی موجود ہے اور شمس تبریز کا کلام مولانا ہی کا سمجھا گیا ہے۔ دورِ مثنوی سے قبل کا۔
دو شعر اسی غزل کے اور سن لیجئے ؎

ما دل اندر راہِ جاناں باختیم غلغلہ اندر جہاں انداختیم

جبہ و دستار و علم و قیل و قال جملہ در آبِ رواں انداختیم

(۲) ص ۲۴۳ چوں صحابہ الخ و ص ۲۴۵ ایں کلام صوفیاں الخ وغیرہ بے شک یہ شعر
ایک غالی شیعہ شاعر کے ہیں لیکن مصنف اور کتاب دونوں کے نام غلط درج ہوتے ہیں۔ بہاء الدین
عاملی (نہ کہ آملی) شیعیت کے باوجود صوفی تھے اور ان کی مختصر مثنوی "نان و حلوا" ٹھیک مولانا
رومی کے رنگ میں ہے۔ مشہور شعر "باز گو از نجد و از یاران نجد" اسی مثنوی کا ہے اور
مولانا کا ذکر بھی اس میں بڑی عقیدت سے موجود ہے۔ وہ بیہودہ اشعار مفتی محمد عباس
لکھنوی کی مثنوی "من و سلوی" کے ہیں۔ یہ حضرت حال میں گذرے ہیں۔ یعنی غالب
کے معاصر تھے ایک اور شعر بھی ان کا اسی رنگ کا سن لیجئے

در تصوف می شود شیریں کلام زانکہ باشد در گنہ لذت تمام

لکھنؤ کے شیعہ حلقوں میں ادیب بے عدیل اور شاعر بے مثال سمجھے جاتے ہیں۔

کائنات سے استفادے کے حدود

از

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی)

(۲)

اس طرح نت نئے تجربات کی مشق گاہ بنانے کی جرأت بھلا مخلوق پرستوں میں ان ہی چیزوں کے متعلق کیسے پیدا ہو سکتی تھی جو معبود بنا کر ان ہی کے آگے کھڑے ہو ہو کر کانپ رہے تھے۔ تھرا رہے تھے۔

میں نے جو یہ عرض کیا کہ ان دونوں متخالف و متضاد نظریات ایک ہی نتیجہ کو ہر زمانہ میں پیدا کرتے رہے، اس سے میری غرض یہی ہے، یہی کہنا چاہتا ہوں کہ دونوں دائروں میں کائنات سے استفادے کا مسئلہ پرہاشک، تذبذب تردد کی ذہنی اور فکری کش مکشوں کا ہر زمانہ میں شکار رہا۔

اپنا ذاتی خیال تو یہی ہے، کہ دوسرے تباہ کن مہیب نتائج کے سوا اس کو بھی ایک قسم کی سزا ہی سمجھنا چاہئے کہ جس حد تک دنیا کی چیزوں سے آدم کی اولاد فائدہ اٹھا سکتی تھی اس سے وہ محروم رکھی گئی اور یہ جو دیکھا جاتا ہے کہ مسئلہ توحید اور چند خاص محوری مہمات جن پر قرآنی تعلیم گردش کرتی ہے، ان کے بعد آخری دفعہ جو کتاب خدا کی طرف سے بندوں کو اس ذمہ داری کے ساتھ سپرد کی گئی ہے کہ قیام قیامت تک کمی بیشی، ترمیم و اضافہ کی راہوں کو قدرت کا مضبوط ہاتھ بند رکھے گا، اسی کتاب میں انتہائی اختصار پسندی کے باوجود کائنات سے استفادے کے مسئلہ کو اجمال و تفصیل دونوں رنگوں میں پوری طاقت کے ساتھ واضح کیا گیا ہے، کہہ چکا ہوں کہ اس سلسلہ کی آیتوں کو ایک ہی جگہ جمع کرنے کا ارادہ اگر کیا جائے۔ تو

قرآن کا معقول معتد بہ حصہ ہی نقل کرنا پڑے گا۔ بہرحال یہ ایک واقعہ ہے قرآن کا ہر پڑھنے والا جس سے واقف ہے۔

مگر یہ بات کہ ایسا مسئلہ جو چنداں نظری بھی نہ تھا اتنا غیر معمولی زور اس پر کیوں دیا گیا ہے منجملہ دوسرے اسباب وجوہ کے بالکل ممکن ہے ایک وجہ اس کی یہ بھی ہو کہ آئندہ کائنات سے استفادے کی راہوں میں روڑوں کے اٹکانے اور امچنے کی کوئی گنجائش کسی لحاظ سے باقی نہ چھوڑی جائے، ہو سکتا ہے ایک مقصد اس طریقہ بیان کا یہ بھی ہو، آپ قرآن اٹھا لیجئے، پڑھتے چلے جائیے ورق ورق صفحہ صفحہ میں اسی مسئلہ کی متعلقہ آیتوں کا ذخیرہ آپ کے سامنے آتا چلا جائے گا اجمالی رنگ میں جہاں ایسی آیتیں آئیں گی مثلاً

هو الذی خلق لکم مافی الارض جمیعا (البقرہ) — وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے۔

جس میں زمین اور زمین کی پیداواروں ہی سے استفادہ کا اجازت نامہ عطا کیا گیا ہے تو دوسری جگہ

سخر لکم مافی السماوات وما فی الارض جمیعا منه (الجاثیہ) — اور تمہارے کام میں لگایا (خدا نے)، ان چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں، اور جو کچھ زمین میں ہے، سب کچھ اسی کی طرف سے ہے۔

کا "لاہوتی پروانہ" بھی آپ کو اسی کتاب میں مل جاتے گا۔ جس میں آپ دیکھ ہی رہے ہیں زمین کے ساتھ ساتھ ان ساری چیزوں کو بھی جو آسمانوں میں ہیں، بنی آدم کے تسخیری حدود میں قرآن نے داخل کر دیا ہے "جمیعا منه" (سب کچھ اسی کی طرف سے ہے) یعنی خالق کائنات ہی کی طرف سے یہ حق آدم کے بچوں کو عطا ہوا ہے، اسی کی توثیق ان الفاظ سے کی گئی ہے:

اسی طرح بجائے اجمال کے اگر تفصیل مطلوب ہو تو کچھ نہیں قرآن کی ایک ہی سورۃ

النحل نامی کے آغاز کی ان آیتوں ہی کو پڑھیے جس میں حیوانی زندگی کے مظاہر (الانعام) یعنی مویشیوں سے بات بایں الفاظ شروع ہوتی ہے،

والانعام خلقها لکم فیها دفء ومنافع ومنها تاکلون ولکم فیها جمال حین تریحون وحین تسرحون وتحمل اثقالکم الیٰ بلد لم تکونوا بالغیه الا بشق الانفس ان ربکم لرءوف رحیم والخیل والبغال والحمیر لترکبوها وزینة ویخلق ما لا تعلمون

اور مویشیاں تمہارے لئے خدا نے پیدا کیں تمہارے لئے اس میں گرمی حاصل کرنے کا سامان ہے (یعنی اون، گوشت) اور دوسرے منافع ہیں ان ہی مویشیوں سے خوراک بھی حاصل کرتے ہو تمہارے لئے دیدہ زیب ہے (مویشیوں کا نظارہ) جب پھرواتے ہو ان کو اور انھیں چراتے ہو اور وہی (مویشیاں) تمہارے بار اٹھا کر ان آبادیوں تک پہنچاتی ہیں جہاں جان توڑ محنت کے بغیر تم نہیں پہنچ سکتے تھے۔ بے شک تمہارا رب بڑا مہربان اور رحم والا ہے اور (خدا نے) پیدا کئے گھوڑے، خچر، گدھے تاکہ ان پر چڑھو اور ان سے رونق بھی ہے

حیوانی زندگی کے چند خصوصی مظاہر اور ان کے استعمال کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے آگے پانی اور پانی سے اگنے والی روئیدگیوں کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

هو الذی انزل من السماء ماء لکم منه شراب ومنه شجر فیه تسیمون ینبت لکم به الزرع والزیتون والنخیل والاعناب ومن کل الثمرات ان فی ذلك لآیة لقوم یتفکرون۔

وہی (خدا ہے) جس نے اتارا آسمان سے تمہارے لئے پانی جسے تم پیتے ہو، اور اسی پانی سے درخت بھی اگتے ہیں) جن میں چراتے ہو، اگاتا ہے تمہارے لئے اسی پانی سے) کھیت اور زیتون (تیلھن) اور کھجوریں اور انگور اور ہر قسم کے میوے یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں

کے لئے جو سوچتے ہیں۔

اور بات اسی پر ختم نہیں ہو جاتی ہے آگے اسی کے بعد ہے

وسخر لکم اللیل والنھار والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ ان فی ذلک لآیات لقوم یعقلون

اور کام میں تمہارے لگایا (اسی نے) رات اور دن کو اور آفتاب و ماہتاب اور تارے، کام لگاتے ہوتے ہیں اسی کے حکم سے اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں

پھر زمین پر رنگ رنگ کے جمادات، نباتات، حیوانات پتنگے تتلیاں اور ان کے سوا بھی جو کچھ ہمارے سامنے ہے سب ہی کی طرف اور ان کی بوقلمونیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوتے فرمایا گیا ہے۔

وما ذرء لکم من الارض مختلفا الوانہ ان فی ذلک لآیۃ لقوم یذکرون

اور زمین ہی سے اس نے پھیلا دیا ایسی چیزوں کو جن میں طرح طرح کے رنگ ہیں اس میں نشانی ہے ان لوگوں کو جو چونکتے ہیں،

"خشکی" یا البر سے گذر کر اس کے بعد البحر کی طرف قرآن متوجہ ہوتا ہے، ارشاد ہوا

وھو الذی سخر البحر لتاکلوا منہ لحما طریا وتستخرجوا منہ حلیۃ تلبسونھا وتری الفلک مواخر فیہ ولتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون

وہی (خدا) ہے جس نے بحر (سمندر) کو تمہارے قابو میں کر دیا ہے تاکہ اس سے تر و تازہ گوشت کو کھاؤ اور گہنا جسے تم پہنتے ہو اسی سمندر سے نکالو، اور تو دیکھتا ہے جہازوں کو جو سمندر میں چیرتے ہوتے اسی لئے چلتے ہیں تاکہ تم اللہ کے فضل کو حاصل کرو اور اسی کا گن گاؤ"

پھر کوہستانی سلسلوں اور پہاڑی زنجیروں کا تذکرہ چھیڑتے ہوتے فرمایا گیا ہے۔

والقی فی الارض رواسی ان

اور زمین پر (خدا نے) ڈال دیا بوجھ تاکہ نہ ڈگمگائے

تمید بکم وانھارا وسبلا لعلکم تھتدون وعلامات وبالنجم ھم یھتدون

وہی زمین غبار سے ساتھ اور نہریں راستے تاکہ تم راہ پاؤ، اور بنائیں خدا نے نشانیاں اور تاروں سے لوگ راہ پاتے ہیں۔

یہ ایک سورہ کی پہلے رکوع کے چند فقرے ہیں، حیوانات، نباتات سفلیات وعلویات ارضیات، وسماویات، بر و بحر، سہل وجبل کے سلسلے کون سی قابلِ ذکر چیز رہ گئی ہے جن کی طرف اشارہ کر کر کے قرآن ہر ایک کو بنی آدم کے اس "پیدائشی حق" کے احاطے میں داخل کرتا چلا نہیں گیا ہے، جو کائناتی حقایق سے استفادے کی راہوں میں ان کو قدرتاً حاصل ہیں، حیوانات بھی تیرے لئے ہیں، اور نباتات بھی، آفتاب بھی تیری خدمت انجام دے رہا ہے اور ماہتاب بھی سیاروں سے بھی تم لے سکتے ہو، بلکہ لے رہے ہو اور ثوابت سے بھی، دن اپنے سارے منافع کے ساتھ اور رات اپنی ساری سکون بخش راحت رسانیوں کے ساتھ چوبیس گھنٹوں میں ہمارے گھروں میں جو پہنچتی ہے۔ ان کی گردش کا سلسلہ جو جاری ہے تو یہ سارے کرشمے آسمان کے ان ہی روشن اجرام کے تو ہیں ہر کے ساتھ بحری کی پیداواروں سے جو ہم مستفید ہو رہے ہیں، ان ہی کی وجہ سے آبی راہوں کا ایک جال ہی بسیطِ ارض پر بچھا ہوا ہے جن سے آبادیوں کے کاروباری رشتے قایم ہیں اور وزنی چٹانوں کے یہ تودے، جو ہزارہا ہزار فٹ کی بلندیوں کے ساتھ زمین کے کناروں پر پہاڑوں کی شکل میں کھڑے نظر آ رہے ہیں ان میں لوہے، سونے، چاندی اور اسی قسم کی ٹھوس، بوجھل چیزیں جو پیدا ہوتی رہتی ہیں مجموعی طور پر ان سب سے توازن کی جو کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور پھر ان ہی پہاڑوں سے ٹکرا ٹکرا کر بادل جو برستے ہیں دریا ندیاں نالے نہریں جھرنے جو ان ہی پہاڑوں سے جاری ہیں، اور اس کے سوا خدا کی پیدا کی ہوئی اس دنیا سے جو فائدے ہمیں پہنچ رہے ہیں، اور آئندہ پہنچے رہیں گے آپ اگر غور کریں گے تو ایک سورہ کی ان ابتدائی آیتوں ہی میں یہ ساری چیزیں مل جائیں گی بلکہ ذرا سنبھل کر سوچئے ان ہی آیتوں سے کم از کم ان نتائج تک بھی معمولی سمجھ بوجھ

رکھنے والے نفوس بآسانی پہنچ سکتے ہیں یعنی

(۱) کائناتی حقائق سے استفادے کو قرآن نے ناگزیر ضرورتوں ہی کی حد تک محدود نہیں رکھا ہے، بلکہ انسانی فطرت میں حسن پسندی، جمال جوئی کے جبلی جذبات جو پائے جاتے ہیں، زیب و زینت، آرائش و آسائش کے سامانوں کی گوارائی کا تخم اس کی سرشت میں جو بو دیا گیا ہے، فطرت کے ان میلانات و رجحانات کو مردہ یا نژمردہ بنانے کی کوشش تو قرآن کیا کرتا بالکل اس کے برعکس مویشیوں اور ان کے ریوڑوں کے وہ دل نواز نظارے جب باہم ملی جلی ہوئی چراگاہوں کی طرف صبح سویرے آبادیوں سے نکل نکل کر یہی مویشیاں روانہ ہوتی ہیں اور سرشام ان ہی آبادیوں کی طرف ان کی واپسی ہوتی ہے۔

لکم فیہ جمال حین تریحون	تمہارے لئے دیدہ زیب (نظارہ) ہے جب پھیر
وحین تسرحون	لاتے ہو ان کو اور جب چراتے ہو،

کے بلیغ الفاظ میں اس نظارے سے لذت گیری کے جذبہ کو آپ دیکھ رہے ہیں قرآن جگا رہا ہے وہ سواری کے جانوروں گھوڑوں، خچروں، گدھوں کا ذکر کرتے ہوئے، صرف یہی خبر نہیں دیتا کہ تم ان پر سوار ہوتے ہو، بلکہ لترکبوھا (تاکہ تم ان پر چڑھو) کے بعد "زینۃ" کے لفظ کا بھی اضافہ کیا گیا ہے، پھولوں، پھلوں اور طرح طرح کی نباتی روئیدگیوں کے ساتھ رنگ رنگ کے حیوانی مظاہر جو زمین پر پھیلے ہوئے ہیں، ان میں حسین پرندوں، چرندوں، درندوں کے ساتھ صرف حشرات الارض ہی کی گوناگوں، قسموں، اور بوقلموں صنفوں پر غور کیجئے اور ان ہی پر قرآنی الفاظ

ماذرء لکم من الارض مختلف	اور بکھیر دیا تمہارے لئے زمین پر ان چیزوں کو جن
الوانہ	کے رنگ مختلف ہیں۔

کو منطبق کر کے دیکھئے، کیا ایک لمحہ کے لئے اس کتاب کے پڑھنے والوں اور اس پر ایمان لانے والوں کے دلوں میں اسپریچوازم کی غیر فطری افسردگیوں اور زبردستی پیدا کی ہوئی جبری آزردہ خاطریوں کو راہ مل سکتی ہے۔

۲۔ براہِ راست کائنات کی جن چیزوں سے آدمی مستفید ہو رہا ہے، ان ہی کا نہیں بلکہ بالواسطہ جن کے فوائد ہم تک پہنچتے ہیں، دیکھئے اسی فہرست میں ایسی چیزیں بھی آپ کو ملیں گی، ہریالیاں جنھیں ہماری مویشیاں اور ہمارے پالتو جانور چرتے چگتے کھاتے پیتے ہیں، ظاہر ہے کہ براہِ راست ہی نہیں بلکہ ان سے ہم بالواسطہ ہی مستفید ہو رہے ہیں۔

۳۔ اس سلسلہ میں جو سہولتیں اور جو آسانیاں آدمی کو میسر آرہی ہیں مثلاً سواری کے جانوروں کی وجہ سے جو دشواریاں کم ہوئیں، ان کو خالقِ کائنات کی صفت رافت ورحمت کا مظہر قرآن دیتا ہے، سواریوں کے ذکر کے بعد آخر میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ

ان اللّٰہ بالناس لرؤف رحیم — بے شک اللہ آدمی کے ساتھ مہربان اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔

آپ ہی بتائیے اس سے کیا سمجھ میں آتا ہے۔

۴۔ بلکہ حیوانی سواریوں کے بعد جو

ویخلق مالا تعلمون — اور پیدا کرتا ہے (خدا ایسی سواریوں کو) جنھیں تم نہیں جانتے،

کے الفاظ جو پائے جاتے ہیں کوئی چاہے تو ان سے اپنے ذہن کو سیر وسفر کے ان نت نئے ذرائع کی طرف بھی منتقل کر سکتا ہے جنہیں سہولت پسندی کے طبعی رجحانات ہمارے سامنے لا چکے ہیں یا آئندہ لانے والے ہیں۔ اور اسی سے سمجھ میں آتا ہے، کہ ایجادات واختراعات جن سے زندگی کی دشواریوں میں آسانیاں پیدا ہو رہی ہیں یہی نہیں کہ قرآن میں ان کی ہمت شکنی نہیں کی گئی ہے بلکہ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ عموماً شاباشیوں اور حوصلہ افزائیوں ہی سے اس سلسلہ میں کام لیا گیا ہے تو شاید یہ دعویٰ بے بنیاد نہیں ہو سکتا۔

طرفہ تماشا ہے کہ استعمالی غلطیوں سے لوگ مفید سے مفید چیزوں کو ضرر رساں جب بنا لیتے ہیں، تو جو نہیں سمجھتے وہ ان ہی چیزوں کے درپے ہو جاتے ہیں حالانکہ ضرورت ہوتی ہے

کہ استعمال کے سلیقہ کو درست کیا جائے،

آپ بندوق کیوں چھینتے ہیں، ان ہاتھوں کو درست کیجئے، جن میں پہنچ کر چوری اور ڈاکے جیسے کاموں میں مدافعت یا شکار کا یہ قیمتی اوزار استعمال ہونے لگا ہے[1]، انسانیت کی تصحیح کے ایک ایک ذریعہ کو آپ ختم کرتے چلے جارہے ہیں اور اس کے بعد پوچھتے ہیں کہ انسانیت کے لئے آدمی ہی کے ایجاد کئے ہوئے اکتشافات و اختراعات اس کے گلے کی پھانسیاں بنتی کیوں چلی جارہی ہیں۔

یاد ہوگا "حقوق و فرائض" جن کو ہم انسانی زندگی کے اسلامی نظام میں پاتے ہیں ان میں سے پہلی بات، یعنی خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں سے مستفید ہونے کا استحقاق، اس استحقاق کا اعتراف اور توثیق اس کو تو اسلام نے اپنے عملی نظام کا جز بنادیا ہے۔ لیکن ان قدرتی پیداواروں میں سے ہر ایک کے استعمال کا طریقہ۔ ان کے خصوصیات و صفات کی سراغ رسانی اور ان ہی معلومات کی روشنی میں نت نئی ضرورتوں میں ان کا برتنا، ان سارے تفصیلات کو آدمی کے حواس و عقل اور جسمانی توانائیوں کے سپرد کردیا گیا ہے، پانی آدمی کے لئے ہے، لیکن اس پانی تک رسائی کے کن ذرائع کو لوگ اختیار کریں۔ دریا اور ندیوں کے کنارے جاکر آباد رہیں، اور بھیڑ، بکری، گائے، بیل منہ ڈال کر جیسے دریا ندی تالاب سے پانی پیتے ہیں اسی طرح آدمی بھی پانی استعمال کرے۔ یا کنویں کھودے، چشموں کے پانی کو نالیوں کی راہ سے آبادیوں تک پہنچائے، یا نلوں کا ذریعہ اختیار کرکے سہ منزلہ پنج منزلہ عمارتوں تک اسی پانی کو کھینچ کرلے آئے ان دونوں باتوں میں سے آدمی کو اختیار دیا گیا ہے، جس راہ کو چاہے اختیار کرے، ابتداء میں معلومات کی کمی، تجربات کی قلت، عقول

---

[1] سیدنا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے براہ راست یہ روایت خاکسار نے سنی ہے کہ خواب میں دیکھنے والے کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت میسر آئی، دستِ مبارک میں بندوق تھی اور فرمایا جارہا تھا کہ نعم السلاح ہذہ (کیا اچھا ہتھیار ہے یہ) ۱۲ مناظر احسن گیلانی

کی خامیوں کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدت تک لوگ عقل سے زیادہ جسمانی قوتوں سے زندگی کے ضروریات کو حل کرنے کے عادی تھے۔ تاریخ کی شہادت بھی یہی ہے، اور قرآن سے بھی پتہ چلتا ہے کہ درختوں کے پتوں سے ستر پوشی کا کام لیا جاتا تھا، آدمی یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ مری ہوئی لاشوں کے ساتھ وہ کیا سلوک کرے۔ کوّے سے قبر کنی کا اشارہ اس کو ملا،

لیکن بہ تدریج اس کی فطرت میں وہی صلاحیت جس کی طرف قرآن ہی میں

علم الانسان مالم یعلم — سکھائی آدمی کو وہ باتیں جنہیں وہ نہیں جانتا تھا

سے اشارہ کیا ہے یعنی انجانی باتوں کے جان لینے کا قدرتی سلیقہ جو اس میں پایا جاتا تھا، وہی اجاگر ہوتا چلا گیا، معلومات کے نئے نئے ذخیرے اس کی عقل کے سامنے جمع ہونے لگے۔ ان معلومات پر عقل نے کام کیا۔ نئے امکانات اور ان سے پیدا ہونے والے نتیجوں کی طرف آدمی کا ذہن منتقل ہوتے ہوئے اس دور تک پہنچ گیا۔ جس سے ہم گذر رہے ہیں، یقیناً یہ ایک بڑی عظیم امتیازی صلاحیت تھی، جس کی نشو و نما کے حیرت انگیز ثمرات ہمارے سامنے ہیں لیکن اسی کے ساتھ قدرت ہی کا ایک قانون یہ بھی تھا یعنی آدمی اپنی جس قوت اور صلاحیت سے زیادہ کام لیتا ہے وہی زیادہ چمکتی اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح اپنی جن صلاحیتوں سے کام لینا لوگ چھوڑ دیتے ہیں تو دیکھا گیا ہے کہ بتدریج ضعف و اضمحلال کا نشانہ وہی صلاحیتیں بنتی چلی جا رہی ہیں۔

جب تک لوگ جسمانی قوتوں سے کام لینے کے عادی تھے، اس وقت تک ہماری جسمانی توانائیاں برسرِ عروج رہیں، بلاشبہ عقلیت اور تعلیمیت کے اس دور میں یہ باور کرنا مشکل ہے کہ آدمی کا انفرادی شخصی وجود، سینکڑوں سال تک حوادث کا مقابلہ کرتے ہوئے زندہ اور باقی برقرار رہتا تھا،

استواری و استحکام ہی میں آدمی کے جسدی نظام کی یہ کیفیت نہ تھی، بلکہ کمیت (مقدار)

میں بھی اسی کے قد و قامت کے متعلق ایسی خبریں دی گئی ہیں جن کا اس زمانہ کا انسان شاید تصور بھی نہیں کر سکتا بلکہ ان کے مقابلہ میں کہا جا سکتا ہے کہ ہم لوگ بالشتی قد کے حدود تک گویا پہنچ چکے ہیں۔[1]

کچھ بھی ہو، اتنی بات بہرحال مسلّم ہے کہ بجائے عقل و فراست کے جسمانی توانائیوں سے آدمی جس زمانہ میں زیادہ کام لیتا تھا، تو جن جسمانی مشقتوں کو وہ برداشت کر لیتا، موسم کی شدتوں کا مقابلہ کرتا تھا، اس زمانہ کے پیدا ہونے والوں سے ہم ان باتوں کی توقع عام حالات میں نہیں کر سکتے، اور تاریخ سے ہٹ کر مشاہدے سے بھی آپ اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں، آج بھی جنگلوں اور غیر شہری آبادیوں میں رہنے والوں کا مقابلہ شہروں کے تعلیم یافتہ لوگوں سے کر کے دیکھ لیجئے۔ اول الذکر طبقہ عقل سے زیادہ اپنی جسمانی صلاحیتوں ہی پر بھروسہ کرتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ اس میدان میں شہری آدمی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، آج ہماری تعلیم گاہوں کا سب سے بڑا اہم مسئلہ یہی ہے، کہ عقلی اور ذہنی تربیت پر زیادہ زور دے دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ جسمانی طور پر لوگ روز بروز پستی اور انحطاط کے گڑھوں میں تیزی کے ساتھ گرتے چلے جا رہے ہیں، کھیل کود کو تعلیم کا لازمی جز بنانے کا نظریہ اسی مشاہدے اور تجربہ کا نتیجہ ہے۔ مگر پھر بھی دیکھا یہی

---

[1] الاستاذ الامام الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے بخاری کی املائی شرح ص۱ ج ۳ میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ انگریزوں کا عمل دخل ہندوستان میں جب سے ہوا، یہ باشندگانِ ہند روز بروز پست قد ہوتے چلے جاتے ہیں حالانکہ ان ہی کے آبا و اجداد جو انگریزوں سے پہلے پیدا ہوئے تھے موجودہ نسلوں کے مقابلہ میں کافی قد آور ہوا کرتے تھے۔ شاہ صاحب اپنے مشاہدے کو شہادت میں پیش فرماتے تھے، دوسروں سے بھی اسی قسم کی باتیں سُننے میں آتی ہیں، حیوانوں کے متعلق تو روز بروز یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی چلی جاتی ہے، کہ گرگٹ اور چھپکلی کی نسلیں اسی زمین کے کرے پر اسی اسی فٹ کی پائی جاتی تھیں پہاڑوں اور ریگستانوں سے جانوروں کی ہڈیوں کے جو ڈھانچے آئے دن نکلتے رہتے ہیں ان سے بھی اس نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ نشو و نما میں زمین کی حالت کسی زمانہ میں آج کل کے دنوں سے بہت زیادہ بہتر تھی، ایسی صورت میں ابن خلدون وغیرہ کا یہ دعویٰ کہ قد و قامت میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوا ہے، عجیب ہے بخاری ہی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ کا قد ساٹھ ہاتھ کا تھا ۱۲

جاتا ہے کہ طلبہ میں جن پر علم و مطالعہ کا ذوق غالب ہے۔ عموماً کھیل کے میدانوں میں وہ پھسڈی ثابت ہوتے ہیں، اور کھلنڈرے طلبہ میں عام طور پر امتیاز و شہرت ان ہی کو حاصل ہوتی ہے جو کتاب اور درس کے اوقات کو بے کاری کے اوقات شمار کرتے ہیں،

الغرض کائنات سے استفادے کے سلسلے میں عمومی طور پر چونکہ عقلی اور تعلیمی رجحانات ہی غالب ہوتے چلے گئے، اس لئے جسمانی طور پر ہم نے جو کچھ بھی کھویا ہو، لیکن عقلی طور پر ہم نے بہت کچھ پایا بھی ہے اتنا کچھ اس راہ سے ہمیں مل چکا ہے اور آئندہ بھی ملتا رہے گا جس سے جسمانی مافات کی تلافی ہوتی رہے گی، سواریوں کے ذریعہ سے سہولتیں حمل و نقل سفر و سیاحت بار برداری میں جو میسر آئی ہیں، ان کو خدا نے اپنے اسماء رؤف رحیم کے مظاہر میں جو داخل فرمایا میری سمجھ میں تو اس سے یہی آتا ہے کہ عقلیت کے غلبہ کی وجہ سے آدم کی اولاد جن جسمانی سرمایوں سے محروم ہوتی چلی گئی، تو خدا کی صفت رافت و رحمت نے آدمی کو ایسی تدبیریں سجھائیں جن سے مسلسل مافات کی تلافی ہوتی چلی جارہی ہے، ایسی صورت میں ان نئے ایجادات اختراعات جن سے مشکلات حیات پر آدمی قابو یافتہ ہوتا چلا جارہا ہے، اگر ان کو خدا کی رحمت و رافت کے آثار و ثمرات میں ہم شمار کریں تو قرآن میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے مشکل ہی سے اس احساس کو غلط ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

اب استعمالی غلطیوں سے بجائے رحمت و رافت کے یہی ایجادات و اختراعات بنی آدم کے لئے اگر زحمت و مصیبت بن جائیں تو یہی کہا جائے گا، کہ خدا نے آدم کے بچوں کو تو بہشت ہی دی تھی، لیکن آدم سے رشتہ توڑ کر شیطان سے اپنا رشتہ جن لوگوں نے قائم کرلیا، شیطان کی اسی ذریت و نسل نے اس بہشت کو اپنے ہاتھوں سے اپنے لئے اس کو دوزخ بنالیا۔

ورنہ سچ تو یہ ہے کہ آدمیت اور آدمیت کی بقاء وارتقاء کے جو قدرتی ذرائع ہیں۔ ان سے وابستہ رہتے ہوئے اس وقت بھی آدمی کا کچھ نہیں بگڑتا تھا جب عقل سے زیادہ جسمانی قوتوں سے زندگی کی ضرورتوں کو حل کرتا تھا۔

آخر پانی پینے ہی والی مثال کو لیجئے، مان لیجئے کہ دریاؤں اور ندیوں میں منہ لٹکا کر پانی کسی زمانہ میں آدمی اگر پیتا تھا، تو یقیناً پیاس اس پانی سے بھی بجھ ہی جاتی تھی، کھانا ہضم ہی ہو جاتا تھا، غریزی حرارت سے تحلیل یافتہ اجزار کا بدل بھی مہیا ہی ہوتا رہتا تھا۔ اور آج چوتھی منزل کے نل سے پانی لے کر شیشے کے گلاسوں، چاندی اور سونے کے کٹوروں ہی میں پانی ہم کیوں نہ پیتے ہوں، تو نتیجۃً اب بھی پانی کا وہی فائدہ لوگوں کو حاصل ہو رہا ہے، جو ندی اور تالابوں کے کنارے منہ لٹکا لٹکا کر پینے والوں کو حاصل ہوا کرتا تھا۔

میں یہ مانتا ہوں کہ روز بروز جسمانی طور پر کمزور ہوتے چلے جانے والوں کے ساتھ ارحم الراحمین کا یہ بہت بڑا روفانہ رحیمانہ سلوک ہوا کہ اس نے سریع السیر سواریوں کی ایجاد کی توفیق بندوں کو عطا فرمائی، جن سواریوں کو ہم نہیں جانتے تھے قدرت ان ہی کو ہمارے سامنے لاتی چلی جا رہی ہے، لیکن ان عصری سواریوں سے ہماری جو نسلیں محروم تھیں، ان پر برتری کا دعوی محض ان ہی سواریوں کی بنیاد پر ہم کیسے کر سکتے ہیں۔ سوال و جواب کے ایک معمولی سلسلہ کے بعد بات آپ پر بھی واضح ہو جائے گی۔ پوچھیے کہ بیل گاڑی کے مقابلہ میں ریل کی سواری سے ہمیں کیا فائدہ پہنچا، یہی جواب ملے گا کم وقت میں دور دراز فاصلے طے ہو جاتے ہیں۔ کم وقت میں دور دراز فاصلوں کے طے ہونے کا کیا فائدہ؟ اگر یہ سوال اٹھایا جائے تو جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ مثلاً معاشی ذرائع کی فراہمی کا میدان وسیع ہو جاتا ہے یعنی زیادہ روپیہ کمانے کا موقعہ ملتا ہے۔ زیادہ روپیہ کمانے کا کیا فائدہ؟ جواب دیا جائیگا کہ زندگی کی ضرورتوں کی فراہمی میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ اس آسانی کا کیا فائدہ؟ آدمی کو خوش و خرم تندرست رہنے کا زیادہ موقعہ میسر آسکتا ہے۔ یہی آخری جواب ہے جس پر سوالوں کی تان ٹوٹتی ہے۔ اب آپ ہی انصاف سے فیصلہ کر لیجئے کہ ریل اور موٹر طیاروں اور سیاروں کے عہد میں پیدا ہوتے والے انسانوں کا یہ دعوی کیا بجا دعوی ہو سکتا ہے کہ بیل گاڑی اور اونٹ گھوڑوں پر سفر کرنے والی نسلوں کے مقابلہ میں خوشی و خرمی، تندرستی صحت و عافیت سے ان کو زیادہ حصہ ملا ہے؟

قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج

از

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق استاذ ادبیات عربی دہلی یونی ورسٹی)

جیساکہ معلوم ہے ابو یوسف یعقوب خلیفہ ہارون الرشید (م ۱۹۳ھ) کے چیف جسٹس تھے، اس سے پہلے وہ خلیفہ مہدی (م ۱۶۹ھ) اور ہادی (م ۱۷۰ھ) کے قاضی بھی رہ چکے تھے، رشید کے ذہن میں بہت سے سوال تھے جن کے بارے میں یا تو ان کو شک تھا، یا الجھن یا عدم واقفیت - یہ سوال انھوں نے قاضی القضاۃ کے سامنے پیش کئے اور ان کا مبسوط جواب طلب کیا، کتاب الخراج انھی سوالات کا جواب نامہ ہے - ان سوالات کا تعلق نہ تو عبادات سے ہے نہ افراد کے باہمی معاملات سے، اس لئے ایسے مسائل جیسے نماز، روزہ، حج یا شادی بیاہ، خرید و فروخت، لین دین، اس کتاب کے حدود سے خارج ہیں - کتاب کا موضوع ہیں وہ معاملات جو حکومت اور رعایا کے مابین رونما ہوتے ہیں، جن کا حکومت کے انتظام یا پالیسی سے تعلق ہوتا ہے جیسے بند و بست اراضی، نظام آب پاشی، نظام محصولات، قوانین جرائم، غیر مسلموں کے ساتھ پالسی -

مصنف نے خلیفہ کے ہر سوال کو الگ الگ لیا ہے اور اس کا جواب دیا ہے، چونکہ کتاب کی ابتدائی چند فصلیں اراضی اور لگان سے متعلق ہیں اور زیادہ تفصیل سے بیان ہوئی ہیں مصنف نے کتاب کا نام کتاب الخراج رکھ دیا ہے -

اسلام کے قانون لگان، قانون اراضی، قانون محصولات، قانون تعزیرات، غیر مسلم ذمی رعایا، ان کی عبادت گاہوں، ان کے حقوق اور پابندیوں سے متعلق یہ سب سے مستند اور ابتدائی کتاب ہے جو ہم تک پہنچی ہے -

کتاب کی ابتدا، ایک طویل مقدمہ سے ہوئی ہے جس میں مصنف نے نہایت مخلصانہ اور اثر انگیز انداز میں خلیفہ کو راستبازی اور رعیت پروری کی ہدایت کی ہے۔ چند اقتباس ملاحظہ ہوں:- "امیر المومنین خدا نے آپ کو حکومت کی بھاری ذمہ داری سونپی ہے، جس کا ثواب ہر ثواب سے زیادہ اور عذاب ہر عذاب سے سخت تر ہے۔ خدا نے مسلمان قوم کو آپ کی امان میں دے دیا ہے اور ان کی بہبودی کا بار آپ کے کندھوں پر ڈالا ہے، اور اس بار کو آپ کے کندھوں پر ڈال کر آپ کی آزمائش کرنا چاہی ہے۔ آپ کی صبح و شام بہت سے انسانوں کی تعمیر حیات کے لئے وقف ہو گئے ہیں اور ہر وہ عمارت جس کا سنگِ بنیاد تقوی یا خوفِ الٰہی کے علاوہ کسی اور اصول پر قائم ہو پائندہ نہیں ہوتی، بہت جلد خدا اس عمارت کو بنانے والے کے سر پر گرا دیتا ہے، لہذا رعیت کی سربراہ کاری کا جو منصب آپ کو دیا گیا ہے اس کو ناخدا ترسی یا بے توجہی سے ضائع نہ ہونے دیجئے ...... آج کا کام کل پر نہ چھوڑیے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو وہ کام ضائع ہو جائے گا، جس طرح چرانے والا مویشیوں کی حفاظت کے لئے ان کے مالک کے سامنے جواب دہ ہے، اسی طرح حکمراں خدا کے سامنے رعایا کی بہبودی کے لئے ذمہ دار ہیں...... رعیت کے کسی معاملہ میں اپنی ذاتی خواہش یا میلان کو دخل نہ دیجئے، نہ غصہ اور غضب میں آکر کوئی قدم بڑھائیے اور اس بات کا دھیان رکھئے کہیں خدا آپ سے ناراض نہ ہو جائے۔ احکام نافذ کرتے وقت اپنے پرائے، عزیز و اجنبی میں تفریق نہ کیجئے اور ایسا کرنے میں کسی کی ملامت یا شکایت کی پرواہ نہ کیجئے، خدا کا خوف یہ نہیں کہ زبان سے اس کا اظہار کیا جائے، خدا کا خوف یہ ہے کہ دل میں اس کا زندہ احساس ہو اور آپ کے ہر فعل میں اس کی جھلک نظر آئے...... ایسا نہ ہو کہ جب خدا کے سامنے آپ حاضر ہوں تو آپ کا نامۂ اعمال ظلم و ستم کی سیاہی سے رنگا ہو، روزِ جزا کی عدالت کا حاکم لوگوں کو اعمال کی بناء پر جزا و سزا دے گا، ان کے منصب یا خاندانی تعلق کا کچھ لحاظ نہیں کیا جائے گا۔ آپ کو بے مقصد پیدا نہیں کیا گیا اور آپ کو بغیر بازپرس کے نہیں چھوڑا جائے گا، بلاشبہ خدا

آپ سے آپ کے تمام افعال کے بارے میں پوچھ گچھ کرے گا، بس آپ خیال رکھئے آپ کیا جواب دیں گے - آپ کو یاد رہے کوئی انسان خدا کی پیشی سے اس وقت تک نہیں ہٹ سکتا جب تک ان چار سوالوں کا جواب نہ دے دے :- اپنے علم سے کس طرح کام لیا - اپنی عمر کو کن کاموں میں صرف کیا - مال کس طرح کمایا اور کن کاموں میں خرچ کیا - اپنے جسم کو کس تگ و دو میں کھپایا - امیر المومنین ان سوالوں کا جواب تیار رکھئے، وہ وقت نہ بھولئے جب خدا کی بھری مجلس میں ان تمام اعمال کی نقاب کشائی ہوگی جو آپ نے درپردہ کئے ہوں گے . .

. . . . خدا کی نظر میں تعمیری اور اصلاحی کاموں سے بہتر کوئی کام نہیں ہے اور تخریب و فساد سے زیادہ وہ کسی کام کو برا نہیں سمجھتا، ارتکابِ معاصی کفرِ نعمت کے مترادف ہے، اور جب کسی قوم نے نعمتِ خداوندی کی قدر نہ کی، ارتکابِ معاصی کیا مگر توبہ نہ کی، تو اُن کی عزت اور نعمت سب چھین لی گئی اور خدا نے دشمنوں کو ان پر مسلط کر دیا۔[۱]

قاضی ابو یوسف سنہ ۱۱۳ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۸۲ھ میں وفات پائی - تعلیمی زمانہ مالی دشواریوں میں گذرا،[۲] امام ابو حنیفہ (متوفی سنہ ۱۵۰ھ) کے خاص شاگرد تھے، امام صاحب ان کی مالی امداد بھی کرتے تھے، اور بڑی شفقت سے پیش آتے تھے، تعلیم سے فارغ ہو کر قاضی صاحب خلیفہ عباسی مہدی (متوفی سنہ ۱۶۹ھ) کے قاضی ہوئے مہدی کے بعد خلیفہ ہادی (متوفی سنہ ۱۷۰ھ) نے ان کو اس منصب پر برقرار رکھا اور جب ہارون الرشید خلیفہ ہوئے (سنہ ۱۷۰ھ) تو انھوں نے قاضی صاحب کو ان کے تجربہ، فقہی لیاقت اور دینی بصیرت

---

[۱] الکتاب الخراج ص۳-۴) [۲] قاضی تنوخی نے اپنی نشوار المحاضرہ میں (۱/ ۱۲۳ - ۱۲۴) لکھا ہے کہ قاضی ابو یوسف نے شدید افلاس کی حالت میں تعلیم حاصل کی شادی ہو چکی تھی اور یہ امام ابو حنیفہ کے حلقہ میں بڑی مستعدی سے تعلیم کے لئے جاتے تھے کمانے کے لئے بالکل وقت نہ ملتا تھا ان کی بیوی کسی نہ کسی طرح گھر چلاتی تھیں، ایک رات جب یہ پڑھ کر لوٹے اور کھانا مانگا تو بیوی نے ایک ڈھکی تھالی سامنے لا کر رکھ دی، ابو یوسف نے کھولا تو اس میں اپنے نوٹس اور کاپیوں کا انبار دیکھا، کھانے کے لئے کچھ نہ تھا، یہ دیکھ کر وہ روئے اور بھوکے سو رہے، صبح کو کھانے کا کچھ انتظام کیا اور دیر سے پڑھنے گئے اور سارا قصہ امام صاحب سے کہہ سنایا، انھوں نے کہا میں کچھ نہ کچھ تمہاری مدد کرتا رہا ہوں غم نہ کرو اگر تم جیتے رہے تو فقہ کی بدولت اخروٹ اور پستہ کے کیک کھاؤ گے

سے متاثر ہو کر ساری حکومت کا چیف جسٹس مقرر کیا۔

یہ بات کسی تعارف کی محتاج نہیں کہ امام ابو حنیفہ (۸۰ - ۱۵۰) صرف مشہور حدیثوں کو مانتے تھے جن کی تعداد بہت کم تھی اور آحاد احادیث کو تسلیم نہ کرتے تھے کیوں کہ احاد احادیث بہت بڑے پیمانہ پر وضع ہونے لگی تھیں اور یہ طے کرنا ممکن نہ تھا کہ کون سی حدیث اصلی ہے اور کون سی جعلی، اس لئے انھوں نے غیر مشہور حدیث نبوی اور حدیث صحابہ کی جگہ قرآن اور قرآن سے قیاس و اجتہاد کو قانون سازی کی بنیاد قرار دے لیا تھا اور قریب قریب یہی مسلک عراق کے اکثر فقہاء کا تھا، اس بنا پر عراق کے فقہاء کو "مدرسہ قیاس یا رائے" کہا جانے لگا۔ اس مدرسہ کے مقابلہ میں حجاز، شام، مصر، یمن وغیرہ میں ایسے فقہاء تھے جو قرآن کے بعد آحاد حدیثوں، صحابہ اور تابعین کے اقوال و فتاوی کو قانون سازی کی بنیاد قرار دئے ہوئے تھے، اور قیاس و اجتہاد سے صرف اس وقت رجوع کرتے تھے، جب مذکورہ مراجع سے کام نہ چلتا۔ بااین ہمہ عام طور پر ہر شہر کی احادیث اور اقوالِ صحابہ بلحاظ اسناد اور اکثر بلحاظ متن بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے تھے۔ قانون سازی کے اس مسلک کو "مدرسہ حدیث" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ مدرسہ قیاس و مدرسہ حدیث میں سخت نزاع تھا، ہر مدرسہ دوسرے پر شدید طعن کرتا اور دوسرے مسلک کو ناقابل اعتبار ٹھہراتا تھا۔

امام صاحب کے وقت تک مدرسہ قیاس بہت محدود تھا، کوفہ اس کا مرکز تھا اور کوفہ سے باہر عراق کے شہروں میں خال خال اس کے نمائندے پائے جاتے تھے۔ اس کے برخلاف "مدرسہ حدیث" کو بہت وسعت حاصل تھی، اکثر اسلامی صوبوں اور شہروں میں اس کا دور دورہ تھا، اور مسلمانوں کا سوادِ اعظم اس کے زیر اثر تھا، وجہ یہ تھی کہ جس بات کو رسول اللہ یا صحابہ کی طرف منسوب کیا جاتا وہ مقدس حیثیت اختیار کر لیتی اور عوام و خواص سب کی عقیدت کا مرکز بن جاتی اور چونکہ ہر جگہ کے محدث اور مفتی رسول اللہ اور صحابہ کی طرف منسوب کئے ہوئے اقوال پر مہر صحت ثبت کر دیتے، لوگ ان اقوال کی صحت کو مزید تحقیق

اور کھوج کئے بغیر مان لیتے تھے۔ قیاس اور اجتہاد کا معاملہ مختلف تھا، اس میں نہ تقدس کا پہلو تھا نہ عقیدت کا، اس کے علاوہ "قیاس" کے خلاف "مدرسۂ حدیث" ایک وسیع محاذ بنائے ہوئے تھا اور اس کو شریعت سازی، اور بدعت کے القاب سے یاد کرتا تھا، اس لئے عوام "مدرسۂ قیاس" سے بھڑکتے تھے۔

مدرسہ حدیث کا غلبہ عوام پر ہی نہ تھا بلکہ حکمراں طبقہ میں بھی اس کو پورا رسوخ حاصل تھا، قانونی معاملات میں اس کی طرف رجوع کیا جاتا تھا، قاضی و مفتی اسی مدرسہ سے مقرر کئے جاتے تھے اور حکمراں حلقے اس کا اثر اور اقتدار تسلیم کرتے تھے، نتیجہ یہ تھا کہ بہت سے لوگ خواہ وہ عالم دین ہوں، خواہ سرکاری ملازم، خواہ قاضی و مفتی، جن کے دل میں آحاد حدیثوں کی طرف سے بے اطمینانی ہوتی اور قیاس و اجتہاد کی طرف میلان، وہ کچھ تو رائے عامہ سے مرعوب ہو کر، کچھ اس ڈر سے کہ ان کی نوکری یا مراعات خطرہ میں پڑ جائیں گے "مدرسہ حدیث" سے مخالفت اور "مدرسہ قیاس" سے وفاداری کا برملا اظہار نہ کرتے تھے۔

امام صاحب کو اپنا "مسلکِ قیاس" بہت مہنگا پڑا "مدرسہ حدیث" ہر طرف سے ان پر ٹوٹ پڑا اور ان کی اور ان کے مسلک کی دھجیاں اڑا دیں، اس کا اندازہ خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد میں "امام صاحب" کے ذکر میں ان آرار کو پڑھ کر کیا جاسکتا ہے جو "مدرسہ حدیث" کے فقہاء نے ان کے بارے میں پیش کئے ہیں۔ امام شافعی (۱۵۰-۲۰۴) نے بھی اپنی "اُم" میں اس مسلک کی بڑی شد و مد سے مخالفت کی ہے اور امام مالک (م ۱۷۹ھ) کی موطّا بھی احاد حدیثوں کے مقابلہ میں ترکِ قیاس کے اصول پر لکھی گئی ہے۔

۱۔ قاضی ابو یوسف امام صاحب کے شاگرد تھے اور مدرسۂ قیاس سے وابستہ، مگر عملاً ان کا مسلک امام صاحب کے مسلک سے مختلف تھا۔ امام صاحب صرف مشہور احادیث کو حجت قرار دیتے ہیں مگر قاضی صاحب احاد حدیثوں، اقوالِ صحابہ کو بھی حجت مانتے ہیں بلکہ تابعین کے فتووں کو بھی قیاس و اجتہاد پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کا سبب ایک

تو یہ تھا کہ وہ نہایت مقتدر "مدرسہ حدیث" کے ہاتھوں جو خواص، عوام اور حکمرانوں میں غیر معمولی رسوخ رکھتا تھا۔ اپنے استاد کی طرح مطعون و مردود ہونا نہیں چاہتے تھے، دوسرے انھوں نے مدینہ جا کر امام مالک کے حلقوں میں کافی عرصہ شریک ہو کر بہت سی احاد احادیث کی صحت کے بارے میں اطمینان حاصل کر لیا تھا، اور شاید ایک سبب یہ تھا کہ قیاس کے استعمال اور مسائل کے استنباط کا معاملہ ان کو پیچیدہ اور پُر از خطر نظر آتا تھا۔

۲۔ بہر حال یہ اسباب ہوں یا ان کے علاوہ کچھ اور، واقعہ یہ ہے کہ کتاب الخراج حدیث اور روایت سے بھرپور ہے۔ ساری کتاب میں متوسط تقطیع کے ۲۱۶ صفحے ہیں جن میں رسول اللہ کی تقریباً ۱۰۵ حدیثیں اور صحابہ و تابعین کے ۳۶۳ اقوال بیان ہوئے ہیں۔ قاضی صاحب کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے دربارِ خلافت کے سوال کا جواب دیتے ہیں اور پھر اس جواب کی تائید میں رسول اللہ، صحابہ یا تابعین کے قول یا فعل کو بطور سند پیش کرتے ہیں۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ مصنف نے اپنی حدیثوں اور روایتوں کے انتخاب میں بڑی تاریخی و علمی لیاقت اور دینی بصیرت کا ثبوت دیا ہے، جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں انھوں نے اکثر وہی حدیثیں پیش کی ہیں جو قرآن کی اسپرٹ اور اسلام کی روح سے ہم آہنگ ہیں اور اس طرح رسول اللہ کا یہ فرمان پورا کر دکھایا ہے: "میری طرف منسوب کر کے آزادی سے حدیثیں بیان کی جائیں گی، پس اگر ایسی بات میری طرف منسوب ہو جو قرآن سے مطابقت رکھتی ہو تو اس کو مان لینا اور اگر ایسی بات منسوب کی جائے جو اس کے اصول اور اسپرٹ کے خلاف ہو تو سمجھ لو کہ میں نے نہیں کہی ہے۔"

۳۔ جہاں تک صحابہ کے اقوال کا تعلق ہے تو قاضی صاحب نے اکثر ان صحابہ کو سند کے لئے پیش کیا ہے جن کا تدین اور کارنامے مشہور ہیں، مثلاً کتاب میں عمرؓ بن خطاب کے اقوال و افعال کے حوالے سب سے زیادہ پیش کئے گئے ہیں، حضرت علیؓ اور ابو بکرؓ سے بھی استناد کیا گیا ہے اور حضرت عمرؓ کے بعد عمر بن عبدالعزیز (خلیفہ اموی از سنہ ۹۹ھ تا سنہ ۱۰۱ھ)

کے اقوال و آرار، سب سے زیادہ بطور سند بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں بہت سے اقوال ایسے ہیں جن کی توثیق و تائید تاریخی و ادبی کتابوں سے ہو جاتی ہے اور ایک بڑی تعداد ایسے اقوال کی ہے۔ اور یہ کتاب کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں۔ جو تاریخی و ادبی کتب میں تو نہیں ملتے مگر ان حضرات کی زندگی اور ان کی حکومت کی پالیسی سے گہری موافقت رکھتے ہیں اور اس لئے ان کو صحیح مانا جا سکتا ہے۔

۴۔ علمائے تابعین میں صرف ان حضرات کے اقوال نقل کئے گئے ہیں جن پر مصنف کو اعتماد ہے یا جن کے اقوال قرآن و اسلام کے بنیادی اصول سے نہیں ٹکراتے۔ ان علمار میں کوفہ کے شیوخ ہی نہیں بلکہ حجاز اور شام کے شیوخ بھی شامل ہیں، مثلاً حماد، ابراہیم، ابن ابی لیلی، شعبی اور ابو حنیفہ کے ساتھ امام مالک، نافع، سعید بن مُسَیَّب، زُہری کے فتوے بھی بیان کرتے ہیں، جس سے ان کی بے تعصبی اور صلاح اندیشی کا پتہ چلتا ہے۔

۵۔ اس میں شک نہیں کہ قاضی ابو یوسف زیادہ تر علمار کوفہ کا قانونی نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں تاہم ان کو علمار حجاز یا شام یا "مدرسہ حدیث" سے کوئی کد یا عداوت نہیں ہے، بلکہ ان کی رواداری کا حال یہ ہے کہ وہ جس طرح کوفہ کے علمار کے بارے میں کہتے ہیں: اما اصحابنا من اھل الکوفۃ فاختلفوا فی ذلک، وہ علمار حجاز کی نسبت بھی ایسے ہی دوستانہ لفظ استعمال کرتے ہیں: "وان اصحابنا من اھل الحجاز واھل المدینۃ علی کراھتہ ذلک وافسادہ" (ص)

۶۔ اسی طرح وہ ایسے راویوں کی روایت قبول کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے جو عام محدثین کی نظر میں مطعون یا ضعیف ہیں مثلاً محمد بن اسحاق اور کلبی، کیوں کہ ان کے پیش نظر یہ نہیں کہ راوی کس گروہ یا نظریہ سے تعلق رکھتا ہے بلکہ یہ کہ وہ جو کچھ کہتا ہے وہ کہاں تک حق سے کلی یا جزوی موافقت رکھتا ہے۔

۷۔ کتاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کہیں رد و قدح یا دوسروں پر اعتراض،

اور اپنے مسلک کی برتری کا اظہار جو فقہی کتب کی امتیازی شان ہے موجود نہیں ہے۔

۸۔ قاری کتاب میں مصنف کی خود فراموشی اور انکساری کا رنگ دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ وہ بادشاہِ وقت کے سامنے اپنا قانونی اجتہاد صرف ایک دوبار ہی پیش کرتے ہیں، باقی ہر مسئلہ میں رسول اللہ، صحابہ اور تابعین کی ہر وہ رائے جو ان کے فقہی و علمی بصیرت پر پوری اترتی ہے بلا تردد بیان کر دیتے ہیں، اور اگر کسی مسئلہ میں سلف کی دو یا زائد رائیں ہوتی ہیں اور ان میں کوئی اصولی نقص نہیں ہوتا تو وہ خلیفہ سے کہہ دیتے ہیں کہ آپ کو آزادی ہے ان میں سے جس کو چاہیں اختیار کر لیجئے۔

۹۔ کتاب کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب ایک نہایت دردمند حساس، اور خیر اندیش دل رکھتے ہیں، جن کی نظر میں قیامِ انصاف، استیصالِ ظلم، اور رعایا کی بہبودی، زندگی کا سب سے اہم فریضہ ہے اور اس فریضہ کا احساس وہ خلیفہ کے دل میں اسی لگن سے پیدا کرنا چاہتے ہیں جس طرح خود ان کے دل میں موجود ہے۔ ساری کتاب میں یہ اسپرٹ کار فرما ہے اور مصنف کا دردمند دل جگہ جگہ خلیفہ کو مشوروں کی صورت میں امنڈ آتا ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

(الف) ذمیوں سے جزیہ کی وصولی کے سلسلہ میں لکھتے ہیں: جزیہ وصول کرنے کے لئے ذمیوں کو مارا نہ جائے، ان کو دھوپ میں کھڑا نہ کیا جائے، نہ اور کوئی جسمانی اذیت پہنچائی جائے، بلکہ ان کے ساتھ نرمی اور لطف کا برتاؤ کیا جائے[1] پھر خلیفہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں: امیر المؤمنین خدا آپ کی مدد کرے، آپ اپنے حکام کو اس بات کی تاکید کر دیجئے کہ ذمیوں کے ساتھ لطف کا برتاؤ کیا جائے، اس کی پوری نگرانی کی جائے کہ ان پر ظلم نہ ہو، ان کو ستایا نہ جائے، نہ ان کی طاقت سے زیادہ جزیہ وصول کیا جائے، اور نہ کوئی چیز ان کی مال و متاع سے ناجائز طریقہ سے لی جائے، کیوں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے: جو

---

[1] کتاب الخراج ص۱۲۳

معاہد کے ساتھ ظلم کرے گا، یا اس کی طاقت سے زیادہ (لگان جزیہ) وصول کرے گا، میں اس سے قیامت کے دن مواخذہ کروں گا۔"

مصنف نے ایک روایت بیان کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُموی حکام ذمیوں سے ان کی طاقت سے زیادہ جزیہ وصول کرتے تھے جس کے زیر اثر ان کو اپنا سامان (مصنوعات وغیرہ) سستا بیچنا پڑتا تھا۔ خلیفہ عمر بن عبد العزیز سے کسی نے ان کے وقت میں اشیاء کی گرانی کا سبب پوچھا تو انھوں نے فرمایا: مجھ سے پہلے خلیفہ ذمیوں سے ان کی طاقت سے زیادہ جزیہ اور خراج لیتے تھے، جس سے وہ اپنا سامان ارزاں بیچنے پر مجبور ہو جاتے تھے اور اشیاء سستی ہو جاتی تھیں اور میں ذمی سے اتنا لیتا ہوں جتنا وہ آسانی سے ادا کر سکتا ہے، اب وہ جس قیمت پر چاہتا ہے اپنا سامان بیچتا ہے۔[1]

اسی سلسلہ میں ایک اور روایت بیان ہوئی ہے جس کی رو سے حضرت عمرؓ نے ایسے ذمیوں کی جو کمانے سے معذور ہوتے بیت المال سے مدد مقرر کر دی تھی۔ حضرت عمرؓ نے ایک اندھے بوڑھے بھکاری کو کسی دروازہ پر بھیک مانگتے دیکھا تو اس کے بازو پر ہاتھ مار کر پوچھا: تمہارا مذہب کیا ہے؟ اس نے کہا میں یہودی ہوں، حضرت عمرؓ نے دریافت کیا تم بھیک کیوں مانگتے ہو؟ اس نے کہا: میں بھیک سے جزیہ کی رقم اور اپنی معاش فراہم کرتا ہوں" حضرت عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے آئے اور گھر سے لا کر اس کو کچھ دیا، پھر بیت المال کے خزانچی کو بلایا اور کہا: اس کا اور اس جیسے معذوروں کا خیال رکھو، بخدا یہ انصاف نہیں کہ ہم اس کی جوانی کھائیں اور بڑھاپے میں اس کو لاچار چھوڑ دیں، پھر قرآن کی یہ آیت پڑھی: اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ، فقراء سے مراد مسلمان فقراء ہیں اور یہ اہل کتاب کے مساکین سے ہے۔" حضرت عمرؓ نے اس کا اور دیگر معذور ذمیوں کا جزیہ بھی معاف کر دیا۔[2]

(ب) مصنف نے ایک ضابطہ پیش کیا ہے جس کے مطابق جزیہ لگانے اور وصول کرنے

---

[1] کتاب الخراج ص ۱۳۲ [2] کتاب الخراج ص ۱۲۶

کی خلیفہ سے سفارش کی ہے، لکھتے ہیں: ۔ بڑے شہروں مثلاً کوفہ، بصرہ، بغداد، دمشق کے ذمیوں سے جزیہ وصول کرنے کا طریقہ میری رائے میں یہ ہونا چاہیے کہ خلیفہ ہر شہر میں ایک ایماندار، صالح شخص کو جس کی نیک نفسی اور تدین پر اس کو بھروسہ ہو، افسر جزیہ مقرر کرے اور اس کے ساتھ مددگار اسٹاف لگائے، یہ اسٹاف شہر کے سارے یہودیوں، عیسائیوں، مجوسیوں، صابئین اور سامرہ کو جمع کر کے اس کے پاس لائیں اور وہ ان سے حسب ذیل جزیہ وصول کرے

(۱) مالداروں سے اڑتالیس درہم (تقریباً ستائیس روپے) سالانہ، اس صنف میں خاص طور پر ایسے لوگ ہوں گے جیسے مہاجن، بزاز، جاگیردار، بڑے تاجر، حکیم ڈاکٹر۔

(۲) تجارت اور صنعت پیشہ لوگ، ان سے ان کی حیثیت اور آمد کے بموجب وصول کیا جائے، ان میں جو خوب کھاتے پیتے ہوں اُن سے اڑتالیس درہم اور جو متوسط درجہ کی آمدنی رکھتے ہوں ان سے چوبیس درہم لئے جائیں۔

(۳) دستکار مثلاً درزی، رنگ ساز، قصاب اور موچی، ان سے بارہ[۱۲] درہم سالانہ کی شرح سے جزیہ لیا جائے۔ رہا دیہاتی علاقہ تو وہاں میری رائے میں جزیہ وصول کرنے کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ آپ اپنے کلکٹروں کو حکم دیں کہ ایسے اشخاص کا اسٹاف مقرر کریں جن کی ایمانداری اور دینداری لائق اعتماد ہو یہ لوگ ہر گاؤں کے مالک سے ملیں اور کہیں کہ اپنے گاؤں کے ذمیوں کو جمع کرے اور جب سب جمع ہو جائیں تو ان سے مذکورہ شرح اور درجہ بندی کے مطابق جزیہ وصول کریں، اسٹاف کو سخت تاکید کر دیجئے کہ اس ضابطہ سے انحراف نہ کریں اور کوئی دوسرا طریقہ ہرگز ہرگز عمل میں نہ لائیں، کسی ذمی سے جو آپ کے خیال میں جزیہ دینے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو ایک پیسہ نہ لیں اور ظلم و ستم کا دل میں خیال تک نہ آنے دیں۔ اگر اگر گاؤں کا مالک کہے کہ مجھ سے میرے علاقہ کے ذمیوں کی طرف سے معاہدہ کر لیا جائے تو اس کی یہ خواہش پوری نہ کی جائے[۱]۔

---

[۱] کتاب الخراج ص۱۲۲

(ج) خراج یا لگان کا ٹھیکہ دینے کے موضوع پر :- میری رائے ہے کہ امیر المومنین
آپ نہ تو عراق نہ اسلامی حکومت کی کسی دوسری اراضی میں خراج کا ٹھیکہ دیں، کیوں کہ اگر
پیداوار کم ہوئی اور ٹھیکہ دار کو مقررہ رقم سے کم وصول ہوا تو وہ کاشتکاروں اور زمینداروں
پر ظلم کرے گا اور ان سے ٹھیکہ کی کل رقم وصول کرنے میں ظلم وستم اور ناجائز طریقوں سے کام
لے گا اور ظلم وستم کے معنی ہیں زراعت کی تباہی اور رعیت کی بربادی، ٹھیکہ دار کو اس
کی کیا پرواہ کہ رعیت یا زراعت تباہ ہو، اس کو تو اپنے ٹھیکہ کی سلامتی سے دل چسپی ہے،
اور اس بات کا بھی پورا احتمال ہے کہ وہ ٹھیکہ کی رقم سے زیادہ وصول کرے اور اس کے لئے
رعیت کے ساتھ زیادتیاں کرے، ان کو مارے، جلتی دھوپ میں کھڑا کرے، ان کی گردن
میں پتھر لٹکائے اور یہ تکلیفیں دے کر رعیت سے وہ روپیہ وصول کرے جو ان پر واجب
نہیں ہے اور اس طرح خدا کی زمین میں فساد برپا کرے جس سے خدا نے روکا ہے، خدا کا حکم
تو بس یہ ہے کہ رعیت سے اس قدر لیا جائے جو ان کی ضروریات سے بچ رہے، ان کی برداشت
سے زیادہ لینا بالکل حرام ہے۔

میں ٹھیکہ کی مخالفت اس اندیشہ سے کر رہا ہوں کہ کہیں ٹھیکہ داران سے اس روپیہ
کا مطالبہ کرے جو ان پر واجب نہیں ہے اور اس کے وصول کے لئے ان طریقوں کو برتے جن
کو میں نے اوپر ذکر کیا ہے، جس کے نتیجہ میں ایک طرف تو رعیت کو نقصان پہنچے اور دوسری
طرف تنگ آکر وہ زراعت چھوڑ دیں جس سے سرکاری آمدنی کم ہو جائے، جہاں فساد ہوگا
وہاں کوئی بھلائی نہ پنپے گی اور جہاں راستبازی کے جذبہ سے کام ہوگا وہاں ہر کوشش
پھلے پھولے گی۔

امیر المومنین خدا آپ کو سلامت رکھے، میری رائے میں آپ خراج کی وصولی کے لئے
ایسے حکام کا انتخاب کریں جو عوام کے خیر اندیش، دیندار اور ایمان دار ہوں اور ان میں سے

لے خراج ادا کرنے والے اکثر وبیشتر غیر مسلم تھے۔

آپ جس کو ان کا حاکم اعلیٰ مقرر کریں تو ضروری ہے کہ وہ مذکورہ صفات کے علاوہ فقیہ اور عالم دین بھی ہو، بے عیب سیرت کا حامل ہو، اصحاب رائے سے مشورہ کرنے میں اپنی ہتک نہ سمجھے، جس کی پاکبازی مسلم ہو، جو صحیح کام کرنے میں کسی ملامت سے نہ ڈرتا ہو، جو صحیح کام کرے تو صرف خدا کی خوشنودی کی خاطر اور اگر اس سے لغزش ہو تو خدا کی ناراضی کا خیال اس کے دل میں لرزش پیدا کردے، اگر شہادت دے تو اس کی شہادت مقبول ہو، اگر فیصلہ کرے تو اس کا فیصلہ بے لاگ ہو، کیونکہ آپ اس کو ایک سنگین خدمت یعنی مالگذاری کی تحصیل پر مامور کر رہے ہیں جس کا تقاضہ ہے کہ حلال ذریعہ سے مالگذاری لی جائے اور ناجائز طریقہ سے اجتناب کیا جائے، پس اگر ایسا حاکم عادل، ثقہ اور امین نہ ہوگا تو تحصیلِ زر کی نازک ذمہ داری میں اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

اربابِ حکومت کو میں نے دیکھا ہے کہ خراج کے حکام کے انتخاب میں احتیاط سے کام نہیں لیتے، کوئی شخص اگر ان کے دروازہ پر کچھ دن ڈٹا رہے تو اس کو گورنری جیسا سنگین عہدہ جس سے مسلمانوں کی زیست و موت اور خراج ان کے تصرف میں آجائے عطا کر دیتے ہیں اور شاید اس شخص کی ایمانداری اور سلامت روی کا پورا اطمینان کئے بغیر . . .

(د) خراج کے حاکم اعلیٰ کے ماتحتوں کے ساتھ طرز عمل کے بارے میں :-

جس شخص کو آپ گورنر یا حاکم اعلیٰ بنائیں اس کو تاکید کیجئے کہ اپنے ماتحتوں پر سختی سے پیش نہ آئے، ان کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھے، نہ ان کے ساتھ بے نیازی اور بے پرواہی کا برتاؤ رکھے، بلکہ ان کے سامنے نرمی کا لباس پہن کر آئے جس میں سختی اور پرہیز کے رنگ کی جھلک ہو، مگر یہ سختی اور پرہیز ظلم کی شکل اختیار نہ کرے، اور نہ ماتحتوں کو ایسے کام کرنے پر مجبور کیا جائے جن کے لئے وہ ملازم نہیں رکھے گئے ہیں۔ حاکم اعلیٰ کو یہ بھی تاکید کیجئے کہ وہ نکوکاروں کے ساتھ لطف سے پیش آئے اور بدکاروں کو قانون کے شکنجہ میں کسے، ذمیوں کے ساتھ انصاف کا سلوک کرے، اور مظلوم کا حق ظالم سے دلوائے، نیز یہ کہ مال گذاری

کی تحصیل اس ضابطہ کے مطابق کرے جو اس کو سرکار کی طرف سے دیا جائے، اور مال گذاری کا کوئی خود ایجاد طریقہ اہلِ خراج پر نہ آزمائے۔ اس بات کی بھی ہدایت کیجئے کہ اہلِ خراج سے اپنی مجلس میں جہاں تک بیٹھنے اور بات چیت کا تعلق ہے مساویانہ برتاؤ رکھے، تاکہ حق کے سامنے رشتہ دار، اجنبی، بڑے اور چھوٹے سب برابر رہیں۔ ۔ ۔ ۔

جس شخص کو آپ خراج کا حاکم اعلیٰ مقرر کریں اس کے ساتھ سپاہیوں کی ایک جماعت بھی رکھئے، یہ سپاہی رضاکار نہ ہوں بلکہ سرکاری ملازم، جنھوں نے آپ کی خیرخواہی کا حلف اٹھایا ہو، اور آپ کی خیرخواہی یہ ہے کہ آپ کی رعیت پر ظلم نہ ہو۔ یہ حکم کر دیجئے کہ ان سپاہیوں کو ماہ بماہ پابندی سے سرکاری خزانہ سے تنخواہ ملتی رہے اور خراج یا لگان کی مد سے ایک پیسہ بھی ان کو نہ دیا جائے۔ اہلِ خراج اگر کہیں کہ حاکم کی تنخواہ ہمارے ذمہ رکھی جائے تو ان کی یہ بات نہ مانی جائے اور تنخواہ کا بار ان پر نہ ڈالا جائے۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ گورنر اور حاکم خراج کے ساتھ مقربین کا ایک گروہ ہوتا ہے جو راستباز اور صالح نہیں ہوتے، جن سے یہ حاکم سرکاری کاموں میں مدد لیتے ہیں، یہ لوگ نہ تو سپرد کئے ہوئے کاموں کو ٹھیک ٹھیک انجام دیتے ہیں، اور نہ ان لوگوں کے ساتھ انصاف سے پیش آتے ہیں جن کے ذمہ سرکاری مالی مواخذات ہوتے ہیں۔ ان کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ خراج کے نام سے جو چاہتے ہیں لے لیتے ہیں اور رعیت کے مال سے جو چاہتے ہیں ہضم کر جاتے ہیں، مجھے معلوم ہوا ہے کہ اپنی مطلوبہ اشیاء کے حصول میں ظلم و ستم سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ حاکم اور اس کے مقربین جب کسی گاؤں کا دورہ کرتے ہیں تو وہاں کے باشندوں سے کھانے پینے کی ایسی چیزوں کا مطالبہ کرتے ہیں جو ان کی بساط سے باہر ہیں اور قانوناً ان پر عائد نہیں ہوتیں۔ مگر کسی نہ کسی طرح یہ چیزیں ان کو فراہم کرنا پڑتی ہیں، اس طرح غریب گاؤں والوں کی پیٹھ ٹوٹ جاتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ ہوتا ہے کہ حاکم مقربین میں سے کسی کو کاشتکار کے پاس خراج وصول

کرنے بھیجتا ہے اور کہتا ہے کہ میری طرف سے تم کو اجازت ہے کہ اتنی اتنی رقم وصول کرو، اور یہ رقم جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے واجب الادا لگان سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہ شخص کاشتکار کے پاس جاکر کہتا ہے: "مجھے میرا محنتانہ دو جو حاکم نے اتنا اتنا مقرر کر دیا ہے"۔ اگر وہ نہیں دیتا تو یہ مقرب اس کو مارتا ہے، ستاتا ہے، اس کی گائے بکری لے جاتا ہے، یا کسی کمزور لاچار کاشتکار پر ہاتھ صاف کرتا ہے اور اس وقت تک نہیں چھوڑتا جب تک مطلوبہ رقم وصول نہیں کر لیتا! ان حرکتوں سے رعیت تباہ ہوتی ہے، سرکاری آمدنی کم ہو جاتی ہے اور گناہ الگ ہوتا ہے۔

اس بات کی ہدایت بھی کر دیجئے کہ غلہ کٹنے کے بعد اس کے خرمن ہونے میں تاخیر نہ کی جائے، خرمن کرنے کا انتظام ہوتے ہی غلہ صفائی کے لئے کھلیان میں پہنچا دیا جائے اور اس معاملہ میں ایک دن کی دیر بھی روا نہ رکھی جائے، کیوں کہ اگر غلہ جلد از جلد کھلیان میں محفوظ نہ کر لیا جائے گا تو اس کو کاشتکار اور رہ گذر کھیتوں سے لے جائیں گے، نیز پرندے اور چوپائے کھا جائیں گے اور اس طرح خراج میں کمی واقع ہو گی۔ کھلیان میں پہنچتے ہی غلہ کی صفائی شروع کر دی جائے، صفائی میں ایک ماہ دو ماہ یا تین ماہ کی دیر نہ کی جائے کیوں کہ ایسا کرنے سے رعیت اور سرکار دونوں کو نقصان ہوگا اور اگلی تخم ریزی کے کام میں بھی دیر ہو جائے گی۔

کھلیان میں پڑے غلہ کی تقسیم اندازہ سے نہ کی جائے، ایسا کرنے سے احتمال ہے کہ سرکاری افسر اندازہ سے وصول کئے حصہ کو بعد میں کم بتائیں اور اس کی تلافی چاہیں، ایسا کرنے سے خراج اور رعیت دونوں کی بربادی ہے۔

حاکم خراج کے لئے مناسب نہیں، نہ ان کو حق ہے، کہ یہ کہہ کر کہ اہلِ خراج نے کچھ غلہ ضائع کر دیا، ان سے مقررہ مقدار سے زیادہ وصول کرے۔ عاملِ خراج کو چاہیئے کہ جب غلہ کھلیان میں صاف ہو جائے تو بلا تاخیر سرکار اور رعیت کے حصوں کی تقسیم کر لے، اور تقسیم کے وقت سرکار کا حصہ بڑے پیمانے اور رعیت کا حصہ چھوٹے پیمانہ سے نہ ناپے بلکہ سرکار اور

رعیت دونوں کے حصوں کی تقسیم ایک پیمانہ سے کی جائے۔

رعیت کے ذمہ نہ تو کلکٹر یا عاملِ خراج کی تنخواہ ہوگی، نہ پیمانہ کی اُجرت، نہ کلکٹر یا اس کے کارکنوں کی مہماں نوازی، نہ سرکاری غلہ کی ڈھلائی، نہ کسی وجہ سے غلہ کم ہونے کی صورت میں رعیت سے اس کی تلافی کرائی جائے گی، اسی طرح خراج کے رجسٹروں اور کاغذ کا خرچ اہلِ خراج کے ذمہ نہ ہوگا، نہ ناپنے والوں کی اُجرت، بھوسہ کی قیمت بھی اہلِ خراج کے ذمہ نہ ہوگی، بلکہ بھوسہ کو ناپ کر غلہ کے حصہ کے برابر سرکاری حصہ نکال لیا جائے گا یا سارا بھوسہ بیچ کر اس کی قیمت سے سرکاری حصہ منہا کر لیا جائے گا۔ اسی طرح خراج کی رقم سے وہ روپیہ جو "رواج دراہم" کے نام سے لیا جاتا ہے، لینا بھی ممنوع ہے، مجھے معلوم ہوا ہے جب کوئی کاشتکار لگان دینے آتا ہے تو سرکاری اہل کار لگان کا ایک حصہ "رواج دراہم" کے نام سے کم کر لیتے ہیں[۱]۔ خراج کی وصولی کے لئے ہرگز ہرگز کسی شخص کو پیٹا نہیں جائے گا، نہ اس کو ایک پیر پر کھڑا ہونے کی سزا دی جائے گی، مجھے معلوم ہوا ہے کہ سرکاری محصّل اہلِ خراج کو سزا کے طور پر جلتی دھوپ میں کھڑا کرتے ہیں، اور سخت مار مارتے ہیں، ان کی گردن سے بھری بوریاں لٹکا دیتے ہیں اور ان کو باندھ دیتے ہیں جس سے وہ نماز بھی ادا نہیں کر سکتے خدا اور اسلام کی نظر میں یہ سارے کام بُرے اور نفرت انگیز ہیں"۔

(۵) گورنروں اور کلکٹروں کی سیرت کی نگرانی کے لئے تحقیقاتی کمیٹی کے تقرر کی تجویز:-

"امیر المؤمنین میری رائے ہے کہ آپ راستباز اشخاص کی ایک جماعت جن کی راستبازی اور دین داری قابلِ اعتماد ہو، گورنروں اور کلکٹروں کے کام اور سیرت کی تحقیق کے لئے حکومت کے گوشہ گوشہ میں بھیجیں اور یہ جماعت معلوم کرے کہ ان حکام کی سیرت کیا ہے، رعیت کے فائدہ یا نقصان کے لئے انھوں نے کیا کام کئے ہیں، اور خراج کی وصولی میں ان ضابطوں کو برقرار رکھا ہے اور کس حد تک جو دربارِ خلافت سے مقرر کئے گئے ہیں۔ ان کی رپورٹ پر اگر یہ

---

[۱] کتاب الخراج صـ ۱۰۸-۱۰۹

بات پایہ ثبوت کو پہنچ جائے کہ انھوں نے سرکاری خراج کا کوئی حصہ اڑا لیا ہے تو ان کو بُری طرح پکڑا جائے، دردناک اور عبرت انگیز سزا کے بعد غبن کردہ خراج وصول کیا جائے، تاکہ ان کو سرکاری احکامات اور ضابطوں اور پالیسی کی خلاف ورزی کی آئندہ جرأت نہ ہو، کیوں کہ حاکم خراج رعیت پر جو ظلم و ستم کریں گے تو رعیت یہ سمجھے گی کہ ایسا سرکاری فرمان کے تحت ہے، حالانکہ سرکاری حکم نرمی و مہربانی کا ہے۔ اگر آپ ایک کج رو حاکم کو سخت سزا دیں گے تو دوسرے بدنیت حاکم ان سے عبرت پکڑیں گے اور غبن یا ظلم سے محترز رہیں گے۔

جب تحقیق سے آپ کو معلوم ہو جائے کہ کسی گورنر یا کلکٹر نے رعیت پر ظلم کیا ہے، یا ان کے مفاد کو نقصان پہنچایا ہے، یا خراج کا کوئی حصہ غبن کر لیا ہے یا ناجائز فوائد حاصل کئے ہیں یا ان کی چال ڈھال اور چال چلن خراب ہے تو آپ پر حرام ہے کہ ان کی ملازمت برقرار رکھیں یا رعیت کا کوئی کام ان کے سپرد کریں یا حکومت کا کوئی دوسرا عہدہ ان کو دیں، بلکہ ایسے حاکموں کو عبرت انگیز سزا دیجیے جس کو دیکھ کر دوسروں کو عبرت ہو اور وہ کج روی سے باز رہیں۔ امیر المومنین مظلوم کی بددعا سے بچیے، یہ اثر لائے بغیر نہیں رہتی۔

(و) مرکزی حکومت کے افسران اطلاعات کی سیرت اور انتخاب کے بارے میں:-

مجھے معلوم ہوا ہے کہ مرکز سے دور افتادہ صوبوں اور شہروں میں آپ کے افسران اطلاعات بڑی گڑبڑ کرتے ہیں اور گورنروں اور رعیت کے ضروری حالات لکھنے میں رعایت اور جانبداری سے کام لیتے ہیں، اکثر گورنروں سے مل جاتے ہیں اور ان کی رعیت کے ساتھ بدعنوانیوں کی خبریں چھپا جاتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اگر گورنر سے ناراض ہوتے ہیں تو ان کے بارے میں ایسی باتیں لکھ دیتے ہیں جو غلط اور بے بنیاد ہوتی ہیں۔ یہ ایسے امور ہیں جو آپ کی پوری توجہ اور نگرانی کے محتاج ہیں۔ آپ ہر شہر سے کچھ ثقہ اور منصف مزاج لوگ منتخب کرنے کا حکم دیجیے اور پھر ان لوگوں کو سرکاری اطلاعات کی افسری پر مقرر کیجیے، ان کی تنخواہ مرکزی خزانہ سے دی جائے اور تنخواہ نہایت معقول ہو۔ ان کو تاکید کر دیجیے کہ رعیت یا حاکموں کی کوئی خبر آپ سے مخفی نہ رکھیں اور کوئی بات بڑھا چڑھا کر نہ لکھیں۔ جو افسر اس حکم کی خلاف ورزی کرے اس کو سزا دیجیے۔

(باقی آئندہ)

(نقش تاریخ...)

البیرونی اور اصفہبذ جیلجیلان مرزبان بن رستم

از
(جناب مولانا ابو محفوظ الکریم صاحب معصومی استاذ شعبۂ عربی مدرسہ عالیہ کلکتہ)

(۳)

مرزبان اور خاندان کاکویہ بعض مغربی[1] محققین علاء الدولہ ابن کاکویہ کو مرزبان بن رستم بن شروین کا پسر زادہ قرار دیتے ہیں۔ یہ بات تاریخی مسلمہ ہے کہ ابن کاکویہ (م ۴۳۳ھ) کو سیدہ نے اصفہان کی ولایت پر متعین کیا تھا وہ ملکۂ رے کا قریبی رشتہ دار بھی تھا، عام تاریخی روایت یہ ہے کہ مجد الدولہ کا ماموں زاد بھائی ہونے کی بنا پر ابن کاکویہ کے لقب سے مشہور ہوا۔ دوسری طرف مجد الدولہ کے ماموں کا نام رستم بن مرزبان بتایا گیا ہے جس کے متعلق ظنِّ غالب یہی ہے کہ مرزبان بن رستم بن شروین کا فرزند تھا، ان دونوں روایتوں کے پیوند سے محققینِ مغرب نے یہ نتیجہ نکالا کہ ابن کاکویہ، دشمنزیار (یا دشمن زار جیسا کہ سکوں میں ہے) رستم بن مرزبان بن رستم بن شروین کا فرزند تھا گویا خاندانِ کاکویہ خانوادۂ باوندیہ کی ایک شاخ تھا۔

اس قول کی سند روضۃ الصفا کی عبارت اور ابن الاثیر کا یہ بیان[2] ہے کہ:

"وانما قیل لہ (ابن) کاکویہ لانہ ابن خال مجد الدولۃ ..... والخال بلغتھم کاکویہ"

---

[1] فرڈیننڈ یوستی: ایرانی اسمائی Iranisches Namenbuch صفحہ ۱۵۳ (نمبر ۲)، صفحہ ۱۹۷ (نمبر ۲۳) صفحہ ۱۹۷ (۲۳) ۱۸۹۵ء دی سلین: ترجمہ ابن خلکان: ج ۱ صفحہ ۴۳۵ حاشیہ رقم ۱۷، ڈاکٹر ریو: فہرست نسخ فارسیہ موزہ برطانیہ: صفحہ ۴۳۳ شمارہ: Or. 16, 830؛ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام: ج ۲ صفحہ ۶۶۷-۸، زامبور manuel 17 (208)

[2] روضۃ الصفا: ج ۴ صفحہ ۴۵ نول کشور ۱۹۱۳ء، ابن الاثیر: ج ۹ صفحہ ۳۳۸ ۱۸۶۳ء یورپ:

بوجوہِ ذیل ہمیں اس قول سے اختلاف کا حق حاصل ہے:

(۱) علاء الدولہ محمد بن دشمنزیار کا نسبی اتصال رستم بن مرزبان سے کسی صریح تاریخی بیان پر مبنی نہیں۔

(۲) اس بات کا تاریخی ثبوت موجود نہیں کہ رستم بن مرزبان کا لقب دشمن زار یا دشمنزیار تھا

(۳) ابن کاکویہ کی شخصیت اس عہد کی سیاسی تاریخ میں بے حد معروف رہی ہے اگر وہ آل باوند سے ہوتا تو اس خاندان سے بحث کرنے والے مؤرخین ضرور اس کا ذکر کرتے۔ یہ بات وہم و گمان میں نہیں آسکتی کہ اتنی شہرت و اہمیت کے باوجود مرعشی یا ابن اسفندیار آل باوند کے سلسلہ میں اس کا ذکر نہ کریں۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ علاء الدولہ دراصل مجد الدولہ کے بجائے سیدہ والدہ مجد الدولہ کے ماموں کا فرزند تھا اور اسی بناء پر ابن کاکویہ کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس خیال کی بنیاد ابن الاثیر کا ایک بیان ہے جس کو اہلِ مغرب بہ استثناء بریو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

"ھو ابو جعفر بن دشمنزیار و انما قیل لہ کاکویہ لانہ ابن خال والدۃ مجد الدولۃ ..... و کاکویہ ھو الخال بالفارسیۃ و کانت والدۃ مجد الدولۃ قد استعملتہ علی اصفہان"[1]

ابن الاثیر کا پہلا بیان (جو اس کی تاریخ میں دوسرا بیان ہے) ہمارے نزدیک سبقِ قلم یا ناسخین کے سہو پر مبنی ہے، بہ نسبت اضافہ کے کسی ایک لفظ کا سقوط کثیر الوقوع ہے ہمارے خیال کی تائید ابن خلدون سے ہوتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں[2] کہ: "وکان ..... ابن خال ھذہ المرأۃ"۔ ابن خلدون کی یہ صراحت خواہ ابن الاثیر کے علاوہ کسی اور ماخذ پر مبنی ہو یا اسی کی تاریخ الکامل سے ماخوذ ہو بہر نوع ہمارے دعوی کو ثابت کر دینے کے لئے کافی ہے۔ علاوہ بریں متداول تاریخی مصادر میں علاء الدولہ کا جہاں بھی ذکر آتا ہے زیادہ سے

---

[1] الکامل: ج ۹ صفحہ ۱۲۶ (یورپ)، [2] العبر: ج ۴ صفحہ ۷۴ (مصر)،

زیادہ اس کو دشمنزیار کا فرزند قرار دیا جاتا ہے اور اس سے اوپر کی ایک پشت کا بھی ذکر نہیں کیا جاتا۔ خود علاء الدولہ کے معاصر مثلاً ابو علی سینا اور مفضل بن سعد المافروخی[1] جب اس کا نام لیتے ہیں تو ابو جعفر محمد بن دشمنزیار کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ پس کسی قوی تاریخی سند کے بغیر دشمن زار کی اصلیت کے متعلق ہم اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ دیلم کے کسی سربرآوردہ خاندان کا رکن ہوگا جس سے آل باوند کی رشتہ داری قائم ہوئی۔ اور دشمنزیار سیدہ ملکۂ رے کا ماموں تھا اس کو باوندی اصل سے قرار دینے کے لئے کوئی ثبوت موجود نہیں۔

انتباہ | آل باوند کی تاریخ میں تشابہ اسمار کی وجہ سے بڑی دشواری پیش آتی ہے، اسی سلسلہ کا ایک قابلِ غور سوال یہ ہے کہ شہریار جس نے قابوس کی معیت میں رستم بن مرزبان مجد الدولہ کی فوجوں کو ہزیمت دے کر شہریار کوہ پر اپنی اصبہبذیت قائم کر لی تھی وہ شہریار بن شروین تھا یا شہریار بن دارا بن رستم بن شروین؟ تاریخ بن اسفندیار قسم الحاقی میں اس کو شہریار بن دارا لکھا ہے اور اس موقع پر عباس اقبال کا یہ حاشیہ[2] ہے کہ:

> "کسے کہ از جانب قابوس مامور شہریار کوہ شد بشہادت عتبی و ابن الاثیر شہریار بن شروین بودہ چنانکہ در صفحہ، نیز خوانندہ اے کہ با افزودن فصولے از تاریخ یمینی برایں کتاب بخیال خود آنرا کامل کردہ ہمیں شکل آوردہ۔ فقط سید ظہیر الدین (ص ۱۹۱) ایں شخص را شہریار بن دارا بن رستم بن شروین نامیدہ ست"

عتبی اور ابن الاثیر اس میں شک نہیں کہ شہریار بن شروین کا اس واقعہ[3] میں ذکر کرتے ہیں لیکن ۳۸۸ھ سے ۳۹۷ھ تک کے مسلسل وقائع میں خود عتبی کبھی شہریار بن رستم[4] اور کبھی شہریار[5] بلاتصریح

---

[1] دانش نامۂ علائی کے نسخے دیکھئے (فہرست برٹش میوزیم فارسی: ص ۴۳۳ شمارہ (Or. 16830) ؛ ۸۲ A ؛) بابت ۱۹۰۹ء (ص ۶۶۷) رسالۂ محاسن اصفہان" للمافروخی کے فارسی ترجمہ کی تلخیص، دانش نامہ مطبوع ہے،
[2] تاریخ طبرستان: ج ۲ ص ۲۵ (تہران) [3] یمینی: ص ۲۰۵ (سطر ۱۲)، المینی: ج ۲ ص ۳ [4] ایضاً: ص ۲۲۵ (دہلی) الاصبہبذ شہریار بن رستم۔ وج ۲ ص ۹ (مصر) [5] یمینی: ص ۲۲۰ (سطر ۵: "استظہر بشہریار") ص ۲۲۵ (سطر ۱۵: فلجأ الاصبہبذ شہریار الی سارية ج ۲ ص ۱۰ مصر) واقعات کے تسلسل سے ثابت ہوتا ہے کہ شہریار، شہریار بن رستم یا شہریار بن شروین سے ایک ہی شخص مراد ہے۔ اور کبھی اس کو صرف "اصبہبذ" کہا گیا ہے (دیکھو یمینی: ص ۲۰۹ سطر اول، ص ۲۱۲ سطر دوم ص ۲۲۶ سطر ۴، ص ۲۲۹ سطر ۵ ——— طبع دہلی ۱۸۴۷ء)

ولدیت لکھتا ہے اور بظاہر اس کی مراد ایک ہی شخص سے ہے پس اس دعوی کے ثبوت میں کہ قابوس کی جانب سے مامور شہریار کوہ پسر شروین تھا عتبی کا بیان ناکافی ہے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عتبی دراصل شہریار پسر دارا ابن رستم کا ذکر کبھی بشکل ابن رستم اور کبھی بہ شکل ابن شروین کرتا ہے۔ عتبی شہریار بن شروین یا کسی اور باوندی اصفہبذ کا ذکر مستقل عنوان اور مخصوص باب میں نہیں کرتا ہے کہ باوندیوں کے سلسلہ میں اس کے بیان کو اہمیت دی جاتی ابن الاثیر اسی کا خوشہ چین ہے اور اس کی ضخیم تاریخ آل باوند سے جس حد تک تعرض کرتی ہے معلوم ہے ایسی صورت میں مرعشی پر اعتماد کرنا مناسب ہے۔ یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ شہریار بن شروین (خال قابوس) کامل ۲۷ سال کی اصبہبذیت کے بعد اتنی مدت تک زندہ رہا ہو کہ ۳۸۸ھ میں قابوس کے ہمرکاب شہریار کوہ پر حملہ آور ہوتا اور زمام اصبہبذیت اپنے ہاتھ میں لیتا۔ حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ قابوس کی معاودت طبرستان کے زمانہ سے ۳۹۷ھ تک شہریار بن دارا کے سوا کوئی دوسرا شخص اصبہبذ شہریار کوہ نہ تھا، ۳۵۴ھ کے بعد طویل مدت تک شہریار بن شروین کا بقید حیات رہنا کسی مستند ذریعہ سے ثابت نہیں ہوتا۔ اور اس سے فردوسی کی ملاقات کا قصہ جس کو ہرمان ایتھے[1] (H. Ethe)، نولڈیکی (Nöldeke) اور علی الخصوص علامہ قزوینی[2] پر زور الفاظ میں بیان کرتے ہیں قابل اعتنا نہیں کہ خود اس واقعہ کا

---

[1] ZDMG ۱۸۹۴ء ج ص ۸۹-۹۴ نولڈیکی کی کتاب متعلقہ فقہ اللغہ ایرانی کا حوالہ چہار مقالہ کے حواشی میں دیکھو نیز ملاحظہ ہو Iranian National Epic (ص ۴۷)، [2] مقدمہ مرزبان نامہ (ق) ۔ طبع گب میموریل، حواشی چہار مقالہ: ص ۱۹۱، قزوینی ابن اسفندیار کی عبارت پیش کرتے ہیں اس عبارت کے لئے دیکھو تاریخ طبرستان (۲ ص ۲۱ تہران) ۔ عروضی کی اصل روایت کے لئے دیکھئے چہار مقالہ (۴۷-۵۱) نظامی کی روایت میں شہریار کے بجائے نسخوں میں "شیرزاد" یا "شہرزاد" مرقوم ہے، اور چہار مقالہ کے کسی نسخہ میں اس شہریار کی ولدیت کا ذکر نہیں اور نہ اس روایت کے مستند ناقلین کے یہاں اس کا سراغ ملتا ہے، آٹھویں صدی ہجری کا ایک مصنف جعفر بن محمد حسینی بظاہر عروضی ہی سے اس روایت کو نقل کرتا ہے لیکن سپہبذ تبرستان کے نام کے علاوہ اس کی ولدیت کا اظہار نہیں کرتا اس کی تاریخ جو بایسنغر بہادر کے نام پر لکھی گئی ہے اس کا ایک نسخہ مکتوبہ ۹۸۶ھ ہجری ہمارے پیش نظر ہے (برگ ۵۹ ب ذخیرہ شمارہ ۸ (فارسی) ذخیرہ سوسائٹی) اس نسخہ میں سپہبذ کا نام "شیرزادی" لکھا ہے۔ ابن اسفندیار کے الحاقی حصہ میں یہی روایت کچھ آمیزش کے ساتھ ملتی ہے اور قرینہ غالب ہے کہ ناقل نے عتبی کی تاریخ یمینی کی بنیاد پر عروضی کے شہریار کو شہریار بن شروین لکھ دیا ہے:

راوی نظامی عروضی اصبہبد شہریار (جس سے فردوسی کی ملاقات ہوئی) کی ولدیت ظاہر نہیں کرتا پس اس امر سے قطع نظر کہ فردوسی کا سفر طبرستان متکلم فیہ[1] مسئلہ ہے اگر واقعہ کی صحت قطعی طور پر ثابت بھی ہو جائے تو عروضی کی روایت کا شہریار کیا ضرور ہے کہ پسر شروین ہی ہو۔ وہ اصفہبد شہریار بن دارا بھی ہو سکتا ہے اس سے فردوسی کی ملاقات ۳۹۷ھ سے قبل ہوئی ہوگی

قائمہ آل باوند گذشتہ مباحث کو سمجھنے کے لئے باوندی سپہبدوں کی فہرست کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ مندرجہ ذیل فہرست کی ترتیب میں مرعشی پر خاص طور پر اعتماد کیا گیا ہے اس کے علاوہ قدیم وجدید ماخذوں[2] کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔

۱۔ باو بن شاپور بن کیوس	۱۵ سال	=	۴۵ھ ہجری
ولاش (قاتل باو)	۸ ”	=	۶۰ھ
۲۔ سرخاب بن باو	۳۰ ”	=	۶۸ھ
۳۔ مہرمردان بن سرخاب	۴۰ ”	=	۹۸ھ
۴۔ سرخاب بن مہرمردان	۲۰ ”	=	۱۳۸ھ
۵۔ شروین بن سرخاب	۲۵ ”	=	۱۵۸ھ

---

[1] دیکھو تنقید شعر العجم (ص ۱۲۴ ۔ ۱۹۴۲ء انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی)

[2] مرعشی: تاریخ طبرستان ورویان (ص ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۳۲۲، ۳۲۳) طبعۂ برنہارد دارن ۱۸۵۰ء (ب) مجمل مفصل (قلمی) تالیف ۱۰۶۵ھ از مرزا محمد رازی ابن محمد جمشید نسخہ ۱۱۰۰ھ (برگ ۱۹۵/ظ شمارہ ۳۴ ذخیرۂ سوسائٹی) (ج) تحفۃ الاخیار: از محمد صفی بن ولی قزوینی تالیف ۱۰۷۶ھ در قصبۂ مراد آباد ۔ ۔ ۔ ۔ ور ظل عاطفت نواب اصالت خاں (برگ ۱۹۸/ظ شمارہ ۵ ذخیرۂ کرزن) (د) حدیقۃ الصفا: از یوسف علی بن غلام علی خاں تالیف ۱۱۶۹ھ (برگ ۲۷۴ظ مجلد یکم، شمارہ ۵۴ ذخیرۂ سوسائٹی) ان نسخوں کی تفصیلات کے لئے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی فہرستیں ملاحظہ فرمائیں۔ (ہ) جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی ج ۱۲ ص ۱۲-۱۶ (۱۸۷۶ء (مضمون نگار منتخب التواریخ کا حوالہ دیتا ہے اس کے مؤلف کا نام نہیں بتاتا اور بدایونی کی مشہور تاریخ کو آل باوند سے تعلق نہیں) ۔ (و) مازندران واستراباد: ص ۱۳۵ ۱۹۲۶ء گب میموریل (ز) زامبور: انساب سلاطین اسلام، ص ۱۸۷ (رقم ۱۷۵) ۱۹۲۷ء، (ح) حبیب السیر: جزو چہارم جلد دوم ص ۴۲،

۶ - شہریار بن قارنؒ بن شروین	۲۸ سال	=	۱۸۳ھ
۷ - شاپورؒ بن شہریار (؟)			
۸ - جعفر بن شہریار	۱۲ سال	=	۲۱۱ھ
۹ - قارنؒ بن شہریار	۳۰ سال	=	۲۲۳ھ
۱۰ - رستم بن سرخاب بن قارن	۲۹ 〃	=	۲۵۳ھ
۱۱ - شروین بن رستم	۳۵ 〃	=	۲۸۲ھ
۱۲ - شہریار بن شروین	۳۷ 〃	=	۳۱۷ھ
۱۳ - رستم بن شروین (زیر بحث)	۱۴ 〃	=	۳۵۴ھ
۱۴ - دارا بن رستم بن شروین	۸ 〃	=	۳۶۸ھ
۱۵ - مرزبان بن رستم بن شروین (زیر بحث)	۱۲ 〃	=	۳۷۶ھ
۱۶ - رستم بن مرزبان (ابن رستم بن شروین)			
۱۷ - شہریار بنؒ دارا بن رستم	۹ 〃	=	۳۸۸ھ
رستم بن مرزبان (دوسری دفعہ)	۱۱ 〃	=	۳۹۷ھ تا ۴۰۷ھ ؟

لہ قارن پسر شروین باپ کی زندگی ہی میں فوت ہوا۔ مرعشی کی تصریح ہے: "و پسرش قارن پیش از شروین بگذشت اصفہبذ شہریار پسر زادۂ شروین بود کہ ہارون رشید از شروین نوا بستاند و بعد از شروین اصفہبذ شہریار بن قارن ملک الجبال بود" (ص ۲۰۰) ۔ ٹے شاپور کو مرعشی نے اصبہبذان آل باوند کی فہرست میں شمار نہیں کیا ہے، لیکن خود ہی اس کا ذکر بحیثیت اصبہبذ کیا ہے نیز مرعشی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شاپور پسر قارن بن شروین نہ تھا، اس کے الفاظ یہ ہیں: "و اصفہبذ شروین درگذشت از دو پسرے ماند یکے قارن کہ پدر شہریار است و ابن قارن قبل از پدر وفات یافت و یکے شاپور" (ص ۱۶۲) شاپور ایک مختصر مدت کے لئے اصبہبذ ہوا، رابینو "مازندران واسترآباد" میں جعفر کے مرنے کا سال ۲۵۰ھ =۸۶۴ء لکھتا ہے کہ آلِ باوند اب تک قدیم ایرانی مذہب پر قایم اور آداب و تہذیب میں آل ساسان کے صحیح معنوں میں وارث تھے ان تمام باتوں کے باوجود خالص عربی نام جعفر سے کسی باوندی کا موسوم ہونا عجیب بات ہے۔ سے پہلا باوندی جس نے اسلام قبول کیا قارن بن شہریار تھا مرعشی لکھتا ہے: "و اول در قبائل خود اسلام او قبول کرد و زنار از میاں بگسیخت" (ص ۲۰۵) یہ لوگ غالی شیعہ تھے جیسا کہ ان کے سکوں سے ظاہر ہے، نیز مرعشی لکھتا ہے: "و چوں اصفہبذان مازندران در اوائل کہ اسلام قبول کردند شیعہ بودند و با اولاد رسول علیہم السلام

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

خلاصہ | ہماری بحث کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱- بیرونی ۳۸۲ھ سے خوارزم سے باہر رہا بلکہ امیر ابونصر ابن عراق سے جب کتاب السموت کی ملاقات ہوائی ہے اس وقت بھی کہیں باہر تھا: اور کتاب السموت کی تالیف کا زمانہ خود بیرونی کے بیان کی روشنی میں ۳۸۳ھ کے قریب سمجھا جاسکتا ہے۔ بہرحال ۳۸۲ھ میں اس کا رے پہنچنا قوی قرینہ پر مبنی ہے۔

۲- اس زمانہ میں جبال طبرستان فرمانروائے رے فخرالدولہ بویہی کے زیر اثر رہے ہوں گے اصفہبذ مرزبان بن رستم باوندی سے بیرونی کا تعلق شاید رے یا جرجان میں پیدا ہوا لیکن امکان غالب اس امر کا ہے کہ خود بیرونی جبالِ طبرستان شہریار کوہ (فریم) کے علاقہ میں پہنچا اور ۳۸۳ھ سے ۳۸۷ھ تک مرزبان سے وابستہ رہا اور اس کے نام پر کتاب مقالید الہیئۃ تالیف کی

۳- ۳۸۷ھ کے اواخر سے رے جرجان اور بلاد جبل انقلابات سے دوچار ہوئے، قابوس اور شہریار بن دارا کی فوجوں سے مجدالدولہ اور رستم بن مرزبان کی متحدہ طاقت کا مقابلہ تھا، شعبان ۳۸۸ھ میں قابوس جرجان پہنچا اس مختصر زمانہ میں بیرونی یقیناً حدود رے و طبرستان میں رہا ہوگا اور یہی زمانہ ہے جس کی شکایت اس نے الاستیعاب میں کی ہے کس مپرسی کی حالت میں اس کا گذر کسی علم دوست رئیس کے یہاں ہوا جس کو اپنی کتاب میں الشیخ ایدہ اللہ کہتا ہے اسی کی فرمائش

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حسن اعتقاد داشتند سادات را دریں ملک مقام آساں تر بود" (ص ۲۶۸)
... مرعشی کی تاریخ میں شہریار بن دارا طبقہ اول باوندیہ کا آخری سپہبذ ہے اس کا نام مجمل مفصل (قلمی) میں "دارا بن دارا" اور حدیقۃ الصفا (ق) میں "اصفہبذ بن دارا" ہے حدیقہ کے مصنف نے قابوس بن وشمگیر ...قابوس اس کا ہمشیرہ زادہ قرار دیا ہے جو غلط ہے۔ ہمارے خیال میں "دارا بن دارا" اور "شہریار بن دارا" ایک ہی شخص ہے صاحب مجمل مفصل نے اسی کے یہاں فردوسی کا پہنچنا اور شاہنامہ پیش کرنے کا واقعہ لکھا ہے
پیش نظر قلمی مراجع میں مرزبان کا ذکر صرف مجمل مفصل میں ملتا ہے اسپہبذ شہریار بن شروین کے ذکر میں یہ الفاظ ہیں کہ: "وا دخال قابوس بن وشمگیر بود سی و ہفت سال بادشاہی نمود- مرزبان نامہ از تصانیف مرزبان بن اعمام اوست"

ــہ الاستیعاب: برگ اب نسخہ جمعیت آسیویہ شمارہ 1481/ ۵

پر کتاب الاستیعاب تالیف کی۔

۴۔ قابوس کی معاودت طبرستان کے ساتھ ہی بیرونی اس کے دربار میں پہنچا ہو کچھ قرینِ قیاس نہیں۔ ۳۸۸ھ کے بعد کسی طرح قابوس سے روشناس ہوا اور ۴۰۳ھ تک اسی کے دربار سے وابستہ رہا۔

دیباچۂ کتاب | شکل مغنی کے قصہ میں دیباچہ کا ماحصل پیش کر دیا گیا ہے لہذا اس کا ترجمہ غیر ضروری ہے ہاں بعض ضروری باتیں حاشیہ پر درج کر دی گئی ہیں۔

(۵ب) بسم اللہ الرحمن الرحیم وبہ استعین کتاب مقالید علم ما یحدث فی بسیط الکرۃ، عملہ ابو الریحان محمد بن احمد البیرونی، للاصفہبذ جیلجیلان فدرشوارجرشاہ ابی العباس مرزبان بن رستم بن شروین[1] مولی امیر المومنین،

جُبلت[2] القلوب علی حُبّ من احسن الیہا، والحب مجمل صاحبہ علی اظہار ما فی الضمیر وتقدیرہ عند المحبوب، فاذا اجتمع مع داعی المحبۃ الطبیعۃِ باعثُ شکرٍ علی صنائعَ وأیادٍ، فہنالک تحدث الخدمۃ الحقیقیۃ وتلزم العبودیۃ الراتبۃ الابدیۃ، ومثال ذلک ما اشربَ قلبی من خالص المحبۃ وصافی المودّۃ لمولانا الاصفہبذ الجلیل السید جیلجیلان ندشار[3] خرشاہ، عمّر اللہ العالم بامتداد مدتہ وحرس بہجۃ الایام بدوام قدرتہ وثبات دولتہ۔ قد انضاف ذلک[4] [الی] ترحیب بی، وتقریب لی، واکرام ایای روتوفر[5] علیّ) تفضلاً منہ وتبرعاً بالکرم، من غیر استحقاق و [لا]

---

[1] عنصر المعالی (ص ۶)، ابن اسفندیار (ص ۱۳۴)، مرعشی (ص ۲۰)، ہمائی (مقدمۂ تفہیم): "شروین" الآثار الباقیۃ (ص ۳۹) - "شروین"، "شرومن" - اصل (مقالید الہیئۃ): "شیرین"

[2] اصل: "حملب" غیر منقوط [3] اصل: "فدشار خرشاہ"

[4] اصل: قد انضاف ذلک ذلک ترحیب بی" [5] زیادہ بر ہامش۔

بسابقة[1] سلفت لی فی القیام بموجب خدمته فعلا، وان لم اخل منها نیة وقولا فاذا هو — ادام الله علوه — مالک رقی ما بقیت واین کنت، ولیس یحسن فی طریقة العقل الذی هو عیار جمیع الاشیاء نسیان شکر المولیٰ طرفة عین، لکنه یلزم العبد القیام به علی قدر الوسع والامکان، سواء طولب به اولم یطالب۔

ولما کان ذکر مولانا الاصفهبذ الجلیل السیّد — ادام الله دولته — اقرب الیّ من حبل الورید، ومنته الظاهرة اشمل علی من جلدی، وشکر صنائعه المتواترة الزم لی من ظلّی۔ وکان هو صفوة اولی الفضل من الانس، وحضرته معدن[2] العلم وینبوع الحکمة، ومجلسه العالی مجمع الأداب وملقح الالباب۔ لم احب ان اخدم فناءه الرحب بغیرها، وان کان نهری یُضِلُّ فی بحره، وما هدی من روائح العلم یصغر بازاء قدره۔ ولکن "الاعمال[3] بالنیات" وکل یعمّل[4] علی شاکلته۔ فاثبتُّ لخزانته المعمورة قصّة مبدء الشکل الکریّ الذی (۱۷۶/ ظ) یُستغنی بلوازمه عن الشکل القطاع الذی لا غناء عنه فی علم الهیئة والیٰ شریف همته وسابغ فضله وحرمته[5] الملجأ فی بسط عذری وتمهیده، وتشریفی بقبوله وتأمله۔ والله اسئل قبل وبعد ان یبقینی فی ظله ویعیننی علی خدمته بمنه وطوله۔

مبدءُ[6] الکتاب: اقول ان الدوائر العظام اذا تقاطعت علی السطوح الکریّة، وحدث منها الاشکال مختلفة، ففی کرة السماء تتشکل منها المیول

---

[1] اصل: "من غیر استحقاق وبسابقة" [2] اصل: "للعلم" [3] ... [4] ... [5] اصل: "حرسه" [6] اصل: "مبد"

والعروض وسعة المشارق واختلاف المطالع وفسق الایام واللیالی
والارتفاعات والانحطاطات والسموت ومطالعها، ومقادیر الزوایا المختلفة
باختلاف تقاطع هذه الدوائر ولیس الی معرفة اقدار بعضها من بعض
واستخراج المجهول من المعلوم منها سبیل الا بتحصیل النسب التی
بین جیوبها، والمرجع فی ذلک الی شکلٍ یلقب بالقطاع[1] - وهو من قسیّ
عظامٍ علی بسیط الکرة، متقاطعةٍ قد خرج کل اثنین منها من نقطة غیر
الاخری - وقد ذکره بطلمیوس فی النوع الثانی عشر من المقالة الاولیٰ من
کتاب المجسطی[2]، ووجد ایضاً فی کتاب الکریات[3] لمانالاوس وهو اقدم منه
بزمانٍ -

والنسب الواقعة فی هذا القطاع تتألف من نسبتین تعطیها ستة
مقادیر، نسبة اثنین منها نسبة آخرین، مثناة بنسبة الآخرین الباقیین
وزاد فی شرحه وتتبع العمل فی اقسامه ابو العباس الفضل بن حاتم النیریزی[4]

[1] بالضم وتخفیف الطاء - کشاف اصطلاحات الفنون: ص ۱۲۰۱ (کلکتہ)۔ [2] دیکھو تاریخ الحکماء للقفطی ص ۹۶-۹۷ (یورپ)۔ نیز دیکھو sarton: Introduction. vol. I, 274. [3] اس کتاب کے مقالہ ثالثہ میں "شکل قطاع" کی تفصیل ملتی ہے (طوسی: تحریر کتاب مالاناوس فی الاشکال الکریة) مالاناوس کی کتاب کو ابن عراق نے اپنی تحقیق و اصلاح کے ساتھ مرتب کیا تھا ابو عبداللہ محمد بن عیسی الماہانی اور ابو الفضل احمد بن ابی سعد الهروی وغیرہ نے بھی اپنی ترتیب و اصلاح کے ساتھ اس کے نسخے مدون کئے تھے آخر میں نصیر الدین طوسی نے جملہ اہم نسخوں کو پیش نظر رکھ کر اپنا نسخہ مرتب کیا جس کا نام تحریر کتاب مالاناوس فی الاشکال الکریة ہے - طوسی نے ابن عراق کے نسخہ سے بہت فائدہ اٹھایا اور اس کی تعریف کی ہے، الماہانی اور الهروی کے مرتبہ نسخوں کے باوجود اس کے الفاظ یہ ہیں کہ: "فبقیت متحیراً فی ایضاح بعض مسائل الکتاب سنین الی عثرت علی اصلاح الامیر ابی نصر منصور ابن عراق رحمہ اللہ فاتضح لی منہ معرفة ما کنت متوقفاً فیه"، ابن عراق کے نسخہ کی خصوصیات کو اس نے اپنے نسخہ میں محفوظ رکھا ہے - طوسی کے نسخہ کے لئے دیکھو: sarton: Int. vol. I, 253-54, vol. II. 1003 (17)
[4] اصل: "التبریزی" - بالتاء، ابن حاتم کے ترجمہ میں قفطی کی تصریح ہے: "ونیریز احدی بلاد فارس وتشتبه بتبریز" - (ص ۲۵۴ یورپ)، الفہرست ص ۳۸۹ (مصر) چہار مقالہ: ص ۱۹۷

وابو جعفر محمد بن الحسين الخازن، في شرح كل واحد منهما الكتاب المجسطي، ولخصه
ايضا ابو جعفر الخازن في زيج الصفائح[1]، وابو نصر منصور بن علي بن عراق في
كتاب تهذيب[2] التعاليم - وافرد ثابت[3] بن قرة كتاباً في النسبة المؤلفة واقسامها
واستعمالها، وله كتاب آخر في الشكل القطاع وتسهيل العمل عليه - وكثير من
المحدثين كابن البغدادي[4] وسليمن[5] بن عصمة وابي سعيد احمد[6] بن [١٧٦ ب]
محمد بن عبد الجليل السجزي وغيرهم خاضوا في هذا المغنى، واعتنوا به اذ
كان العمدة في علم الهيئة، حتى لولاه لما توصلوا الى الوقوف على شئ مما
ذكرناه وعليه كانوا يعملون، واياه يستعملون وبه يأخذون، الى ان طال الامد
وانتهت المدة الى زماننا هذا ذي العجائب والبدائع والغرائب، الجامع
بين الاضداد - أعني بذلك غزارة[7] ينابيع العلوم فيه، وتهيؤ أطبائع اهله
لقبول ما يكاد ان يكون الكمال والنهاية في كل علم، وانتشار الفضل فيهم
والقدرة على استنباط العجائب المعجزة جلّ القدماء، مع ظهور الخلاف فيهم
تضادّ ما ذكرناه وتناقضه من عموم التنافس والتحاسد اياهم واستحواذ

---

[1] الفہرست: ص ٢٩٣ (مصر)، القفطی: ص ٣٩٦ اس کتاب پر ابن عراق کے مؤاخذات ہیں امیر کا رسالہ دکن سے شائع ہو چکا ہے [2] ابن عراق کی ایک اہم تصنیف جس کے حوالے اس کے رسائل (دیکھو: مطالع السمت: ص ٢، ص ٦، جدول التقویم: ص ۵۵) اور بیرونی کی کتاب الاستیعاب میں ملتے ہیں۔

[3] ؟

[4] ابو عبداللہ الحسن بن محمد، ابن البغدادی کا ایک رسالہ دکن سے شائع ہو چکا ہے۔ [5] الاستیعاب میں اس کا پورا نام "ابو داؤد سلیمن بن عصمہ السمرقندی" آیا ہے (بحث "عمل الصفیحۃ الکسوفیہ") [6] حواشی چہار مقالہ: ص ١٩٩ - ٢٠٢، الاستیعاب میں اس کے اختراعات وایجادات کا بکثرت ذکر آتا ہے اس نے عضد الدولہ کے لئے جو اسطرلاب بنایا تھا اس کی خصوصیت کا بیان بیرونی نے کیا ہے اسطرلاب شمالی وجنوبی کے قوانین مزج میں اس کی ایک تالیف تھی جس سے البیرونی نے استفادہ کیا ہے اسطرلاب مسرطن، صلیبی، لولبی، رصدی اور الزورقی کی ایجاد اسی نے کی تھی الزورقی کی خصوصیت کے لئے دیکھو ("البیرونی" از سید حسن برنی ص ٢١٠ - ١١ وجلال ہمائی: کتاب التفہیم ص ٢٩٧ حاشیہ ٢) سجزی کا ایک رسالہ "شکل قطاع" پر دکن سے شائع ہوا ہے۔

[7] اصل: "غزارۃ" غیر منقوط،

التنازع والتعاند عليهم، حتى يعين بعضهم على بعض ويفتخر بما ليس له، ويسلب بعضهم بعضا علمه، وينسبه الى نفسه متكسّبًا به، ويكلّف الناس التعاني على فعله، بل يصرف عنان قوته الغضبية الى من فطن بمحاله، وينطوى على عداوته وبغضائه -

كما وقع بين جماعة من افاضل عصرنا فى "تسبيع الدائرة" وفى "تثليث الزاوية" بالسواء وفى "تضعيف المكعب" وغير ذلك، وكما وقع بين طائفة من العلماء فى شكلٍ قريب المتناول، سهل المأخذ والعمل نائب عن الشكل القطاع فى اغراضه، وقائم مقامه فى انتاج اعماله -

وانا لتجردى عن العصبية والاصرار فى الباطل والتسامح بالعجز والاقرار بالفضيلة لصاحبها، ومعرفتى بحقه، وميلى الى توفيرى عليه، اريد ان اسوق ماعندى من كيفية حالهم وحديثهم، لئلا يتصور عند مولانا الاصفهبد الجليل السيّد جيلجيلان — ادام الله علوه — اذا وقف على اعمالهم، خلاف ما وجدتهم ثم احكى الشكل وبراهينه عليه ثم كيفية استعماله بعد ذلك بعون الله وحسن توفيقه -

قصة هذا الشكل وما لكل واحد من العلماء عليه وفيه -

قد كان اجتمع عند ابى سعيد احمد بن محمد بن عبد الجليل [۱۷۷/ظ] عدّة طرقٍ لفضلاء المهندسين واصحاب الزيجات فى استخراج سمت القبلة بالحساب والتقادير المساحى بالات مختلفة النتائج عديمة البرهان - واعلمته ان مولاى ذا مصطفى ابا نصر منصور بن على بن عراق — ايده الله — شديد[1] القوة على استخراج براهين امثالها من الحسبانات،

---

[1] اصل - کرم خورده: "... دید"

بعید الغور فیها، سریع الادراک لها۔ فسألنی مطالبته بتأملها وإزاحة[1] العلة في تحقیقها والکشف عن دواعي أصحابها إلیها۔ ففعلتُ وعمل أبو نصر في ذلک السؤال کتاباً وسمه بالسموت[2] وأودعه المطلوبَ منه، واستنبط في مواضع من ذلک الکتاب لوازم هذا الشکل من غیر قصدٍ منه له إلا لما احتاج إلیه۔

واتَّصَلَ بأبي الوفاء محمد بن محمد[3] البوزجاني خبرُ هذا الشکل وکانتبني في معناه، فأنفذته إلیه وهو یومئذ بمدینة السلام وورد[4] (جوابه) ناطقاً باستحسانه الکتاب، واستعظامه إیاه لولا أن صاحبه سلک فیه طریقَ القدماء في استعمالهم "الشکل القطاع" و"النسبة المؤلفة"۔ فإن له طرقاً خفیةً في معرفة السمت، أوجز من ذلک وأحسن۔

وعرضتُ ما قاله علی أبي نصر فزعم أنه إنما فعل ذلک لمحبتهٖ اقتفاءَ آثار المتقدمین ولحاجته إلی "الشکل القطاع" عند إقامة البرهان علی أعمال غیره، فإنهم کانوا استخرجوها به، علی أن ما ذکره أبو الوفاء هو سهل ومن مال إلیه فسیکفي المؤنة من شکلین في کتاب السموت[5] رفع موضعهما وکیفیة إزاحة العلة منهما ولم یکتف بذلک دون أن أنشأ رسالةً حینئذٍ إلی بیّن فیها هذا الشکل والعمل به۔

ثم أنفذ إليّ أبو الوفاء بعد ما مضی سنةٌ علی ذلک سبع مقالات من کتاب عمله وسماه "مجسطي أبو الوفاء[6]" وقد أورد فیه هذا الشکل ببرهانٍ قریبٍ، واستعمله في جمیع أمور الهیئة في مجسطیه ذلک، ولما وقفتُ منها علی ما

---

[1] اصل: "ازاحه" غیر منقوط، [2] "سمت" کی جمع ہے، قرآنی رسم الخط کے مطابق "سماء" کی جمع "سماوات" قرار دینا صحیح نہیں جیسا کہ بعض اہل علم سمجھتے ہیں۔ دیکھو "البیرونی": ص۱۲۳ طبع دوم، اور نثیل کالج میگزین۔ ص۳ سطر ۱۱، ۱۲ — فروری و مئی ۱۹۵۳ء) [3] الفہرست: ص۳۹۴ (مصر) القفطی ص۲۸۷ تتمہ صوان الحکمہ (ص۷۶، حواشی ص۱۹۴) [4] اصل: "جوابا" [5] اصل: کذا

وقفتُ واعترفت من عجزها ابه تقويت استخرجت البرهان عليه بطريق
ليس بالبعيد على ما تصور الخطوط الواقعة فی حرف الكرة - وقريب من
[۱۷۷ ب] طرق استعاله ما سأورده فی هذا الكتاب -

ثم حللتُ بلد الری بعد ذلك، ولقيت ابا محمود حامد بن خضر الخجندی[1]
واخرج الیّ كتابا عمله فی اعمال الليل بالكواكب الثابتة واورد فی اوايله هذا
الشكل ببرهانٍ آخر، وفصلٍ طوّل معه وسمّاه "قانون الهيئة" وبنى عليه جميع
ما تقصده فی ذلك الكتاب -

ثم لقيتُ ابا الحسن كوشيار بن لبان الجيلی[2] فی عمل كتاب قدّم
الشكل فی مباديه على مثل ما ذكره ابو محمود، وسماه "المغنی" يعنی به عن
شكل القطاع، واستخرج به نسبة اكثر ما يشتمل عليه المقالة الثانية من
كتاب "المجسطی" ميلا منه الی تخفيف العمل، اذ ليس يستعمل فی هذا الشكل
الا نسبة واحدة بسيطة غير مؤلفة، ولا مقادير اكثر من اربعة، وليس
يخفی فضل سهولة التصور، وخفة العمل بالابسط عليها بالمركب المؤلف۔

فاما ابو نصر فلاحاطتی بجل احواله العلمية ومشاهدتی اياها منه تعاطی
القسم الرياضی، وقيامی بتحصيل ما هو حاصلٌ فی خزانته من الكتب واملائه
على جميع ما يستخرجه ويستنبطه، وتبرؤه عن ادّعاء ما لغيره لنفسه،
واضافته بين المتنازعين فی ذلك ومسامحته تبرعًا بالانتساب الی
علماء يقتصرون عن مرتبته من غير ان تلمذ لاحدهم، ومع غزارة

---

[1] دیکھو "البیرونی"، صـ ۱۲ (حاشیہ) بیرونی عمل السموت کے باب میں خجندی کے مخصوص طریقہ کو پسند کرتا ہے (الدرر فی سطح الاكر نسخہ بوڈلین: برگ ۷ ب، شمارہ)

[2] تتمہ صوان الحكمة: صـ ۸۳، حواشی چہار مقالہ (صـ ۲۰۲) ابن اسفندیار (صـ ۸۳ انگریزی)

علم وتنبیہ وذکاء فہم وعجیب نطنۃ، طبع علیہ، لست اتہمہ باخذ ہذا الشکل من غیرہ بل لا استجیز لبالی ان یخطی ذلک بہ لما تدمتہ من جہتہ، ولانہ اجاب بذلک وقت المطالبۃ ایاہ بہ والحاجۃ الیہ۔

فاما ابو الوفاء فلم اشہد ولم اثق من اصابتہ علی مثل ما وقفت علیہ لغیرہ، لکنی التعجب منہ حیث رأی فی "کتاب السموت" شکلین یؤدیان الی ما فاخر بہ خاصۃ، فتعامی عنہما وتصامم، فلئن کان افتخارہ بالشکل المذکور، فلقد عاین مثلہ لغیرہ بین یدیہ متصرحًا فی اولہ انہ یمکن معرفۃ ما ذکر من الکریات، فی احد طرق سمت القبلۃ بغیر النسب التی تتألف فی "الشکل القطاع"، وفی اخرہ انہ قد انتج فی ذلک طریق [۸۰/۱] فی معرفۃ المیول والمطالع سوی الذی اتی بہ بطلمیوس بالشکل القطاع۔ ولئن کان الافتخار بما ذکرنا طریقہ فی سمت القبلۃ، فما اتی بشیٔ بدیع غیر ما فی زیج حبش[1] الحاسب بعینہ، لم یزد علیہ الا تقسیم العمل اقساما (مرتبۃ[2]) فی عدۃ فصول، ولم یغیر سوی العبارۃ عن "الطول المعدل" بتعدیل الطول، وعن "العرض المعدل" بتعدیل العرض، علی انہ مشکور علی اجتہادہ وسعیہ، ولست التجنی علیہ الا الذی لم یلق بفضلہ وتقدمہ من الصلف الکاذب، فقبیح بہ جدا ان یفاخر من اخترع فی سمت القبلۃ ما اخترع فی کتاب السموت۔

فاما ابو محمد[3] فقد ذکر انہ السابق الیہ وان ابا الوفاء اخذہ عنہ ان کان ذکرہ، ومن لی بعلم الحقیقۃ، مع اختلاف تراتیبہما علی ما سأحکیہ

---

[1] احمد بن عبداللہ البغدادی، المامون ومعتصم کا معاصر۔ دیکھو الفہرست: ص۲۸۴، القفطی ص۱۷۰ وغیرہ

[2] کرم خوردہ [3] کذا۔ والصواب "ابو محمود"

منهما، وقد شاهد بعضهما بعضا، وكل واحد منهما متحاز[1] الى الجملة المتعدّ[2] مع صاحبتها والامر فى السبق[3] لكليهما ممكن۔

فاما كوشيار، فقد اعترف عند حضور ابى محمود لديه ان ليس له منه الا التهذيب والايجاز والتنقيح۔

فهذه حقايق ما عندى من اخبارهم فى ذلك، فنعود الآن الى انجاز الوعد، واقدم قبل ذلك من مقدماته ما ستحتاج اليه فيما بعد

متفرقات اس دیباچہ کی اہمیت کے سلسلہ میں ہم ان قیمتی جملوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو البیرونی کے قلم سے اپنے معاصر فضلار کے کمال فن اور ان کے بعض ناپسندیدہ اطوار کے متعلق قیدِ تحریر میں آگئے ہیں، نیز استاذ ابن عراق اور اپنے تعلقات کے بارہ میں اس نے جو کچھ لکھا ہے اس کی افادیت سے بیرونی اور ابن عراق سے دل چسپی رکھنے والوں کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ابن عراق سے بیرونی کا تلمذ ناقابل انکار حقیقت ہے لیکن اس حقیقت کو دیباچہ کتاب المقالید کی عبارت جیسی جلا دیتی ہے، شاید الآثار الباقیہ[4]، فہرست تالیفات، اور بیرونی کے دوسرے متداول نوشتوں سے اس پر ویسی روشنی نہیں پڑتی۔ اس کے علاوہ ابن عراق کے اندازِ طبیعت کے بیان میں یہ اطلاع نہایت وقیع ہے کہ وہ اپنے مرتبہ سے فروتر اشخاص سے محض تواضع و انکسار کی بنار پر تلمذ کی نسبت ظاہر کر دیتا تھا۔ ابن عراق کے متعلق جو یہ رائے قایم کر لی گئی ہے[5] کہ اس کو ابو الوفار البوزجانی سے تلمذ تھا، مذکورہ اطلاع کی روشنی میں اس رائے پر نظر ثانی کرنا ضروری ہے ابن عراق نے صرف ایک جگہ بوزجانی کو اپنا شیخ لکھا ہے اسے ہم واقعیت پر محمول کرنے کے بجائے ابن عراق کے حسنِ خلق و تواضع پر محمول کرنا قرینِ صواب سمجھتے ہیں۔

---

[1] اصل: "منحاز"، [2] اصل: "المتعادہ"، غیر منقوط [3] اصل: "السبق"

[4] الآثار الباقیہ: ص۱۸۴ (زخاؤ)۔ معجم الادبار ج ۱۷/ ۱۸۷ (مصر): قال عراق قد غزوني بد ... هم: ومنصور منهم قد تولى غرا سيا۔ مقدمہ آثار باقیہ (زخاؤ)۔ ×××× ۷/۱۱ [5] زین العابدین موسوی: مقدمہ رسائل ابن عراق: ص ، ڈاکٹر محمد شفیع و پروفیسر محمد فضل الدین قریشی: اورینٹل کالج میگزین بابت فروری و مئی ۵۳ء۔

آلِ باوندا وران کی حکومت کے مرکز کے متعلق حدود العالم کا یہ بیان ہے کہ[1] "کوہ قارن کا ضلع دس ہزار سے زیادہ قریوں پر مشتمل تھا یہاں کا فرمانروا "سپہبذ شہریار کوہ" کہلاتا تھا اسلامی عہد کے آغاز سے یہاں کی حکومت باؔو کے خاندان میں رہی۔ اس ضلع کا صدر مقام "پرّیم" (فرّیم) ہے لیکن سپہبذوں کی قیام گاہ شہری آبادی سے نصف فرسنگ کی دوری پر لشکر گاہ میں ہے۔"

حدود العالم کا بیان مقامی لوگوں کے رسوم و اطوار کے متعلق نہایت دلچسپ ہے۔ فریم کی نشان دہی سب سے پہلے اصطخری کے یہاں ملتی ہے یاقوت نے اس کا بیان نقل کر دیا ہے[2] اور اس کے ضبط میں "بکسر اولہ وثانیہ" لکھا ہے۔ احمد بن علی المنینی بظاہر کسی قدیم مأخذ کی بنا پر اس کا ضبط اس طرح کرتا ہے[3] "الفاء فیہ مکسورۃ وبعدھا راء مھملۃ مشددۃ مکسورۃ ثم یاء مثناۃ من تحت" یال کسنودا کی تحقیق فریم، کوہ قارن و کوہ شہریار کے متعلق بہت مفید اور دلچسپ ہے[4]، حدود العالم کے بیان سے صاف طور پر مترشح ہے کہ شہریار کوہ کا اطلاق کوہ قارن پر ہوتا تھا، شہریار کوہ عام طور پر بیائے مثناۃ تحتانی مذکور ہے لیکن المنینی اسے بالباء ضبط کرتا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں "وصحح بالباء الموحدۃ وسمی عندھم شہر باس کوہ"

اصفہبذ مرزبان بن رستم کے نام کے ساتھ جو القاب آئے ہیں ان کی تفصیل دلچسپی سے خالی نہیں ہے لہذا بعض باتیں درج ذیل ہیں:

الاصفھبذ = اسپہبد، سپہبد (فارسی) تبرستان و مازندران کے فرمانرواؤں کا خاص لقب تھا مسعودی عہد ساسانی کے پانچ اہم مرتبوں کی تشریح میں اصبہبذ کو تیسرے درجہ میں رکھتا ہے اس کے الفاظ ہیں: والثالث الاصبھبذ وھو امیر الامراء الخ[5] "ابن اسفندیار

---

[1] ترجمہ (انگریزی): ۳۶ - ۱۳۵ گب میموریل، [2] الاصطخری: ص ۲۰۵-۰۶ دخویہ ۱۸۷۰ء، یاقوت ۳۰/۴۹۰ ووستنفیلد، [3] شرح الیمینی: ج ۲ ص ۳۹۱، ص ۳ (مصر) [4] البیرونی: آثار باقیہ: ص ۱۰۱، مسعودی: التنبیہ والاشراف: ص ۹۱ (الصادی مصر)، تاریخ تبرستان: ج ۱/ ص ۴۲-۱۴۱

طبرستان کے صرف دو فرمانروا خانوادوں آل باوند اور قارنوند (آل وشمگیر بن زیار) کے لئے اس لقب کو مخصوص بتاتا ہے[1]۔

جیلجیلان = گیل گیلان، طبرستان، جیلان اور پدشوارجر کے حکمراں کا قدیم لقب ہے ان علاقوں کے مجموعہ پر جس کی حکومت ہوتی وہ جیلجیلان خراسان" بھی کہلاتا تھا محمد بن عبد الملک کے اشعار[2] اس لقب پر شاہد ہیں:

فقد خضب الفیل کعادته لجیل جیلان خراسان
والفیل لا تخضب اعضاؤه الا لذی شان من الشان

فدشوارجرشاہ: البیرونی آثار باقیہ میں آل باوند کے القاب میں "الفرشوارجر شاھیہ" کا ذکر کرتا ہے، عربی و فارسی مراجع میں اس لفظ کی مختلف شکلیں ملتی ہیں - ابن خردادبہ کے یہاں "بدشوارگر" نامہ تنسر میں "فدشوارگر"، مجمل التاریخ میں "فدشواسرگر" اور مرعشی و ابن اسفندیار کی تاریخوں میں "فرشوادگر"، کتاب المقالید کے منقولہ دیباچہ میں "فدسرشوارجر" اور "فدشاسرخر"۔ لفظ کی اصل اردشیر بزرگر کی تحقیق میں پاتشواسرشا = پاتشواسرکساہے، مشرقی تبرستان کا جنوبی حصہ جس میں سوادکوہ، ہزار جریب، فیروزکوہ اور دماوند شامل ہیں "فدشواسرگر" کہلاتا تھا[3]۔ عربی کا "جر" یا "کر" پہلوی زبان کا "گر" ہے بقول بیرونی پہلوی میں "گر" کے معنی کوہ کے ہیں کیومرث کا لقب "گرشاہ" اور بعض روایات[4] میں "کلشاہ"

---

[1] البیرونی: آثار باقیہ: ص۱۰۱، مسعودی: التنبیہ والاشراف: ص۹۱ (الصاوی مصر)، تاریخ تبرستان ج ا/ ص۲۲-۱۴۱ [2] ابن خردادبہ: المسالک والممالک ص۱۱۹ لائیڈن ۱۸۸۹ء [3] ایضاً: ص۱۷ (لائیڈن) مرعشی ص۱۹، ص۳۱، ص۴۲ (پطربورغ ۱۸۵۰ء)، ابن اسفندیار: ص۱۴، ص۱۲۶ (انگریزی ترجمہ) ژورنال الیشیاتک (مارچ واپریل ۱۸۹۴ء) ص۲۰۰ - ص۲۵۰، ص۵۰۴، اردشیر بزرگر: تاریخ تبرستان (مجلد یکم): ص۱۲۸، ص۱۲۷، ص۹۳، ص۳۳۰ [4] آثار باقیہ ص۹۹، ص۱۰۳، ص۲۳۳ (زخاؤ): مسعودی: التنبیہ والاشراف: ص۸۶، ص۱۶۸ مصر)، حمزہ اصفہانی: ص۱۳، ۱۹ (کاویانی، برلن)،

تھا، ابن اسفندیار اور مرعشی کی تاریخوں میں اس کے بجائے "فرشاہ" آتا ہے۔ گشتاسب اور اس کے خاندان کے فرمانروا "گرشاہ" کہلاتے تھے یہ خاندان تبرستان کے جنوبی کوہستان پر حکمراں تھا۔ اردشیر کے مقرر کردہ القاب میں "بدشوار گرشاہ" کا لقب بھی آتا ہے نوشیران کبھی جنوبی تبرستان کا والی تھا اور اس کا لقب "فدشخوار گرشاہ" تھا حمزہ اصفہانی کا بیان ہے کہ اس کو "نیقر میجان گرشاہ" کا لقب ملا تھا، آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد نے اپنی آفاق گردی کے زمانہ میں گیل گاوبارہ کو "جیلجیلان فرشواد جرشاہ" کا لقب دیا تھا، اسلامی عہد میں ان القاب کے ساتھ "مولی امیرالمومنین" کا لقب بڑھایا گیا چنانچہ مامون نے قارن بن وندادکو اسلام کی ترغیب دی اور "مولی امیرالمومنین" کے لقب کی پیش کش کی تھی بعد میں اس کے لڑکے مازیار نے اسلام قبول کر کے یہ لقب حاصل کر لیا تھا، مازیار کو کچھ قوت حاصل ہو گئی تو اس لقب میں ترمیم کر کے اپنے نام کے ساتھ "موالی امیرالمومنین" لکھنے لگا، یعقوبی کتاب البلدان میں لکھتا ہے کہ یہی مازیار عباسی خلفار مامون و معتصم کو جب خطوط بھیجتا تو اپنے نام کے ساتھ "جیل جیلان اصفہبذ خراسان" کے القاب لکھتا تھا، نیز تاریخ یعقوبی کے الفاظ یہ ہیں کہ: فلما اعظم امرہ کتب ـــ من جیلجیلان اصبھبذ اصبھبذان بشواخرشاد محمد بن قارن مولی امیرالمومنین ثم ذھب بنفسہ ان یقول موالی امیرالمومنین۔

کتاب المقالید کے ساتھ مجموعہ میں طوسی کے مرتبہ و تہذیب دادہ رسائل ہیں ان میں سے تحریر المعطیات لاقلیدس، تجرید المناظر، تحریر کتاب المفروضات لثابت بن قرہ، تحریر کتاب ماخوذات ارشمیدس اور الکرہ والاسطوانہ لارشمیدس (مجموعہ: برگ ۱ب - ۷۹ ب) حیدرآباد سے رسائلِ طوسی کے سلسلۂ اولی و ثانیہ کے ضمن میں شائع ہو چکے ہیں۔

لہ سنی ملوک الارض: صلا ۳۶ (کادیانی سنہ ۱۳۱۳ھ) لہ مرعشی: صلا ۴۲، ابن اسفندیار (صلا ۹۷ ترجمہ)

لہ ابن اسفندیار (صلا ۱۴۶، صلا ۱۴۷ ترجمہ) یعقوبی البلدان (ص ۲۷۶ - ۲۷۷ طبع دخویہ ۱۸۹۲ء) ایضاً: تاریخ (ج ۲ ص ۵۸۲ طبع ہوتسما ۱۸۸۳ء)

چھٹا رسالہ "مقالہ ارشمیدس فی تکسیر الدائرہ" (مجموعہ: برگ ۸۰/ظ - ۱۰۵/ظ) اور اس کے بعد طوسی کی اہم تالیف کتاب الشکل القطاع ہے (برگ ۱۰۵ اب - ۱۴۷ اب) پیش نظر مضمون میں اسی نسخہ کی بنا پر الشکل القطاع کے حوالے دیئے گئے ہیں۔[1] کتاب المقالید (برگ ۱۷۵ اب) سے شروع ہوتی ہے اور (برگ ۲۲۱ ب) پر اچانک ختم ہو جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں صرف آخری ورق ضائع ہوا ہے اور خاتمہ کتاب کی بحث چند سطروں کے لئے ناقص رہ گئی ہے۔ واللہ اعلم

ہم اس مضمون کی ترتیب کے سلسلہ میں برادر محترم ڈاکٹر محمد صغیر حسن معصومی استاذ شعبہ عربی ڈھاکہ یونیورسٹی کے بے حد ممنون ہیں کہ آپ نے ہمارے استفادہ کے لئے بال کسنوواکے فرنچ مضمون کے ترجمہ کی زحمت گوارا فرمائی اور اپنے گرامی قدر دوست پروفیسر ک، م، ماسٹرا کی عنایات سے بھی سبکدوش نہیں ہو سکتے کہ بروکلمان کے سمجھنے میں ان کی معاونت حاصل رہی۔

---

[1] یہ نسخے حیدر آباد کے مطبوعہ متون کی نسبت اہم زیادات رکھتے ہیں مثلاً نسخۂ تحریر المعطیات کے آخر میں ایک طویل استدراک موجود ہے جس سے مطبوعہ نسخہ خالی ہے اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں: "دعوی شکل سد من المعطیات، وجدتہ فی نسخۃ بنقل قد نجر من خط الا" ق (کذا) وراق حسین" الخ

"شبنم شاداب"

نشر داده کتابستان الہ آباد پر ایک نظر

(جناب ڈاکٹر محمد احمد صدیقی - ایم - اے - ڈی - فل الہ آباد یونیورسٹی)

ادبیات فارسی کا ذوق رکھنے والوں میں کون ایسا انسان ہے جس نے مشہور و معروف کتاب "شبنم شاداب" مصنفہ ظہیر اے تفرشی کا نام نہیں سنا اس کے مصنف گیارہویں صدی کے وہ نامور فارسی ادیب ہیں جو نثر نویسی میں گوناگوں لفظی و معنوی صنائع اور نادر و دل کش تشبیہات اور مسحور کرنے والے استعارات کے استعمال کی وجہ سے بالیقین اپنے معاصرین پر سبقت لے گئے ہیں اور جو باغ عباس دبا د جدید کی رنگین اور پر رونق توصیف کی وجہ سے اپنا نظیر نہیں رکھتے ان کی یہ گراں قدر و بے بہا کتاب اگرچہ اہل ایران میں کسی قدر گم نام بلکہ بے نشان ہے مگر ہندوستان نے جو اس کی قدر و منزلت کی اس کا اندازہ صرف اسی سے ہو سکتا ہے کہ ہندوستانی ادبا اس کو اس وقت سے اب تک اعلیٰ ترین نثر کی تصنیف میں شمار کرتے اور فارسی کے اعلیٰ طبقوں میں داخل نصاب کرتے آئے ہیں یہ امر شاہان ہند کی بے تعصبی اور علم دوستی کا ایک بیّن اور کھلا ہوا ثبوت ہے کہ انھوں نے شبنم شاداب جیسی بلند پایہ کتاب کو نظر انداز نہیں کیا اور اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا یہاں تک کہ بقول پروفیسر نعیم الرحمٰن صاحب مرحوم "عالموں اور ادیبوں نے بھی اس کو چشم و چراغ بنایا اس پر تیل چڑھا کر اپنے نصاب تعلیم میں داخل کیا، حقیقت تو یہ ہے کہ یہ اہل ایران کا تغافل ہے کہ انھوں نے اس بیش بہا موتی کی قدر نہ کی اور اس کو ضائع کر دیا" یہ کتاب جتنی بلند پایہ اور قابل اعتنا تھی اتنا ہی اس کی طباعت خراب و غلط اور اہل مطابع کی عدم التفات کا شکار ہو گئی حواشی و تعلیقات اگرچہ بہت سہی مگر پھر بھی تشنہ کاماں زبان فارسی کی تشنگی باقی تھی انھیں تشنہ کاماں کی تشنگی دور کرنے کے لئے پروفیسر نعیم الرحمٰن صاحب مرحوم نے اس کی طرف

خاص توجہ مبذول کی اور نہ صرف طباعت کی غلطیوں کو دور کرکے کتاب کی تصحیح کی بلکہ جدید حواشی وافیہ اور تعلیقات کافیہ و وضاحت تلمیحات مشہورہ سے اس کتاب کو مزین کرکے از سر نو مرتب کیا جس کو کتابستان الہ آباد نے شائع کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پروفیسر موصوف ان چند مستند افاضل میں سے ہیں جن کا وجود اہلِ علم و فضل کے لئے ہمیشہ قابل فخر اور مایہ ناز رہے گا ان کی خداداد علمی قابلیت اور فطری ذہانت اور مختلف تصانیف نے ان کو آسمانِ علم پر آفتاب بنا کر چمکا دیا ہے، مرحوم کا شمار بالیقین ان خوش قسمت اساتذہ میں کیا جا سکتا ہے جنھوں نے دورانِ حیات ہی میں معاصرین سے وہی قدر و منزلت اور دادِ تحسین حاصل کر لی ہے جس کے حقیقت میں وہ مستحق ہیں، اس کتاب میں پروفیسر موصوف کی محنت اور علمی قابلیت قابلِ داد اور لائق دید ہے، نہایت خوش اسلوبی سے الفاظ مشکلہ کی تشریح اور پیچیدہ مضامین کی گتھیاں سلجھائی ہیں لیکن مجھے چند مقامات کے مطالب و حواشی سے پروفیسر مرحوم کی رای سے اتفاق نہیں اس لئے بصد عجز و انکسار اپنی رائے کو ظاہر کرنا چاہتا ہوں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس سے اظہار قابلیت اصلاً مقصود نہیں کیوں کہ میں تو خود ہی اپنی ہیچمدانی اور بے بضاعتی کا معترف ہوں اور نہ یہ تبصرہ پروفیسر مرحوم کی فضیلتِ علمی کی منقصت ہے، معاذ اللہ اس لئے کہ پروفیسر مرحوم کا تبحر علاوہ دیگر عربی انگریزی زبانوں کے فارسی زبان میں خصوصیت کے ساتھ مسلم ہے جو ان کے علمی کارناموں سے روز روشن کی طرح نمایاں ہے، اول تو ایسے مخزنِ علم و فضل سے لغزش تقریباً بعید ہے لیکن اگر بالفرض محال ایسے متبحر عالم فارسی سے بھی کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو میرے نزدیک ہرگز محلِ حیرت و استعجاب نہیں کیوں کہ بشر سے لغزش فطرت کے مطابق ہے، بڑے بڑے اہلِ کمال بھی اس سے نہ بچ سکے، کون ہے جو مدعی کمال ہے، کیا خوب کہا ہے

من ذا الذی ماساء قط　　　ومن لہ الحسنیٰ فقط

اما تری المحبوب والمکروہ　　　لززانی نمط

سچ تو یہ ہے کہ کمال صرف وحدہٗ لاشریک لہ ہی کو سزاوار ہے، علامہ جاحظ نے

کیا خوب کہا ہے۔ "انفرد اللہ عزوجل بالکمال ولم یبرئ احدا من النقصان" لہذا اگر ایسے صاحب علم حضرات سے بتقاضائے بشریت لغزش ہو گئی اور اس کو ظاہر بھی کر دیا گیا تو بھی ہرگز ان کی تنقیص نہیں بلکہ عین دلیلِ کمال ہے جیسا کہ مثل مشہور ہے "الکامل من عدت ھفواتہ" یا جیسا کہ کہا گیا ہے "کفی المرء نبلا ان تعد معایبہ" اس لئے کہ اس سے صاف نمایاں ہوتا ہے کہ ان حضرات سے لغزش اتنی کم ہوتی ہیں کہ انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں جبکہ جاتے کہ ہم جیسے لوگوں کی غلطیاں کہ لاتعد ولاتحصی، دوسری وجہ اظہارِ رائے کی یہ بھی ہے کہ ایسے صاحب علم وفضل کی تحریر کی طرف لوگ تنقیدی نظر نہیں ڈالتے بلکہ تحقیق کی جگہ تقلید اور عقل کی جگہ نقل سے کام لیتے ہیں اس لئے کہ ان کا علم مسلم ہوتا ہے اور اگر بتقاضائے بشریت لغزش ہو گئی تو وہ باقی رہ جاتی ہے بلکہ اکثر طلبہ کی ترقی علم میں سدِّ راہ بن جاتی ہے کیوں کہ ہر شخص بغیر غور وفکر کے اس کو صحیح مان لیتا ہے اس وجہ سے طلبہ کے نفع کے خیال سے بھی اظہارِ رائے ضروری سمجھتا ہوں، بدقسمتی سے پروفیسر صاحب مرحوم کی حیات میں مجھے اس کا موقع نہ مل سکا اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا موصوف ہی اس کتاب کا درس دیا کرتے تھے ان کے انتقال کے بعد مجھے اس کتاب کے پڑھانے کا موقع ملا دو تین بار پڑھانے کے بعد بعض مقامات میں اختلافِ رائے کا احساس ہوا افسوس کہ اس وقت مولانا موصوف بقیدِ حیات نہیں ورنہ ان سے براہ راست استشارہ کر کے رفعِ شکوک کر لیتا اور اس تبصرہ کی ضرورت نہ ہوتی مگر اب میں نے اپنا فرض منصبی سمجھا کہ اس اختلافِ رائے کو اہلِ علم کے سامنے پیش کروں تاکہ طلبہ واساتذہ کے لئے جو عدیم الفرصتی یا عدم توجہی کے سبب سے تحقیقِ مطالب وتصحیحِ اغلاط کی طرف اعتنا نہیں کرتے اور انھیں شروح وحواشی پر اکتفا کرتے ہیں یہی لغزشیں جو میرے نزدیک باقتضائے بشریت پروفیسر صاحب موصوف سے اس کتاب کے مطالب وحواشی کے تحت میں رونما ہو گئی ہیں ان کے علمی تحقیق میں سدِّ راہ نہ ہو۔ کیوں کہ انھیں متوسطین کو اس کی ضرورت ہے ورنہ اہلِ علم حضرات تو بیک نظر صحت وسقم وصحیح وغلط کو پرکھ لیتے ہیں۔ ذیل کے سطور میں صرف ان مقامات سے مجھ کو بحث کرنا ہے جن سے مجھ کو مولانا موصوف سے اختلاف ہے اور حوالہ کے لئے شبنم شاداب شائع کردہ کتابستان الہ آباد کو سامنے رکھتا ہوں۔

۱۔ صفحہ ۱۲ سے صفحہ ۲۴ تک یہ عبارت ہے :۔

"اعیانِ تختگاہِ چمن ز وضیع و شریف دارالسلطنتِ گلشن (گلشن اور از کے درمیان لکیر ہونا چاہیے) از اربابِ عمایم نارون، و اصحابِ قلوبِ صنوبر، و مجذوب سالکانِ بید مجنون، و قلمزنانِ بید سرخ، و دیوان گرانِ گل صد برگ، تار عنا قدانِ شمشاد، و ز غولہ مویان مشکین کاکل بنفشہ و سنبل، و بازاریانِ لالہ و ریحان، و رعایائے سبزہ و سہ برگہ (سہ برگہ اور بکاسیانی کے درمیان لکیر ہونا چاہیے) بکاسیانی دیدار ولی نعمتِ نوبہار، بند قبا در بند قبا و کلاہ بر کلاہ استادہ، و بشکر مساعی جمیلہ ملک پروری و معدلت گستری دستورِ معظم و وزیرِ اعظم نفسِ نباتی، کہ حسب الحکم اعلیٰ در نظم و نسق ممالک و نشو و نما از رتق و فتقِ صحو و غیم، و حل و عقدِ شگوفہ و ثمر، و انتظامِ مداخل و مخارج از امطار و ازہار، و تعمیر مرز بوم ہر زمین، و توفیر کشت و کار دہاقین —— مآثر فراواں و آثار نمایاں بر روی عرصۂ روزگار بظہور رسانیدہ، و بر طبق رضای حضرتِ والا در ترفیہ حال برایا —— (برایا اور از کے درمیان لکیر ہونا چاہیے)، از نضارت بخشی گلِ جعفری، و طراوت افزای لالہ عباسی، و نہال کردنِ نغزدارانِ خستہ دل، و از خاک برداشتنِ بے برگ و نوایانِ یاد در گل، با ضعفاءِ سبزہ و اقویاءِ شاخسار از وفورِ حسنِ خلق بیک نسبت برآمدن، و با شناو بیگانہ تر و خشک بفیضِ وسعتِ مشرب بریک و تیرہ سر کردن —— (کردن اور کار کے درمیان لکیر ہونا چاہیے) کار از دائرہ طوق بشری در گذرانیدہ،

ہمگنان از خلوص جنان متفق اللفظ والبیان استدعائے خلود این خلافت کبریٰ و دوام دولت عظمیٰ را سر سوی آسمان بر کردہ" (اس کے بعد اسی صفحہ کے نیچے یہاں سے پڑھئے :۔
"اس سلسلہ میں ص۵۶ حواشی الخ

اس سلسلہ میں ص۵۶ حواشی کے تحت میں پروفیسر صاحب تحریر فرماتے ہیں "اعیان تختگاہ ... گذرانیدہ" یہ سب ایک فقرہ ہے ۔ اعیان ..... چمن اور وضیع ..... گلشن فاعل ہیں اور استادہ، رسانیدہ و در گذرانیدہ (جو بالترتیب ان تینوں جملوں کے آخر میں آئے ہیں) ان کے فعل ہیں ۔

پروفیسر صاحب کا اعیان ۔ چمن ۔ وضیع ۔ گلشن کو استادہ کا فاعل قرار دینا تو صحیح ہے مگر انھیں اعیان ..... گلشن کو رسانیدہ و در گذرانیدہ کا بھی فاعل قرار دینا صحیح نہیں ہے بلکہ یہاں پر میرے خیال میں لغزش ہو گئی ہے کیوں کہ رسانیدہ اور در گذرانیدہ کا فاعل نفس نباتی ہے اور یہ دونوں فقرے در گذرانیدہ تک اس کی صفت ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وزیر اعظم نفس نباتی کے شکریہ ادا کرنے کے لئے جس نے بحکم شہنشاہ نوبہار نشو و نما کے ممالک کے نظم و نسق میں بہت سی خوبیاں عرصہ روزگار پر ظاہر کی ہیں [جس کی تفصیل "از رتق و فتق سے لیکر ..... کار دہاقین" تک ہے] اور جس نے حضرت والا شہنشاہ نوبہار کی رضامندی کے مطابق رعایا کی آسائش میں ایسے نمایاں کام کئے ہیں کہ انسانی طاقت سے باہر ہیں [جس کی تفصیل "از نضارت بخشی سے لے کر ..... سر کردن" تک ہے] مگر ابھی "بہ شکر مساعی جمیلہ" کا متعلق فعل نہیں آیا ہے اس بہ شکر مساعی جمیلہ کا "ہمگنان

ص۲۴ " والے جملے سے یوں تعلق ہے کہ " دربہ شکر مساعی جمیلہ " ملک پروری ز معدلت گستری دستور معظم وزیر اعظم نفس نباتی ہمگنان از خلوص جنان متفق اللفظ والبیان استدعائے خلود این خلافت کبریٰ ودوام دولت عظمیٰ را سر سوی آسمان برکردہ ، مطلب یہ کہ ارباب عمایم واصحاب قلوب وغیرہم [نفس نباتی نام کے وزیر اعظم کے شکر اور قدر دانی کرتے ہوئے سب کے سب سر اٹھائے ہوئے اس خلافت کبری و دولت عظمی کے خلود کی دعا کر رہے ہیں لہذا رسانیدہ و گذرانیدہ کا فاعل اعیان . . . . . " وغیرہ کو قرار دینا صحیح نہیں ہے اور اسی لغزش کی وجہ سے ہمگنان والے جملہ ص۲۴ کو بمساعی جمیلہ ص۲۳ والے جملہ سے الگ کرکے نیا پیرا پروفیسر صاحب نے لکھنا شروع کیا ہے جو مناسب نہیں - حاصل یہ ہے کہ فقرہ " کہ حسب الحکم اعلیٰ در نظم ونسق ممالک نشو ونما کہ عبارت است از رتق وفتق وغیرہ الی بہ طور رسانیدہ " اور دوسرا فقرہ در گذرانیدہ تک نفس نباتی کی صفت ہیں (حرف " از " کہ ما قبل رتق وفتق واقع شدہ برائے تفسیر نظم ونسق است ") اور عبارت را بشکر مساعی جمیلہ ص۲۳ الخ جو کہ اس فقرہ کے پہلے ہے وہ عبارت ہمگنان متفق اللفظ والبیان ص۲۴ سے متعلق ہے بس ظاہر ہو گیا کہ رسانیدہ اور گذرانیدہ کا فاعل نفس نباتی ہے جیسا " کہ " [جو لفظ " نفس نباتی " کے بعد ہے] صاف ظاہر کر رہا ہے اور ان کا فاعل اعیان . . . . . وغیرہ نہیں ہے جیسا کہ پروفیسر صاحب نے تحریر فرمایا ہے نیز یہ بھی معلوم ہو کہ

(۲) " ہمگناں . . . . . سے لے کر . . . . . سر کردہ " کو الگ کرکے نیا پیرا سے لکھنا (جیسا کہ پروفیسر نے کیا ہے) بھی درست نہیں بلکہ اس کو " بہ شکر مساعی جمیلہ ص۲۳ کے ساتھ ملا کر لکھنا پڑھنا چاہئے کیوں کہ اس کا فاعل بھی اعیان . . . . . وغیرہ ہے باشارہ ہمگناں = یہ لغزش بھی صرف اس وجہ سے ہوئی کہ پروفیسر صاحب رسانیدہ اور درگذرانیدہ کا فاعل اعیان وغیرہ کو قرار دے گئے ہیں

(۳) اسی جگہ ایک بات اور قابل غور ہے کہ لفظ جناں ص۲۴ کو پروفیسر صاحب نے کتاب میں بفتح جیم ثبت کیا ہے یہ بالکل صحیح ہے مگر پروفیسر صاحب نے فرہنگ کے تحت میں ص۲ میں یوں لکھا ہے جناں (ج - مکسور) جنت کی جمع ہے باغ - جنت " میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہ غلط ہے مگر یہاں شبنم شاداب میں جس لفظ کے لئے یہ معنی پروفیسر صاحب نے لکھے ہیں ضرور نامناسب ہے یہاں باغ کے معنی نہیں بلکہ دل کے معنی ہیں اغلب ہے کہ پروفیسر صاحب موصوف یہ بتلانا چاہتے تھے کہ ج مکسور ہو تو جنت بمعنی باغ کی جمع ہے اور اگر ج مفتوح ہو جو یہاں ہے تو واحد ہے اور اس کے معنی دل کے ہیں واللہ اعلم بالصواب "

(۴) ص۲۳ میں " مرزبوم " لکھا ہے حالانکہ مرز بوم کے درمیان " واؤ " بھی ہونا چاہئے مرز یعنی جتی ہوئی زمین اور بوم یعنی بغیر جتی ہوئی زمین جیسے کہ اگلے جملے میں کشت وکار کا تقابل بھی بیچ میں " واو " کو چاہتا ہے پھر دو جداگانہ قسم کی زمین کے ذکر میں واو عطف ضروری بھی ہے اور جیسا کہ حاشیہ لکھنے میں پروفیسر صاحب نے بھی لکھے ہیں اور مرزبوم بغیر واو کے دوسرے معنی میں مستعمل ہے جو یہاں مراد نہیں (غالباً نظر انداز ہو گیا ہے)

(۵) ص۱۵ میں یوں تحریر ہے " در گلشن عوائق شقایق بہ جائے ترنج جعفری غنچہ . . . .

کوتاہ کردہ" یہاں گلشن کے نون پر کسرۂ اضافت دیا گیا ہے غالبًا یہ کسرۂ اضافت کتابت کی غلطی ہے اور میرے نزدیک صحیح نہیں بغیر اضافت کے ہونا چاہئے مطلب یہ ہے کہ باغ کے اندر عوائق شقائق (یعنی زنانِ مصر) نے غنچۂ جعفری کے لیمو کی جگہ پر انگلیوں یعنی پتیوں کو کاٹ ڈالا اور بایں طور نرگس یعنی (زلیخا) کے طعن نظر بازی کی بنیاد قطع کردی (یہاں حضرت یوسف اور زلیخا) کے یہاں زنانِ مصر کے قصہ کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح زلیخا پر عشقِ یوسف کی وجہ سے زنانِ مصر نے طعن و تشنیع کی تو انھوں نے سب عورتوں کو بلا کر لیمو اور دوسرے پھل کھانے کو دیئے چاقو بھی رکھ دیا وہ کاٹ کر کھا رہی تھیں کہ انھوں نے یوسف کو سب کے سامنے بلایا سبھوں نے حسنِ یوسف سے محوِ حیرت ہو کر لیمو کی جگہ اپنی اپنی انگلیاں کاٹ ڈالیں اور اس طرح زلیخا نے آیندہ طعن کرنے سے ان کی زبان بند کردی اسی طرح یہاں باغ میں وہ عوائق شقائق (زنانِ مصر) جو گلشن میں نرگس کو (گویا زلیخا کو) نظربازی سے روکتے تھے ان کے لئے نرگس (زلیخا) نے غنچۂ جعفری (لیمو) کو پیش کیا اور یوسف شیخ کو بھی سامنے لا کھڑا کیا نتیجہ یہ ہوا کہ عوائق شقائق نے اس یوسف شیخ کو دیکھ کر بجائے ترنج غنچۂ جعفری کے اپنی اپنی انگلیاں (یعنی پتیاں جو کٹی ہوئی ہوتی ہیں) کاٹ لیں۔ پس یہاں گلشن کے نون کو باضافت پڑھنا مناسب نہیں دوسری بات یہ کہ اگر عوائق کو عواتق پڑھا جائے بقولِ صہبائی تو زیادہ بہتر ہے عواتق جمع ہے عاتق کی اس کے معنی زنانِ باکرہ و ناکتخدا کے ہیں چونکہ زلیخا کو عشقِ یوسف سے روکنے والی عورتیں مصر کی زنانِ باکرہ تھیں اس وجہ سے شقائق کی صفت عواتق لطف کو دوبالا کر دیتی ہے۔

(۶) ص ۱۳ = "تعالے اللہ نزہتِ روضۂ بہشت بہجت طوبیٰ طراوت! کہ تا صیادِ آفتاب دامِ عالم گیر پرتو بر دوش گردِ ہندِ سوادِ امکان بر آمدہ بایں نقش و نگار طاؤسی در شبکہ شعاع نیفگندہ، و تا بو العجب متخیلہ، پردۂ خیال بازی اندیشہ در پیشِ چراغِ ضمیر کشیدہ بایں آرائش و آئیں با غنچۂ سلیمانی بنظرِ تماشائیانِ حواس در نیاوردہ، نسیم حدیث نظیرش بر گلِ نسترنِ گوشے نوزیدہ" اس سلسلہ میں مولانا موصوف حواشی ص ۳۹ میں لکھتے ہیں کہ "نیفگندہ اور نیاوردہ دونوں کے نفی مل کر اثبات کا فائدہ دیتے ہیں"۔ دو نفی مل کر اثبات کا فائدہ ضرور دیتے ہیں مگر اس وقت جب کہ ایک ہی جملہ میں دونوں نفی پائے جاتے ہیں جیسے اسی شبنم شاداب میں ص ۳ پر ہے "دایہ مہر سرشت زلف و کاکل نازنیناں گلشن را بر طرف عارض دل آرا بہ درستی نہ شکستہ کہ، بار بیگی نظر باز آفتاب رقیبان شب رو کواکب را سر ہم چشمی زیر سنگ زمیں نہ نہد"، جس کے معنی یہ ہیں کہ ازلی بہشت کے مہر سرشت دایہ نے نازنین گلشن کے زلف و کاکل کو ان کے عارضِ دل آرا کے کنارے اس طریقہ سے نہیں خم کیا (لٹکایا)، ہے کہ عاشق نظر باز آفتاب (اپنے رقیب رات کے چلنے والے ستاروں کو برابری کے خیال سے زیرِ زمیں نہ رکھے (سزا نہ دے) دیکھئے یہاں دونوں نفی چوں کہ ایک ہی جملہ میں واقع ہیں اور لازم و ملزوم و شرط و مشروط کی طرح ہیں لہٰذا اثبات کا فائدہ دے کر یوں معنی بتاتے ہیں کہ ازلی بہشت کے مہر سرشت دایہ نے گلشن کے نازنین کے عارضِ دل آرا پر زلف و کاکل کو اس طرح خوبصورتی سے لٹکایا ہے کہ نظر باز آفتاب نے اپنے

رقیب رات کے چلنے والے ستاروں کو برابری کے خیال سے زیر زمین کر دیا ہے (سزا دی ہے) بخلاف مانحن فیہ کے اس لئے کہ وہاں پر "تا صیاد ..... نیفگندہ" اور "دتا بو العجب ... بیاوردہ" ایک جملہ نہیں بلکہ دو الگ الگ جملے ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ اس وقت سے جب سے کہ صیاد آفتاب عالم گیر پرتو کا جال گردن پر رکھ کر سواد امکاں کے ہند کے گرد نکلا ہے (اس وقت سے آج تک) ایسے نقش ونگار کا کوئی طاؤس اپنے شعاع کے جال میں نہیں پھنسا سکا اور دوسرے جملے کے یہ معنی ہوں گے کہ اس وقت سے جب سے کہ قوت متخیلہ نے بازی اندیشہ سے پردہ خیال کو دل کے چراغ کے سامنے رکھا ہے اس آرائش وزیبائش کا کوئی بازیچہ سلیمانی تماشائیوں کے نظر کے سامنے نہیں لا سکا اور اس کے بعد "نسیم حدیث .... نوزیدہ" کو الگ کر دیا جائے گا۔ بعض لوگوں نے "نسیم حدیث ..... نوزیدہ" کو پہلے دونوں جملوں سے ملا کر پڑھنا پسند کیا ہے جس کے معنی یوں ہو جائیں گے کہ جب تک کہ صیاد آفتاب عالم گیر پرتو کا جال گردن پر رکھ کر سواد امکان کے ہند کے گرد نکل کر اس نقش ونگار کا کوئی طاؤس اُسے اپنے شعاع کے جال میں نہیں پھنسا سکا ..... اس باغ کے مثل کے گفتگو کا نسیم کسی کان کے نسترن کے پھول پر نہیں چلی یعنی جب تک کہ آفتاب نے اس قسم کے باغ کو اپنی شعاع میں پھانس نہیں لیا اس وقت تک اس کی خبر کسی کان تک نہ پہنچی۔ مگر اس دوسری صورت میں بھی "تا صیاد ... نیفگندہ اور "دتا بو العجب .... بیاوردہ" دونوں الگ الگ جملے ہوں گے اور دونوں نفی مل کر اثبات کا فائدہ ہرگز نہ دیں گے بلکہ "نیفگندہ" اور "نوزیدہ" مل کر اثبات کا فائدہ دیں گے واللہ اعلم بالصواب۔

(۷) ص۱۱ میں "جوی" "بارش" الگ الگ کر کے لکھا ہے اور درمیان میں یہ نشان بنایا ہے "،" حالانکہ جوی بارش ہونا چاہیے بغیر فصل کے اور الگ الگ بالفصل ہونے میں یقین ہے کہ لوگ "بارش" کو جداگانہ لفظ سمجھ کر اس کے کچھ معنی بھی قرار دیں اور غلطی میں پڑ جائیں۔

(۸) "ص۶ باقتضائے فصل از بیابان طینت زاہدان مرغ زار آب وگل رندان لالہ عشق بیشگی وسنبل شوریدہ مشربی وریحان شلائینی دمیدن سر کردہ واز خشک رود مشرب پیران جوں جوی یار طبع جواناں حباب نظر بازی طرب وفوارہ لہو ولعب جوشیدن آغاز نہادہ" ص۶ اس میں لفظ "مرغزار" کے پہلے لفظ "جوں" کا ہونا بہت ضروری معلوم ہوتا ہے جو غالباً نظر انداز ہو گیا ہے یعنی باقتضائے فصل زاہدوں کی طینت کے بیابان سے بھی رندوں کے آب وگل کے مرغزار کی طرح عشق بیشہ رکھنے والا لالہ اور شوریدہ مذہب سنبل اور شوخی کرنے والا ریحان اُگنا شروع ہو گیا یعنی فصل بہار کے اثر سے خشک طینت زاہدوں میں بھی رندوں کی طرح عشق ومستی پیدا ہو گئی ہے جیسے کہ اس کے بعد والا دوسرا جملہ (واز خشک ..... نہادہ) میں بھی لفظ چوں جوی بار طبع جواناں موجود ہے فقط واللہ اعلم بالصواب۔

ادبیات

غزل

(جناب آلم مظفر نگری)

ہوائے فصلِ گل ہی بن کے دیوانہ نہیں اُٹھی
کلی بھی لے کے اک رقصِ مستانہ نہیں اُٹھی

حرم اور دیر کی تمئیز ہے اب تک وہی باقی
نظر تیری جدھر ساقیٔ مے خانہ نہیں اُٹھی

کوئی جلوہ وہیں محفوظ ہے ذروں کے سینے میں
سرِ محفل جہاں سے خاکِ پروانہ نہیں اُٹھی

نظر آنے لگے مجھ کو کئی تخریب کے پہلو
ابھی اچھی طرح بنیادِ گل خانہ نہیں اُٹھی

اسی باعث تو ہیں عشرت کدے محفوظ دنیا میں
کہ شعلہ بن کے کوئی آہِ غم خانہ نہیں اُٹھی

ابھی اے مے کشو آیا نہیں ہنگام پینے کا
گھٹا کوئی بقدرِ شوقِ رندانہ نہیں اُٹھی

ابھی تو چند شمعیں اور رہیں گی زینتِ محفل
ابھی دنیا سے رسمِ سوزِ پروانہ نہیں اُٹھی

اُٹھے شیخ و برہمن ہو کے آزردہ نہ جانے کیوں
کوئی بھی مے کدے میں بحثِ رندانہ نہیں اُٹھی

وہ خود بے پردہ طورِ عشق پر آنے کو تھے لیکن
نظر تیری باندازِ حکیمانہ نہیں اُٹھی

جہاں میں رک گیا تھا کہتے کہتے داستانِ دل
وہیں سے پھر آلم تمہید افسانہ نہیں اُٹھی

غزل

(جناب بسمل شاہجہاں پوری)

آج اے دوست کہاں ہوں گے وہ یارانِ وطن
جو ہمیشہ کے لئے روٹھ گئے دیر ہوئی

جن کناروں پہ ملی میرے سفینے کو پناہ
اُن کناروں کو بھی طوفان بنے دیر ہوئی

دَیر اپنا ہے حرم اپنا خدا بھی اپنا
مگر اے دوست یہ افسانہ سنے دیر ہوئی

جن سے اُمید تھی کچھ دل کے بہل جانے کی
بسمل اُن پھولوں کو مرجھائے ہوئے دیر ہوئی

قطعات

(جناب بسمل شاہ جہاں پوری)

غنچوں کا فریبِ حسن توبہ کانٹوں سے پناہ چاہتا ہوں
دھوکے وہ دئے ہیں دوستوں نے دشمن کی پناہ چاہتا ہوں

میں ظلم پہ آہ کر رہا ہوں کیا کوئی گناہ کر رہا ہوں
اے دورِ جنوں نہ بھول جانا تجھ کو بھی گواہ کر رہا ہوں

بجھنے کو ہے زندگی کا تارا او عہد شکن بس اب خدارا
ہمراہ رقیب ہی کے آجا لے مجھ کو یہ موت بھی گوارا

یوں حشمت و جاہ دیکھتا ہوں ہر کبر تباہ دیکھتا ہوں
گرتے ہوئے پائے مفلسی پر شاہوں کی کلاہ دیکھتا ہوں

غزل

(جناب صاحبزادہ محمد عبدالرحمٰن ذکی)

خدا کو ڈھونڈ رہا تھا مگر خدا نہ ملا جہان بھر میں کوئی مجھ کو آسرا نہ ملا
جبینِ شوق رہی عمر بھر رہینِ نیاز مگر تواترِ سجدہ میں بھی مزا نہ ملا
طریقِ عشق توسل طلب ہے دنیا میں خدا ملے گا کہاں جس کو مصطفٰے نہ ملا
ہے ناتمام درِ یار کا وہ شوق جسے مقام جذبۂ مظلومِ کربلا نہ ملا
میں خندہ ہائے مسرت کی جستجو میں رہا چمن میں کوئی مگر گُل کھلا ہوا نہ ملا
جگر کی پیاس بجھی اور نہ دل کی آس مٹی میں ڈھونڈتا ہی رہا اُن کا کچھ پتا نہ ملا
دلیل ہے ترے شوقِ گریز پا کی ذکی
تلاشِ یار میں جب دردِ لا دوا نہ ملا

تبصرے

نقش جمیل از پروفیسر جمیل مظہری ایم - اے تقطیع کلاں ضخامت ۲۵۶ صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ قیمت مجلد پانچ روپیہ پتہ :- مکتبۂ ادب پٹنہ ۴

حضرت جمیل مظہری ام - اے اردو کے بلند پایہ مفکر شاعر ہیں چونکہ آج کل کے عام شاعروں کی طرح موصوف نہ مشاعروں میں شرکت کے عادی ہیں اور نہ اپنے اشعار کو حسنِ ترنم کے ساتھ پڑھنے کے خوگر ہیں اس بنا پر ممکن ہے وہ عوام میں اتنے مشہور نہ ہوں جتنے کہ دوسرے ہیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ عمقِ خیال - بلندیٔ فکر - حسنِ ادا اور فنی پختگی کے اعتبار سے موصوف کا مرتبہ بہت اونچا ہے - وہ شعر محض برائے "گفتن" نہیں کہتے بلکہ شعر خود بخود ان کے چشمۂ فکر سے ابلتے ہیں - فلسفیانہ اندازِ فکر طبیعت کے اندرونی سوز و گداز اور مطالعہ ان تینوں نے مل جل کر انھیں ایک بالکل نیا اسلوبِ بیان اور نیا انداز دیا ہے - موصوف کی شاعری ہنگامی اور وقتی نہیں بلکہ چونکہ وہ ابدی اور فطری حقایق کے ترجمان ہیں اس لئے ان کی شاعری کے نقوش لازوال ہیں اور شعر و شاعری کا سنجیدہ شعور جتنی زیادہ ترقی کرے گا ان نقوش کی قدر و قیمت اسی قدر زیادہ ہو گی -

زیرِ تبصرہ کتاب موصوف کی نظموں کا مجموعہ ہے جو پانچ ابواب پر تقسیم ہیں اس میں سیاسی - عمرانی - فلسفیانہ - رومانوی اور تخیلی ہر قسم کی نظمیں شامل ہیں اور ہر ایک نظم شاعر کے خصوصیات کلام کی پوری طرح آئینہ دار ہے - اربابِ ذوق کو جناب رضا نقوی صاحب کا شکر گذار ہونا چاہیے جن کی سعی سے یہ عروسِ جمیل لباسِ حریر میں جلوہ نما ہو کر منصۂ ظہور و شہود پر آسکی - خدا کرے وہ اسی طرح اس سلسلہ کے دوسرے حصے بھی جلد شائع کر سکیں -

شعلۂ ندا از پروفیسر اجتبیٰ حسین رضوی ایم ۔ اے تقطیع کلاں ضخامت ۲۵۶ صفحات کتابت وطباعت اعلیٰ قیمت مجلد قسم اول للعہ و قسم دوم ع۸ر پتہ : رضا نقوی صاحب کوارٹر نمبر ۱۶ روڈ نمبر ۵ گردنی باغ ۔ پٹنہ :۔

حضرت رضوی اور جناب مظہری دونوں شاعری کے ایک ہی اسکول سے تعلق رکھتے ہیں، دونوں ہم وطن بھی ہیں ۔ ہم پیشہ وہم مشرب بھی لیکن فرق یہ ہے کہ جناب مظہری کے کلام کا رنگ بہ نسبت فلسفیانہ کے شاعرانہ زیادہ ہے اور اس کے برخلاف جناب رضوی کے ہاں فلسفہ اور تصوف اس قدر غالب ہے کہ معمولی استعداد کے لوگ اس سے استفادہ نہیں کر سکتے ۔ اس اعتبار سے ان کو اردو شاعری کا مرزا بے دل بے تکلف کہا جا سکتا ہے ۔ موصوف کی شاعری نہایت گہرے غور و فکر اور عمیق بصیرت و حقیقت آگہی کی آئینہ دار ہے اور بے ساختگی کا یہ عالم ہے کہ کلام پڑھتے ہوتے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار جذب وسلوک کے عالم میں بلا قصد و ارادہ ان کی زبان سے ادا ہو گئے ہیں ۔ چنانچہ اس کی تصدیق اس مجموعہ کے دیباچہ سے بھی ہوتی ہے ۔ اس مجموعہ میں جناب رضوی کی رباعیات ۔ قطعات ۔ غزلیں اور نظمیں سب ہی شامل ہیں اور سب ایک سے ایک بڑھ کر ۔ یہ مجموعہ صرف شاعرانہ تفریح کے طور پر پڑھ لینے کا نہیں بلکہ غور و فکر کے ساتھ سمجھنے کا ہے ۔ جناب رضوی نے قدیم بحور و اوزان سے الگ ہو کر بعض نئے تجربے بھی کئے ہیں مثلاً ان کی نظم "البیلے جلوے" جس کا پہلا شعر یہ ہے

اک شعلۂ رقصاں ازل ابد جلتے انگارے چھڑک چلا　　خورشید سے ذرے سلگ چلے دامن سے دامن لہک چلا

یہ بحر متدارک میں ہے مگر اس میں خبن ۔ اضمار اور حذف و قص مختلف قسم کے زحافات جمع ہو گئے ہیں جن کا بیک وقت ایک مصرعہ میں جمع ہو جانا علم عروض میں نامانوس ہے ۔ تاہم ہمارے نزدیک یہ تجربہ کامیاب ہے اور اس سے شعر کی موزونیت اور اس کے ترنم میں کوئی فرق نہیں آیا ہے ۔

شاعروں کی دنیا سے دور جناب رضوی ایسے شعرا کا وجود اردو کے مستقبل کے لئے بڑی ہی عمدہ اور نیک فال ہے۔ امید ہے کہ اربابِ ذوق اس مجموعہ کے مطالعہ سے محظوظ و شادکام ہوں گے۔

حکمت کلیمی | از جناب ظفر احمد صاحب صدیقی تقطیع کلاں ضخامت ۱۱۹ صفحات طباعت وکتابت بہتر قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ پتہ:- یونیورسٹی پبلشرز مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڈھ

"پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" اقبالؔ مرحوم کی آخری عمر کی تصنیف ہے جب کہ ان کا فکر ارتقا کے تدریجی منازل کو طے کرنے کے بعد پختہ ہوگیا تھا۔ اور اس نے اقوام ایشیا کی حیاتِ نو سے متعلق ایک نہایت واضح اور صاف نظریہ کی شکل اختیار کرلی تھی اس حیثیت سے اس مثنوی کو پیغام اقبال کا اصل مغز اور لُبِ لباب کہہ سکتے ہیں اور اس اعتبار سے مثنوی جس قدر اہم ہوجاتی ہے۔ ظاہر ہے زیر تبصرہ کتاب اسی مثنوی کا اردو میں منظوم ترجمہ ہے۔ چونکہ لایق مترجم مسلم یونیورسٹی میں فلسفہ کے استاذ ہیں اور ساتھ ہی ذوق یقین وایمان اور مذاقِ شعر وسخن ان دونوں سے بھی بہرہ یاب ہیں اس لئے ترجمہ میں اصل مثنوی کی روح پوری طرح موجود ہے اور مفہوم میں کہیں اخلاق بھی پیدا نہیں ہونے پایا ہے شروع میں مترجم کے قلم سے مثنوی اور اقبال کے فلسفہ پر جو تقریباً چالیس صفحات کا مقدمہ ہے وہ خود مستقل افادیت کا حامل ہے۔ یہ ترجمہ اردو کے ذخیرۂ اقبالیات میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

رہنمائے قرآن

برہان

جلد ۳۴ شمارہ نمبر ۶

جون ۱۹۵۵ء مطابق شوال المکرم ۱۳۷۴ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

ہماری بیسویں صدی کا گذشتہ نصف اوّل اس پر اگر ایک نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ دور ہماری نشاۃ ثانیہ کا دور تھا جس میں ہر گروہ اور ہر طبقہ میں ایسے باکمال افراد پیدا ہوئے جنھوں نے اس اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا اور ہندوستان میں اسلامی ثقافت اور مسلم کلچر کی رفتار ترقی کو تیز سے تیز تر کر دیا۔ چنانچہ علماء میں مولانا سید محمد انور شاہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مفتی محمد کفایت اللہ۔ جدید تعلیم کے حضرات میں ڈاکٹر اقبال مولانا محمد علی۔ حسرت موہانی۔ ایسے ارباب کمال نے علم و فن، ادب و شعر۔ تہذیب و سیاست اور فکر و تخیل ہر میدان میں اپنے ایسے گہرے نقوش چھوڑے ہیں جو دیر تک قائم رہیں گے۔ لیکن یہ نسل اب آفتاب لب بام ہے۔ اس نسل کی یادگار اب تک جو چند نفوس باقی ہیں وہ مسلمانوں کی حیاتِ ملی کا بڑی قیمتی سرمایہ ہیں۔ اللہ انہیں دیر تک قائم رکھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے بعد کیا ہوگا ؟ کیا نئی نسل میں ایسے افراد موجود ہیں یا ان کے پیدا ہونے کی توقع ہے جو ان بزرگوں کے صحیح معنیٰ میں جانشین ہوں اور ان کی روایاتِ حسنہ کو قائم رکھیں ؟ اگر ذرا وسعتِ نظر کے ساتھ موجودہ صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مذکورۂ بالا سوالات کا جواب اثبات میں نہیں ہے۔ یہاں اور شعبوں سے بحث نہیں صرف علوم اسلامیہ و دینیہ سے غرض ہے۔ کہنے کو مدارس عربیہ آج ملک کے گوشہ گوشہ میں ہیں۔ جہاں مجموعی اعتبار سے ہزاروں طلبا تعلیم پا رہے ہیں اور جن پر قوم کا لاکھوں روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔ لیکن حال یہ ہے کہ اربابِ فن کا روز بروز قحط ہوتا جاتا ہے۔ کسی بڑے مدرسہ میں کسی پرانی جگہ کو پر کرنے کی ضرورت پیش آجائے تو ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملتا جو اس منصب کا حق ادا کر سکے اور جو اپنی علمی وجاہت و شخصیت سے

اس جگہ کے علمی مقتضیات کو باحسن وجوہ پورا کر سکے۔ مدارس عربیہ کے فارغ التحصیل اور سند یافتہ حضرات آج ملک کے گوشہ گوشہ میں ہیں لیکن ان میں کتنے ہیں جن میں حقیقۃً علمی ذوق ہو۔ مطالعہ کا شوق ہو۔ مسائل پر تحقیقی نظر رکھتے ہوں اور جو کتب درسیہ کی بند کوٹھری سے باہر آکر اسلامی علوم وفنون کی غیر درسی کتابوں سے بھی کوئی واسطہ یا رابطہ رکھتے ہوں۔

اس میں شبہ نہیں کہ انہیں لوگوں میں بڑی اچھی استعداد رکھنے والے بھی ہوتے ہیں لیکن ہمارا ماحول ایسا بن گیا ہے کہ یہ لوگ اپنی استعداد سے کام لے کر نہ اپنے اوقات کو علمی تحقیق وتفتیش میں صرف کر سکتے ہیں اور نہ وہ اپنے علمی ذوق کو پروان چڑھا سکتے ہیں۔ اگر کوئی مدرس ہے تو اسے دن بھر میں آٹھ آٹھ نو نو مختلف مضامین کے سبق پڑھانے ہوتے ہیں۔ پھر چونکہ تنخواہ کم ہوتی ہے اس بنا پر اخراجات پورا کرنے کے لئے درس کے علاوہ کوئی اور دوسرا دھندا بھی کرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پھر ایسا مصروف شخص اتنا وقت کہاں سے لا سکتا ہے کہ وہ غیر درسی کتابوں کا مطالعہ بھی کرے اور اس کے ذریعہ فنی کمال پیدا کرے۔ علاوہ بریں جس طرح ہمارے فن شعر کو فلم کمپنیوں اور مشاعروں کی کثرت نے تباہ کیا کہ جہاں دو چار شعر اُلٹے سیدھے موزوں کر دینے کے بعد حسن ترنم سے مشاعرہ میں ان کو پڑھ دینے سے یا کسی فلم کمپنی میں بہت ہی ارزاں قسم کے گیت اور غزلیں لکھ دینے سے شعروں کی داد ملنی شروع ہوئی اور شاعر نے سمجھ لیا کہ "ہمچو من دیگرے نیست" اب اس کی بلا کو غرض پڑی کہ فن کا مطالعہ کرے، اساتذہ کے دواوین کو کنگھالے اور اصول فن کا پابند رہ کر مشق سخن بہم پہنچائے۔ اسی طرح ہر مسجد میں ترجمہ قرآن مجید، مذہبی جلسوں کی بھرمار۔ کچھ نیم سیاسی انجمنوں کی سرگرمیاں۔ ان سب کو بھی علمی ذوق کے انحطاط وتنزل میں بہت بڑا دخل ہے۔

علمی انحطاط وتنزل کی یہ رفتار نہایت خطرناک ہے۔ اگر اس کی اصلاح نہیں کی گئی تو ممکن ہے ایک وقت ایسا آجائے کہ ہمارے اسلاف کرام کے علمی خزانے تاریخ کا ایک گم شدہ یا فراموش کردہ ورق ہو کر رہ جائیں اور کوئی بھی ایسا نہ نکلے جو ان کے نام سے بھی

آشنا ہو۔ ایسا دن ہماری قوم اور ملت کی تہذیب اور اس کے کلچر کی موت کا دن ہوگا اور ایک قوم کے کلچر اور اس کا سرمایۂ علمی کی موت خود اس قوم کی موت ہے۔ اس بنا پر مسلمانوں کے ارباب حل وعقد کا فرض ہے کہ اس طرف متوجہ ہوں اور قبل اس کے کہ ہم پر یہ تباہی مسلّط ہو ہم اس کے تحفظ اور بچاؤ کا سروسامان کرلیں۔

ہمارے نزدیک اس کا کامیاب حل یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ ایسی درس گاہوں میں اسلامی تحقیقات کا ایک مستقل شعبہ قائم کیا جائے جس میں اسلامی علوم و فنون کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کا بڑے سے بڑا ذخیرہ فراہم کیا جائے اور فارغ التحصیل طلبا میں سے دو چار ہونہار۔ ذہین، محنتی اور صاحب ذوق طلبا کا انتخاب کر کے ان سے کسی بڑے عالم اور محقق کی نگرانی میں اس شعبہ میں کام کرایا جائے۔ ہر طالب علم کو کم از کم سو روپیہ ماہوار وظیفہ دیا جائے اور اس کے ذوق اور صلاحیت کے مطابق کسی ایک موضوع کا انتخاب کر کے اس پر اس سے ریسرچ کرائی جائے اور اس شعبہ میں کام کرنے کی مدت کم از کم تین سال رکھی جائے۔ اس کے علاوہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ سال بھر میں کم از کم ایک مہینہ کے لئے مدارس عربیہ کا کسی جگہ پر ایک سیمینار قائم کیا جائے جس میں مختلف علوم و فنون کے ماہر اساتذہ شریک ہو کر مختلف مباحث پر لکچر دیں بحث و مباحثہ اور مذاکرہ کریں اور اس طرح طلبا میں علمی ذوق کی تربیت اور اس کی آبیاری کریں۔ بہر حال یہ کام کرنے کا ہے۔ اسے لازمی طور پر ہونا چاہئے۔ معمولی توجہ اور دلچسپی سے اس کا سرانجام پاجانا چنداں مشکل نہیں ہے۔

قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج

از

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق استاذ ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی)

(۲)

(ز) اپنے ہم پیشہ یعنی قاضیوں کو یتیموں اور نابالغوں کی جائداد پر دست درازی سے روکنے کے لئے سفارش :-

آپ کا یہ فرمانا کہ جب کسی لاوارث، یا خلیفہ یا ہاشمی خاندان کے فرد کی جائداد قاضی کے زیر انتظام کی جائے تو اس کی تنخواہ جائداد سے دی جائے تو میری رائے اس سے مختلف ہے، قاضی کی تنخواہ سرکاری خزانہ سے ملنا چاہئے تاکہ وہ مفوضہ جائداد پر ہاتھ صاف نہ کرسکے اور خود کو عوام کا خادم سمجھے اور چھوٹے بڑے، غریب، امیر سب کے حقوق کی حفاظت کرے۔ مفوضہ جائداد سے تنخواہ لینے کی اگر اجازت دے دی جائے تو اس بات کا قوی احتمال ہے کہ قاضی اس سے ناجائز فوائد حاصل کرے اور تنخواہ کی آڑ سے اس کو خورد برد کر جائے۔ ہاں وہ لوگ جو براہ راست جائداد کے منتظم مقرر ہوں ان کو جائداد کی آمد سے اتنی تنخواہ دی جاسکتی ہے جس سے ان کی محنت کا معاوضہ بھی ادا ہو جائے اور جائداد کے وارثوں کو بھی نقصان نہ پہنچے۔ میرا خیال ہے کہ بہت سے قاضی جائداد کے معاملہ میں اندھا دھند کام کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ یتیم قلاش ہو جاتے یا وارث تباہ ہو جائیں [1]

(ح) مصنف کو قیدیوں کے مقہور و معتوب طبقہ کی بہبودی بھی عزیز تھی، ان کی دیکھ بھال اور جرائم کے سدباب کے لئے مفید مشورے دئے ہیں :-

---

[1] کتاب الخراج ص۱۸۱

امیر المؤمنین قیدیوں کی روزانہ خوراک کا اندازہ کرائیے اور اس کے بموجب ان کا مشاہرہ مقرر کیجئے، یہ مشاہرہ روپے کی شکل میں ہو کیوں کہ اگر آپ نے خوراک مقرر کی تو قیدخانہ کے حاکم، ملازم اور سپاہی اس کو اڑا جائیں گے۔ ایک راستباز افسر مقرر کیجئے جو ان قیدیوں کے نام جن کا مشاہرہ مقرر کیا جائے ایک رجسٹر میں درج کرے، مہینہ ختم ہونے پر سب قیدیوں کو جمع کرے اور اپنے ہاتھ سے ہر قیدی کو مشاہرہ دے، اگر قیدی رہا کر دیا جائے تو اس کا مشاہرہ سرکار کو لوٹا دے۔ . . . . اس طرح آپ قیدیوں کو بیڑیوں میں قیدخانہ سے باہر جانے اور بھیک مانگنے سے بے نیاز کر دیجئے، یہ بات نہایت نامناسب ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت جس سے گناہ اور جرم سرزد ہوتے ہوں، بیڑیوں میں بھیک مانگنے باہر نکلیں، میں سمجھتا ہوں کہ غیر مسلم قومیں بھی مسلمان قیدیوں کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں کرتیں، یہ قیدی بھوک سے بے تاب ہو کر باہر جاتے ہیں، کبھی ان کو خوراک مل جاتی ہے اور کبھی نہیں ملتی، آپ ان کی خبرگیری فرمایئے اور میرے مشورہ کے مطابق ان کا مشاہرہ مقرر کیجئے۔ جو قیدی مر جائے اور اس کا کوئی سر دھرا یا رشتہ دار نہ ہو تو سرکاری خزانہ سے اس کی تجہیز و تکفین کی جائے، مجھے معلوم ہوا ہے اور بڑے معتبر ذریعہ سے کہ جب کوئی پردیسی قیدی مر جاتا ہے تو قید میں ایک یا دو دن پڑا رہتا ہے تب والی سے اس کے دفن کی اجازت ملتی ہے اور دوسرے قیدی اپنے پاس سے چندہ کر کے اس کی لاش اُٹھوانے کا انتظام کرتے ہیں اور وہ بے چارہ بغیر غسل، کفن اور نماز کے داب دیا جاتا ہے، یہ اسلام اور اہلِ اسلام کے لئے کتنی افسوسناک بات ہے! اگر آپ۔ امیر المؤمنین۔ قوانین کے ٹھیک ٹھیک نافذ کرنے کا حکم دے دیں تو یقیناً قیدیوں کی تعداد کم ہو جائے گی، جرائم پیشہ لوگ ڈر جائیں گے اور بُرے ڈھنگ چھوڑ دیں گے۔ قیدیوں کے بڑھنے کا سبب یہ ہے کہ ان کے جرموں کی تحقیق نہیں کی جاتی، اور بغیر تحقیق کے قید میں ڈال دیا جاتا ہے۔ آپ اپنے تمام حاکموں کو حکم دیجئے کہ قیدیوں کے جرم کی ہمیشہ تحقیق کیا کریں جو معمولی سزا کا مستحق ہو اس کو سزا دے کر چھوڑ دیا جائے،

جس کی نسبت جرم کا صحیح علم نہ ہوسکے اس کو رہا کر دیا جائے، حاکموں کو تاکید کر دیجئے کہ سزا دینے میں حد اعتدال سے تجاوز نہ کریں، اور ایسی سزا نہ دیں جو جرم سے زیادہ ہو مجھے معلوم ہوا ہے تہمت یا معمولی جرموں کی سزا میں ایک شخص کو دو سو یا تین سو یا کم و بیش کوڑے مارے جاتے ہیں، یہ قانون کے منافی ہے۔

۴۔ ساری کتاب میں صرف ایک مسئلہ میں مصنف نے اپنے اجتہاد کی پرزور حمایت کی ہے، اس کے علاوہ دو چار مقام ایسے بھی آئے ہیں جہاں انھوں نے قیاس کو چھوڑ کر کسی مصلحت سے "استحسان" کا دامن تھاما ہے۔ وہ ایک مسئلہ جس میں مصنف نے فعل صحابی (حضرت عمرؓ) کے مقابلہ میں اپنا اجتہاد استعمال کیا، مصنف کی معاملہ فہمی اور روشن دماغی کی ایک عمدہ مثال ہے۔ حضرت عمرؓ کے وقت میں عراق کی مال گذاری کا بندوبست اس طرح تھا کہ وہاں کی ساری اراضی کو ناپ لیا گیا تھا اور ہر جریب زمین پر چاہے وہ مزروعہ ہو یا غیر مزروعہ، خواہ اس میں عملاً کاشت ہوتی ہو یا نہ ہو، خواہ اس کو کنوئیں سے سینچا جاتا ہو یا نہر سے ایک مقررہ لگان وصول کیا جاتا تھا، مثلاً گیہوں اور جو کی ایک جریب پر لگان کی شرح ایک درہم اور ایک قفیز تھی، تل کی ایک جریب پر پانچ درہم، انگور کی ایک جریب پر دس درہم، روئی کی ایک جریب پر پانچ درہم، ترکاری کی ایک جریب پر تین درہم۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں ایسی زمین جو زراعت کے لائق نہ ہو یا جس میں عملاً کاشت نہ ہوتی ہو کم تھی، مگر قاضی ابو یوسف کے زمانہ میں کاشتکاروں کی مسلسل بدحالی، بہت سے کاشتکاروں کے مسلمان ہونے اور دوسرے پیشے اختیار کرنے، نیز دیگر اسباب کی بنا پر تقریباً سو برس سے ایسی آراضی بہت بڑھ گئی تھی جس میں کاشت نہیں ہوتی تھی، اس لئے حالات کا تقاضہ تھا کہ مال گذاری کے نظام میں ترمیم کی جائے۔ قاضی صاحب نے پہلے بڑے بڑے ماہرین مال گذاری سے مشورہ کیا مگر کسی نے ایسا حل تجویز نہیں کیا جس سے کاشتکاروں کا بوجھ ہلکا ہوتا، پھر انھوں نے بڑے بڑے کاشتکاروں کی ایک کانفرنس منعقد کی، سب

نے یک زبان ہو کر وہ اسباب جو اوپر بیان ہوئے پیش کئے اور کہا کہ ہمارے پاس نہ اتنا پیسہ ہے اور نہ اتنے آدمی کہ ہم اس زمین کو جو سو برس سے معطل پڑی ہے کاشت کے لائق بنائیں، یہ کام آہستہ آہستہ ہونے کا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ ہماری مالی حالت بہتر ہو اور وہ اس طرح کہ ہم سے صرف اتنی اراضی کا لگان لیا جائے جو بالفعل زیر کاشت ہو اور لگان اتنا ہو کہ ہم آسانی سے ادا کر سکیں اور کچھ پس انداز بھی کر لیں جس سے معطل اراضی کو لائق کاشت بنایا جا سکے[1]

قاضی صاحب نے کسانوں کی بہتری اور زراعت کی توسیع کے لئے مُقاسمت یعنی بٹائی کا اصول مقرر کیا، چنانچہ خلیفہ سے سفارش کرتے ہیں:-

امیر المؤمنین خدا آپ کو سلامت رکھے، میری رائے ہے کہ سواد (عراق کا دیہاتی علاقہ) کے جو کاشتکار گیہوں اور جو کی کاشت کریں اور سینچائی دریا یا نہروں سے کریں، ان سے پیداوار کا پانچواں حصہ لیا جائے، اور اگر سینچائی کنوؤں سے کریں تو پیداوار کا دسواں حصہ لیا جائے پھلوں، ترکاریوں اور انگور کی پیداوار کا تیسرا حصہ لیا جائے، گرمی کے غلوں کا چوتھائی حصہ۔ سرکاری محصل یہ حصہ اندازہ سے نہ لیں، بلکہ ساری پیداوار تاجروں کے ہاتھ بیچی جائے اور جو قیمت وصول ہو اس سے سرکاری حصہ نکال لیا جائے، یا سارے غلہ کی انصاف سے قیمت لگائی جائے جس میں نہ کاشتکار پر ظلم ہو نہ سرکاری آمد کو ضرر، اور ان سے بقدر سرکاری حصہ کے قیمت وصول کر لی جائے ان دونوں صورتوں میں سے جو صورت اہل خراج کے لئے زیادہ آسان ہو اختیار کی جائے۔[2]

۵- جزیہ کے باب میں مصنف نے "حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ" میں "وَهُمْ صَاغِرُوْنَ" کا مفہوم صراحۃً یا کنایۃً وہ نہیں بتایا جو بعد کے فقہاء اور قاضیوں نے پیش کیا اور جس کی بدولت جزیہ کا تصور اور ادائگی غیر مسلموں کے لئے ایک لعنت عظمیٰ اور نفرت انگیز توہین بن گئی۔

۶- مصنف نے ذمیوں کے ساتھ حکومت کی پالسی کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کے اس

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۲۸ [2] کتاب الخراج صفحہ ۵۰

منشور (Edict of Umar) کا بھی ذکر نہیں کیا جس کو بعد کے فقہار بڑے شوق سے نقل کرتے ہیں اور جس کی رو سے ذمیوں پر بہت سی پابندیاں اور توہین آمیز قیود عائد کی گئی تھیں، مصنف نے صرف چند پابندیوں کا جو زیادہ مکروہ نہیں ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ حضرت عمرؓ نے عائد کی تھیں۔ مگر تعجب یہ ہے کہ قاضی صاحب جو بلا استثنار اپنے ہر قول کی تائید میں کم از کم ایک ورنہ دو دو، تین تین، چار چار روایتیں پیش کرتے ہیں، ان پابندیوں سے متعلق حضرت عمرؓ کی کوئی حدیث نہیں پیش کر سکے، جس کا سبب غالباً یہ ہے کہ اس باب میں حضرت عمرؓ کی کوئی معتبر حدیث ان کو نہیں ملی، اور انھوں نے جو کہا وہ سنی سنائی بات تھی، اس کے علاوہ خالد بن ولید نے عراق کے نصاریٰ سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں گو بعض پابندیوں کا ذکر ہے تاہم اس نوع کی پابندیوں کا مطلق ذکر نہیں جو خلیفۂ ثانی کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ خالد بن ولید (م سنہ ۲۱ھ) کی اہلِ حیرہ کے ساتھ صلح کی مختصر نقل ملاحظہ ہو:-

"میں نے ان پر شرط لگائی ہے کہ اسلامی حکومت کی مخالفت نہیں کریں گے، اور کسی غیر مسلم کو مسلمانوں کے خلاف مدد نہیں دیں گے، نہ غیر مسلموں کو حکومت کی عسکری کمزوریوں یا رازوں سے مطلع کریں گے، اگر انھوں نے ان امور کی خلاف ورزی کی تو اسلامی حکومت کی حفاظت اور امان سے باہر ہو جائیں گے اور اگر انھوں نے ان امور کی پابندی کی تو ان کو وہ سارے حقوق حاصل ہوں گے جو ایک معاہد کو حاصل ہوتے ہیں اور ان کی جان و مال کی حفاظت ہمارے ذمہ ہوگی۔ . . . ان کا جو بوڑھا کام کاج سے معذور ہو جائے یا اس پر کوئی مصیبت نازل ہو اور یا وہ اتنا غریب ہو جائے کہ اس کے ہم مذہب اس کو خیرات دیں تو اس کا جزیہ معاف ہو جائے گا اور اس کو اور اس کے عیال کو سرکاری خزانہ سے مالی مدد دی جائے گی جب تک وہ اسلامی حکومت میں مقیم رہے گا، اور اگر اس کا کوئی غلام مسلمان ہو جائے تو اس کو مسلمانوں کے بازار میں زیادہ سے زیادہ قیمت پر بغیر کسی عجلت کے بیچا جائے گا اور اس کی قیمت اس کے مالک کو دے دی جائے گی۔ اہلِ حیرہ کو اس بات کا حق

ہے کہ جو لباس چاہیں پہنیں ۔ بشرطیکہ وہ لباس جنگی نہ ہو اور نہ وہ مسلمانوں کے لباس سے مشابہت کی کوشش کریں ، جو شخص (ذمی) فوجی لباس میں دیکھا جائے گا اس سے اس بارے میں سوالات کئے جائیں گے اگر اس کا جواب اطمینان بخش ہو تو اس کو چھوڑ دیا جائے گا ورنہ اس کو اتنی سزا دی جائے گی جو اس کی سلاح پوشی سے تناسب رکھے گی[1]۔۔۔"

مصنف نے لکھا ہے کہ خالدؓ نے شام کی طرف پیش قدمی کے دوران میں متعدد مقاموں پر اس سے ملتے جلتے معاہدے کئے اور یہ کہ ان معاہدوں کو چاروں پہلے خلفاء نے بحال رکھا[2]۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نام نہاد منشور عمرؓ اور لباس کے سلسلہ میں جو قیود ان کی طرف منسوب کی گئی ہیں بعد کے فقہاء کے اجتہادات ہیں۔

۷۔ قاضی صاحب نے جرم اور سزا پر ایک قیمتی اور مفصل فصل لکھی ہے جس کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ سزا کے بارے میں بالعموم ان کا مسلک معقول اور معتدل تھا اور بعض دردناک یا مہلک سزاؤں مثلاً حدِ زنا ، حدِ سرقہ ، حدِ قتل کے سلسلہ میں وہ نہایت محتاط مسلک رکھتے تھے۔ اس مسلک کی بنیادی اصل یہ ہے کہ شبہ کی بنا پر سزا نہیں دینا چاہئے کیوں کہ صحابہ اور تابعین نے متفقہ کہا ہے : جہاں تک ہو سکے ان تمام الزامات میں جن میں شبہ کا پہلو نکلتا ہو سزا نہ دو، اور یہ کہ غلطی سے معافی دینا ، غلطی سے سزا دینے سے بہتر ہے۔

مصنف کے مسلکِ احتیاط کی ایک مثال ملاحظہ ہو : اگر کوئی شخص حاکم کے پاس آ کر زنا کا اعتراف کرے تو حاکم کو چاہئے کہ اس کے اعتراف پر دھیان نہ دے حتیٰ کہ وہ چار بار آ کر اس کا اقرار کرے اور حاکم ہر بار اس کو ٹال دے ، جب چار بار اقرار ہو جائے تو حاکم اس کے بارے میں دریافت کرے کہ آیا وہ سنکی تو نہیں ہے ، اس کی عقل میں کوئی خلل یا دماغ میں کوئی خرابی تو نہیں ہے ، جب معلوم ہو جائے کہ وہ صحیح العقل ہے تب حد لگائی جائے۔ مصنف نے اپنے اس قول کی تائید میں رسول اللہؐ کی دو حدیثیں پیش کی ہیں جن کی رو سے آپ نے مُقِرِّ زنا پر سے

---

[1] کتاب الخراج ص۱۲۲ [2] کتاب الخراج ص۱۶۷

قرار پر اس وقت تک دھیان نہ دیا جب تک اس نے چار بار اگر اعتراف نہ کر لیا[1]

اس فصل میں مصنف نے بعض باتیں ایسی لکھی ہیں جو منشاء قانون کے منافی معلوم ہوتی ہیں، مثلاً یہ بتاتے ہوئے کہ کس کس نوع کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، لکھتے ہیں: اس شخص کا بھی ہاتھ نہ کاٹا جائے جو مال غنیمت سے چرائے، یا سرکاری خمس سے چرائے، یا حمام سے چرائے یا اس دکان سے چرائے جس میں آنے کی اجازت ہو، یا سرائے سے چرائے، یا ودیعت سے چرائے، یا رہن سے چرائے، یا مستعار چیز سے چرائے۔ قاضی صاحب اس سلسلہ میں نہ تو کوئی حدیث یا اثر پیش کرتے ہیں نہ "استحسان" کی آڑ لیتے ہیں۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں:- اگر خلیفہ یا حاکم کسی شخص کو چوری کرتے، شراب پیتے یا زنا کرتے دیکھے تو اس وقت تک اس کو سزا نہ دے جب تک دوسرے لوگ ان جرموں کی شہادت نہ دیں۔ اپنی اس رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ گو قیاس اس کا مقتضی ہے کہ محض امام یا حاکم کے دیکھنے سے حد واجب ہو جائے مگر میں نے "استحسان" کی خاطر قیاس کو نظر انداز کر دیا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ابو بکرؓ، عمرؓ اور دیگر صحابہ ایسے موقعوں پر "حد نافذ نہ کرتے تھے"۔[2]

اسی طرح مُستامن کے ذکر میں قاضی صاحب نے جو رائے دی ہے وہ ایک ایسے ذی نظر شخص سے جس نے ساری کتاب میں راستبازی اور انصاف کا بلند معیار قایم رکھا ہے نہایت درجہ مستبعد معلوم ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں: اگر ایسے غیر مسلم کا مال جو پرمٹ لے کر اسلامی حکومت میں آئے کوئی مسلمان چرالے یا مسلمان عمداً اس کا ہاتھ کاٹ لے، تو مسلمان کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔ فرماتے ہیں: گو قیاس چاہتا ہے کہ مسلمان کا ہاتھ کاٹا جائے مگر ہم نے بطور

---

[2] مصنف نے خلاف معمول اس سلسلہ میں بھی کوئی روایت بطور سند نہیں پیش کی۔ ایسا شبہ ہوتا ہے کہ یہ رائے نری اجتہادی تھی، قاضی تنوخی نے نشوار المحاضرہ، ۱/۱۲۳ میں قاضی ابو یوسف اور خلیفہ رشید کا ایک مکالمہ بیان کیا ہے جس میں خلیفہ نے اس بات کی وجہ معلوم کی ہے کہ حاکم کے مجرم کو جرم کرتے دیکھنے سے سزا کیوں لازم نہیں ہوتی اس کے جواب میں قاضی صاحب نے محض اجتہادی دلیلیں پیش کی ہیں اور یہ نہیں کہا کہ حضرت عمرؓ ابو بکرؓ یا صحابہ کا اس باب میں یہی طرز عمل تھا۔ [1] کتاب الخراج صـ۱۶۳

"استحسان" اس باب میں ان مشائخ کی رائے کو قیاس پر ترجیح دی ہے جو ہاتھ کاٹنے کے مخالف ہیں۔ اس رائے کا غالباً مطلب یہ ہے کہ مسلمان مجرم کو سزا تو دی جائے گی مگر "حد سرقہ" سے کم۔[1]

۸۔ کتاب کا خاتمہ ایسے مضمون پر ہوا ہے جس کا سیاق و سباق سے بظاہر کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس مضمون کا تعلق مستقل فصلوں سے تھا جو بعد میں نکال دی گئی ہیں۔ مثلاً کتاب کی آخری فصل میں مشرکوں اور باغیوں سے جنگ کے مسائل بیان ہوئے ہیں، اس فصل کے آخر میں اچانک یہ عبارت ملتی ہے: سألتُ أبا حنيفة رحمه الله عن اليهودي والنصراني يموتُ ولده او القرابة كيف يُعزّى، یعنی میں نے ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے دریافت کیا کہ جس مسلمان کے یہودی یا نصرانی دوست کا لڑکا یا عزیز مرجائے تو اس کی تعزیت کن الفاظ میں کی جائے؟[2]

۹۔ جیسا کہ میں نے شروع مضمون میں بتایا، ۲۱۷ صفحے کی کتاب میں، ۱۵۷ احادیثِ نبوی اور ۳۶۳ صحابہ اور تابعین کی روایتیں بیان ہوئی ہیں، ان روایتوں میں سے اکثر تو مختصر ہیں مگر ایک خاصی تعداد ایسی روایتوں کی بھی ہے جو نصف ‏‏‏دو دو اور تین تین صفحوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ روایتیں خلفائے اربعہ، اور پہلی و دوسری صدی ہجری کے صحابہ اور تابعین کی بہترین فقہی و قانونی آراء پر مشتمل ہیں۔ اور قرنِ اول و ثانی کی اسلامی دنیا کے ایک اہم حصہ کا بہترین قانونی سرمایہ ہیں۔ فقہی و قانونی اہمیت سے قطع نظر، ان روایتوں میں ایسا تاریخی مواد، خاص طور پر حضرت عمرؓ، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور حضرت علیؓ کی سیاست و انتظام سے متعلق موجود ہے جو مطبوعہ تاریخی و ادبی کتابوں میں مفقود ہے اور جس سے ان حضرات کی حاکمانہ زندگی کے بعض گوشوں پر نئی روشنی پڑتی ہے۔

---

[1] کتاب الخراج ص۱۸۹

[2] کتاب الخراج ص۲۱۶

سلاطین مغلیہ کی حیاتِ معاشقہ

از

جناب پروفیسر قاضی محمد ابراہیم ایم۔اے بی ٹی شعبہ فارسی اسماعیل یوسف کالج
جوگیشوری (بمبئی)

ہندوستان کی تاریخ میں مغلیہ حکومت کا دور جو اہمیت رکھتا ہے وہ تعارف کا محتاج نہیں
اس کے بغیر ہر وہ تاریخ جو اس برِاعظم کی بے شمار زبانوں میں لکھی گئی ہے نامکمل رہ جاتی ہے
اس کا سنگِ بنیاد ظہیر الدین بابر نے رکھا اور اس استحکام سے رکھا کہ اس کے بعد بھی دو
سو سال تک وہ قائم و دائم رہی۔ ہزاروں انقلاب اور حوادث رونما ہوئے لیکن اس حکومت
کی ایک ایک اینٹ اپنی جگہ صحیح و سالم رہی۔ شہنشاہ بابر کو زمانہ ایک فاتح کی حیثیت سے
جانتا ہے اور یہ بجا بھی ہے کیوں کہ مغلیہ حکومت کی بنیاد کا سہرا اسی کے سر ہے۔ اس کی جوانمردی،
قابلیت، ہمت اور جود و سخا کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اگر حقیقت کی عینک سے
دیکھا جائے تو یہ فاتح بے شمار خوبیوں کا مالک تھا وہ صرف مردِ میدان ہی نہ تھا بلکہ اس میدان
سے نکل کر بزمِ سخن و بزمِ ادب میں بھی اس نے طبع آزمائی کی حکمرانی کے علاوہ اس نے قلمرانی
بھی کی۔ جہاں اس نے ہمت افزا نعرے لگا کر اپنے فوجیوں کی ڈھارس باندھی وہاں اہلِ قلم
کو بھی نوازا۔ اس کی علم پروری اور ادب نوازی کی وجہ سے اس کا دربار ایسے ادبی جواہر پاروں
سے جلوہ گر اور رونق افروز تھا جن میں شعرا بھی تھے اور فلاسفر بھی، مورخ بھی تھے اور مصور
بھی۔ بابر نے ان لوگوں کو بیش بہا صلوں سے مالا مال کیا اور ان کی ہمت افزائی کی۔ بابر علم
دوست ہونے کے علاوہ خود صاحبِ قلم بھی تھا۔ اس کا ایجاد کردہ خط مشہور ہے اور آج
بھی ہم آپ اور ساری دنیا خطِ بابری سے یاد کرتی ہے۔ یہ خط اسے اتنا پسند آیا کہ اس نے

قرآن مجید اسی خط میں لکھ کر مکہ روانہ کیا۔ ملا عبد القادر بدایونی اپنی تاریخ منتخب التواریخ میں بابر کے ادبی کارناموں کو یوں بیان کرتے ہیں :-

"و از جملۂ عزائب اختراعات آں بادشاہ مغفرت پناہی خط بابری است کہ مصحفی بداں خط نوشتہ بمکۂ معظمہ فرستادہ و دیوان شعر ترکی و فارسی او مشہور است و کتابی دادہ در فقہ حنفی مبین نام"[1]۔

ان اوصاف اور خوبیوں کے ساتھ ساتھ یہ چیز بھی گرہ میں باندھ لینا چاہیئے کہ بابر سپاہی اور اہلِ قلم ہونے کے علاوہ اہلِ دل بھی تھا وہ حسن کا دل دادہ تھا اور صاحبِ حسن کا عاشق، اس میدان میں اس نے جو کار نمایاں کئے ہیں دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ خصوصًا اس کا ملکۂ حسن بی بی مبارکہ کو ہر قیمت پر اپنانا لطف اور دلچسپی سے پُر ہے۔

ابتدائے عمر میں بابر بہت شرمیلا واقع ہوا تھا اور اسی وجہ سے اپنی پہلی بیوی عائشہ سلطان بیگم سے بہت کم ملتا اور اس کے ساتھ رہتا۔ بابر خود اپنی تزک[2] میں لکھتا ہے کہ اس کے شرمیلے پن کی وجہ سے اس کی والدہ اسے چالیس دن میں ایک بار بیوی سے ملنے پر مجبور کرتی۔ مورخ فرنارڈ گرانزڈ اپنی تاریخ میں بیان کرتا ہے کہ بابر کی والدہ اسے چھ مہینے میں ایک بار عائشہ سے ملنے پر مجبور کرتی[3]۔ لیکن تزک کی روشنی میں مورخ موصوف کا بیان حقیقت سے تجاوز کرتا نظر آتا ہے۔

عائشہ سلطان بیگم سلطان مرزا میران شاہ اور قتق شاہ بیگم کی بیٹی تھی۔ پانچ سال کی عمر میں سمرقند میں بابر سے منسوب ہوئی اور گیارہ سال کے بعد (۹۰۵ھ مطابق ۱۵۰۰ء) بمقام خجند ان کی شادی ہوئی یہ مبارک رشتہ دیرپا ثابت نہیں ہوا چند سال بعد اس کو زمانہ کی نظر لگ گئی اور یہ رشتہ منقطع ہوا ان کی ایک بچی بھی ہوئی جو عرصہ موجودات میں قدم رکھتے ہی موت کی آغوش میں سو گئی۔

۹۱۳ھ میں ہم بابر کو معصومہ بیگم کی زلفوں کا اسیر دیکھتے ہیں۔ معصومہ بیگم حبیبہ سلطان بیگم

---

[1] منتخب التواریخ۔ جلد اول ص ۳۴۳ [2] تزک بابری ص ۱۲ (ترجمہ) [3] بابر فرسٹ آف مغلس ص ۳۹

کی لڑکی تھی جو بابر کے خویش و اقارب میں سے تھی۔ معصومہ کی معصومیت نے بابر کو موہ لیا تھا۔ بقول بابر یہ شادی خراسان میں سنہ ۹۱۳ھ میں ہوئی[1] بابر اور معصومہ بیگم دونوں کو ایک دوسرے سے گہرا لگاؤ تھا۔ محترمہ بیورج ہمایوں نامہ کے مقدمہ میں اس رومان انگیز قصہ کو یوں بیان کرتی ہیں:

"She (Masuma Sultan Begam) Married Babur in 913 and from his account of affairs it was love match on both sides."[2]

شادی کے بعد بھی ان دونوں میں وہی ربط وہی محبت اور وہی یگانگت تھی جو شادی سے پہلے تھی۔ لیکن معصومہ کی زندگی نے وفا نہیں کی۔ معصومہ بیگم وضع حمل کے فوراً بعد راہیِ ملک عدم ہو گئی۔ بابر کو اس کا بہت رنج ہوا۔ اس نے نوزائیدہ بچی کو اسی نام سے پکارا اور اسے معصومہ کی یادگار سمجھ کر دل و جان سے سنبھالا اور محمد زمن مرزا بایقرا سے اس کی شادی کر دی۔

سنہ ۹۲۵ھ بابر کی رومانی زندگی میں گویا سنگِ میل ہے اس وقت بابر یوسف زئی قبیلہ کو زیر اقتدار لانے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ یہ قبیلہ اپنے سردار ملک شاہ منصور کے زیر اثر کافی طاقت ور بن چکا تھا ملک شاہ منصور کی لڑکی بی بی مبارکہ اس وقت حسن و جوانی میں بے نظیر تھی۔ ہر کس و ناکس اس کے حسن کا مداح تھا بابر بھی قدرت کے اس شاہکار کے حسن کا چرچہ سن چکا تھا۔ اس وقت وہ بھی ایک جوان فاتح تھا۔ وہ اس ملکۂ حسن سے متاثر ہوا اور اسے بہ چشم خود دیکھنا چاہتا تھا لیکن ابھی حیات کا ماحول سازگار نہیں تھا اس کے اور یوسف زئی قبیلہ کے تعلقات اتنے خوش گوار نہیں تھے کہ وہ اس حسینہ کے دیدار سے آنکھیں سیر کرتا تاہم اس کے دل میں شہزادیِ حسن کو دیکھنے کی آرزو نے تلاطم برپا

---

[1] ترجمہ تزک بابری ص ۳۲۹ [2] مقدمہ ہمایوں نامہ ص ۲۶۳

کر رکھا تھا۔ بابر نے بی بی مبارکہ کو دیکھنے کی ٹھان لی تھی لہٰذا بقول غالبؔ

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ　　　تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

بابر اس جانِ عالم اور حسنِ عالم کے نظارے کے لئے فقیرانہ لباس پہنے اور ہاتھ میں عصا اور کشتہ لئے یوسف زئی سردار کے دروازہ پر حاضر ہوا کہ دیدار حسن سے جھولی بھر لے۔ ایف گرانڈ کا بیان ہے کہ عید الضحٰے کے دوران میں بابر ملک شاہ منصور کے احاطہ مکان میں داخل ہوا جہاں لوگوں کا ایک جم غفیر تھا۔ یوسف زئی قبیلہ کے لوگ عقیدت مندانہ اپنے سردار کی خدمت میں تحفہ عید مبارک پیش کرنے دور دراز مقامات سے آئے تھے اور دوسری طرف فقیروں کا ایک ہجوم تھا جہاں سردار کے لوگ جن میں بی بی مبارکہ بھی تھی فقیروں کو بھنا ہوا گوشت اور روٹی تقسیم کر رہے تھے فاتح بابر بھی ان میں شامل ہوا بی بی مبارکہ نے اسے گوشت اور روٹی کے ٹکڑے دیئے بابر نے اس ماہ رخ اور پری پیکر کو دیکھا۔ اس کے دل میں ایک خیال سا پیدا ہوا۔ شہنشاہیت کی شان و شوکت حسن کے دربار میں سرنگوں ہو گئی بابر اسے ہر قیمت پر اپنانا چاہتا تھا کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ بی بی مبارکہ ایک ایسے قبیلہ سے متعلق ہے جو مغلیہ خاندان کے خون کا پیاسا ہے۔ بابر وہاں سے لوٹا راستہ میں پہاڑوں سے گذرتا گیا اور تھک کر وہ ایک اونچی چٹان پر بیٹھ گیا اور طرفِ دیگر سے حاصل شدہ روٹی جو اس کے لئے من و سلویٰ سے کم نہ تھی نوش کی۔

ملک گیری اور بادشاہت نے بابر کو دور اندیشی کا سبق سکھایا تھا وہ مصلحت اندیش تھا اور یہی ایک خوبی تھی جو بابر سے ہمایوں اور ہمایوں سے ہوتے ہوئے اکبر میں بدرجہ اتم نمایاں ہوئی جس کی مثالیں ایک نہیں دو نہیں بلکہ بے شمار ہیں صرف تاریخ کا مطالعہ شرط ہے۔ بابر بی بی مبارکہ کو حاصل کر کے دشمنی کی آگ کو ہوا دینا نہیں چاہتا تھا بلکہ وہ اس بات سے متفق تھا کہ بی بی مبارکہ کے ذریعہ دونوں خاندانوں میں دوستی اور یک جہتی پیدا ہو جائے دوسرے روز بابر نے اپنے مشیر کار سے مشورہ لیا اور یہی طے پایا کہ یوسف زئی قبیلہ کے سامنے

دوستی کا ہاتھ پھیلائے۔ لہٰذا اس نے کچھ لوگ قبیلہ کے سردار کے پاس بھیجے اور دوستی قایم کی لیکن ابھی اصل کام باقی تھا۔ بی بی مبارکہ کا خیال اس کے دل میں موجزن تھا بابر اس کے لئے بے چین تھا حالات کو سازگار دیکھ کر بابر نے ملک شاہ منصور کو اپنی خواہش سے آگاہ کیا اور ۹۲۵ھ میں بابر نے بی بی مبارکہ کو اپنا لیا۔ بی بی مبارکہ ایک سردار کی لڑکی تھی وہ اپنے قبیلہ کے لئے دائم امان چاہتی تھی اسی لئے اس نے ایسے سہانے وقت بابر سے خود وعدہ لیا کہ یوسف زئی قبیلہ ہمیشہ مغلوں کے تباہ کن حملوں سے محفوظ رہے گا۔ بابر کی بیٹی گلبدن بیگم اپنی تاریخ ہمایوں نامہ میں رقم طراز ہے کہ شادی کے وقت بابر نے ملک شاہ منصور کو خلعت اور بیش بہا تحفہ عطا کئے اور نہایت احترام سے اس کا خیر مقدم کیا۔ محترمہ اپنی تصنیف میں بی بی مبارکہ کو افغانی آغاچہ کے نام سے یاد کرتی ہے:۔

"دردر مذکور ملک منصور یوسف زئی کہ پدر افغانی آغاچہ باشد آمدہ حضرت را ملازمت کردہ۔ حضرت بادشاہ افغانی آغاچہ را گرفتہ در عقد خود در آوردند و اسپ و سرو پای بادشاہانہ عنایت فرمودند"[1]

عرض کیا جا چکا کہ بی بی مبارکہ حسن و خوبی میں بے عدیل و بے نظیر تھی اس کا یہ خداداد اور فاتح حسن بابر کے شاہی حرم سرا میں رشک و حسد کا باعث بن گیا۔ بابر کی دوسری بیویاں نہیں چاہتی تھیں کہ بابر صرف اسی شمع کے گرد چکر کاٹے انھوں نے بابر اور بی بی مبارکہ کی محبت کو کم کرنے کی خاطر بی بی مبارکہ کو نامعلوم طریقہ سے ایک ایسا معجون کھلا دیا جس کی وجہ سے بی بی مبارکہ تا دم آخر اولاد سے محروم رہی بی بی مبارکہ اکبر کے دور حکومت میں انتقال کر گئی۔ اس کا بھائی میر جمال ہمایوں اور اکبر کے عہد حکومت میں اعلیٰ عہدہ پر فائز تھا۔

بابر کی طرح ہمایوں بھی علم پرور اور ادب نواز تھا اور ساتھ ہی بابر کی رومانیت بھی اس کے ورثہ میں چلی آئی تھی۔ وہ بھی حسن پرور اور اس کا دل دادہ تھا۔ مورخین نے اس

[1] ہمایوں نامہ صفحہ ۱

کی داستانِ معاشقہ کو زمانہ کے ہاتھوں برباد نہیں ہونے دیا بلکہ تاریخ کے اس انمول واقعہ کو بیش بہا موتی سمجھ کر لوحِ ادب پر ٹانک دیا کہ دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہ سکے۔ ہمایوں اور حمیدہ کے تعلقات مقبولِ عام ضرور ہیں لیکن بہت کم تاریخیں ایسی ہیں جن کے پڑھنے سے طبیعت سیر ہوتی ہے۔

حمیدہ بانو میر بابا دوست کی لڑکی تھی۔ میر بابا دوست ہمایوں کے بھائی مرزا ہندال کی ملازمت میں تھا حمیدہ بانو مرزا ہندال کے حرم سرا میں زیادہ مقبول تھی اہلِ حرم کے علاوہ ہندال بھی حمیدہ کو عزیز رکھتا اور اس کی ذہانت اور ہوشیاری پر عش عش کرتا تھا۔ ہمایوں کی نظر حمیدہ پر اس وقت پڑی جب وہ ہندال کے یہاں مقیم تھا۔ شاہی رسم کے مطابق مرزا ہندال نے اپنے مہمان بھائی کا خیر مقدم کیا اور اس کے اعزاز میں ایک جشنِ اعلیٰ منعقد کیا۔ تمام لوگ ہمایوں کی خدمت میں آداب بجالائے اور شاہی خدمت سے مشرف و سرفراز ہوتے، حرم سرا کی بیگمات اور دیگر خواتین نے بھی یکے بعد دیگر آداب بجالائیں ان میں حمیدہ بھی تھی حمیدہ بھی دست بستہ ہو کر آداب بجالائی اور شاہی خدمت سے باریاب ہوئی یہی ملاقات تھی جب کہ ان کی خوش آیند زندگی کی بنیاد رکھی گئی۔

حمیدہ اخلاقِ حمیدہ سے موصوف تھی۔ اس کے خداداد حسن نے ہمایوں کو اس کا پرستار بنالیا تھا ہمایوں چالیس سال کا ایک معمر انسان تھا اور کافی بیویاں اس کے حرم سرا میں داخل ہو چکی تھیں تاہم حمیدہ کی کشش نے اس میں ایک نئی روح پھونک دی تھی اور اس کے جذبات میں از سر نو ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ ہمایوں اس وقت دربار میں تھا جہاں چل چلاؤ تھا۔ جشن کے اختتام پر وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اس کی شاہنشاہیت اور جاہ و عظمت نے حمیدہ کے فروغِ حسن کے آگے ہاتھ ٹیک دئے تھے۔ ہمایوں خاموش تھا لیکن اس کے دل و دماغ میں اضطراب، بے قراری اور بے چینی تھی ایک طرف اپنے وقار و عظمت کا خیال تھا اور دوسری طرف عشق و محبت کا دریا تلاطم خیز تھا۔ ایک طرف تخت تاج اور ان کی محافظت کا خیال دامنگیر تھا اور دوسری طرف عشق نوازیاں مقصود تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا یہ جنون پادشاہت کے لئے آندھیاں

لاکر رہے گا اور مغلیہ سلطنت کی وہ بنیادیں جنہیں بابر نے اپنے خون اور پسینے کے بلبے میں پوری مضبوطی اور استحکام کے ساتھ رکھی تھی متزلزل ہو کر رہ جائے گی لیکن حسن کی سرکار میں سر تسلیم خم کرنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا اس وقت ہمایوں کے سامنے دو راستہ کھلے تھے :

؎ یا رقص کی محفل میں بجا تال سے گھنگرو یا جنگ کے میداں میں سُنا تیغ کی جھنکار

شعور کی پختگی اور فکر کی گہرائی تجربہ سے حاصل ہوتی ہے اور یہ نعمت عالی ہمایوں کو ورثہ میں ملی تھی۔ ہمایوں اپنے باپ کی طرح دور اندیش اور معاملہ شناس تھا وہ مصلحت اندیشی سے کام لینا چاہتا تھا وہ چاہتا تھا کہ ملک الامانی کے ساتھ حسن پروری بھی کرے اور مغلیہ سلطنت کے سنگ بنیاد کو دائمی صورت بخشے۔ ہمایوں نے حالات پر ہر ممکن زاویہ سے روشنی ڈالی اور ایک ایک مہرے کی جانچ پڑتال کی تب جا کر اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ حمیدہ کے ساتھ شادی ہی گویا کلید کامیابی ہے

سب سے پہلے ہمایوں یہ جاننا چاہتا تھا کہ حمیدہ کس کی بیٹی ہے یہ چیز وہ دربار میں نہیں جان سکتا تھا جہاں اہل دول جمع تھے۔ لہٰذا وہ اپنی والدہ دلدار بیگم کی خدمت میں پہنچا جہاں اس کا بھائی ہندال بھی خدمت مادری میں موجود تھا ہمایوں نے اپنی اضطراب پذیر حالت پر پردہ ڈالتے ہوئے یہ معلوم کر لیا کہ حمیدہ بانو میر بابا دوست کی لڑکی ہے۔ ہمایوں نے ان دونوں کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور دلدار بیگم سے یہ گذارش کی کہ وہ حمیدہ کا رشتہ اس سے جوڑ دے۔ ہندال کو ہمایوں کی یہ تجویز پسند نہ آئی اس نے ہمایوں اور حمیدہ کے درمیان عمر کا بہت بڑا فرق پایا۔ ہندال نہیں چاہتا تھا کہ ہمایوں جیسے متلون مزاج اور معمر شخص کے ساتھ حمیدہ کا رشتہ طے کر دے۔ ہندال کو حمیدہ سے ایک خاص لگاؤ تھا۔ حمیدہ ہندال کی بہنوں کی سہیلی تھی۔ اس نے حمیدہ کو اپنی لڑکی اور بہن کی طرح پالا تھا اس نے دل دار بیگم اور ہمایوں کو صاف اور کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ حمیدہ کم عمر لڑکی ہے اس کی اور ہمایوں کی عمر میں خاصہ نمایاں فرق ہے نیز اس نے حمیدہ کو اپنی بچی کی طرح چاہا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمایوں اس قسم کی خواہش کا اظہار کرے۔ اسے ہمایوں سے ہمدردی ضرور تھی لیکن اس معاملہ میں وہ سخت مخالف تھا۔

ہمایوں کو ہندال سے یہ توقع نہ تھی۔ ہندال کے جواب نے ہمایوں کے غصہ کو برانگیختہ کردیا اور ہمایوں مارے غصہ کے وہاں سے چلا گیا:

[1] "روز دیگر باز حضرت بدیدن حضرت والدہ دل دار بیگم آمدند کہ دختراو (میر بابا) را بما نسبت بکنید مرزا ہندال عذر ہائے گفتند کہ ایں دختر را من مثل خواہر و فرزند خود مید انم حضرت پادشاہ اند...... حضرت پادشاہ خشم کردہ برخاستہ رفتند"

دلدار بیگم آخر ماں تھی۔ ہمایوں کا اس طرح ناراض ہو کر چلا جانا اسے مطلق نہیں بھایا۔ جس حکومت کا سنگ بنیاد اسی کے محبوب شوہر نے رکھا تھا اس کی تکمیل ابھی باقی تھی اور یہ کام ہمایوں کو کرنا تھا دلدار بیگم نے ہمایوں کو تسلی بخش خط لکھا کہ حضور ناراض نہ ہے جس آرزو کا اظہار آپ کی طرف سے ہوا ہے اس سے قبل حمیدہ کی ماں نے حمیدہ کے لئے کیا ہے:۔

[2] "مادر دختر ازیں ہم بیشتر نازمی کند"

اس خط نے ہمایوں کے دل بے قرار کو قرار دیا اس نے فوراً دل دار بیگم کو جواب لکھا کہ وہ اس رشتۂ سعید کے جوڑنے میں عجلت کرے اور مزید لکھا کہ طرف دیگر کی جو بھی شرطیں ہوں بسر وچشم قبول کرلیں کہ سکون قلب مقصود ہے:

[3] بادشاہ درجواب نوشتہ فرستادند کہ ایں حکایت شما بہ مابسیار خوش آمد ہر نازی کہ کنند بسر وچشم قبول داریم"

یہاں یہ نوٹ کرلینا چاہئے کہ دل دار بیگم نے یہ خط محض ہمایوں کی دل جوئی کے لئے لکھا تھا کیوں کہ حمیدہ کے بے خوف و بے ڈر جوابات جو اس نے ہمایوں اور دل دار بیگم کو دئے ہمیں یہ تسلیم کرنے پر راضی نہیں کرتے کہ حمیدہ کی ماں نے حمیدہ کو ملکہ بنانے کی خواہش کا اظہار دل دار بیگم یا کسی اور کے سامنے کیا ہو۔

---

[1] ہمایوں نامہ صد۵۲ [2] ہمایوں نامہ صد۵۲ [3] ایضاً

حمیدہ بانو بیگم ہر بات کو بڑی خوبی سے سوچتی اور سمجھتی تھی اس نے ہمایوں کی التماس کو ہر پہلو سے دیکھا اور ہر سمت سے اس پر روشنی ڈالی۔ شادی کا مسئلہ اس کے لئے ایک اہم مسئلہ تھا وہ اس رشتہ کو ایک مقدس اور پاک رشتہ خیال کرتی تھی اور ازدواجی زندگی کا مقصد اس کے پاس ایک ایسی زندگی تھی جس میں شوہر اور بیوی دونوں کا حق برابر ہو اور دونوں اس زندگی کو کامیاب بنانے میں کوشاں رہیں۔ ان خیالات کی روشنی میں حمیدہ کو یقین نہ تھا کہ ہمایوں کے ساتھ شادی کر کے وہ زندگی کے سہانے خواب دیکھ سکتی ہے کیونکہ ہمایوں ایک معمر شخص تھا اور وہ ایک نوخیز دوشیزہ، یہ دونوں شاید ہی ہم خیال ہو سکتے ہیں، حمیدہ اس بات سے بھی واقف تھی کہ ہمایوں افیون کا شائق ہے جس کی زندگی بغیر افیون کے بے جان ہے ان وجوہات کی بنا پر حمیدہ نے ہمایوں کی خواہش کو ٹھکرا دیا۔

ہمایوں کی بے چینی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ حمیدہ کو اپنی خدمت میں بلانا چاہتا تھا۔ لہذا اس نے حمیدہ بانو کو طلب کیا۔ حمیدہ نے صاف کہہ دیا کہ جہاں تک شاہی رسم کا تعلق تھا میں خدمت سے مشرف ہوئی اب کیا ضروری ہے کہ میں دوبارہ ہمایوں کی خدمت میں جاؤں۔ اس نے انکار کر دیا:

لہ "وگفتند کہ کس فرستیدہ حمیدہ بانو بیگم را طلبیدہ بیارد .... حمیدہ بانو نہ آمدند گفتند اگر غرض ملازمت است خود آں روز بملازمت مشرف شدہ ام۔ دیگر برائے چہ بیایم۔"

ہمایوں نے اپنے خاص ملازم سبحان قلی کو ہندال کے پاس بھیج کر حمیدہ کو طلب کیا۔ سبحان قلی نے ہندال کو شاہی فرمان سے مطلع کیا۔ ہندال خود بھی اس معاملہ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ اسے یقین تھا کہ اس معاملہ میں حمیدہ اس کی ایک بھی نہ سنے گی۔ اس نے سبحان قلی سے یہی کہا کہ وہ خود جا کر حمیدہ کو شاہی فرمان سنائے اور اگر وہ تعمیل کرنے

لہ ہمایوں نامہ صہ۵۲

کے لئے راضی ہو جائے تو مجھے کوئی عذر نہیں۔ سبحان قلی نے ایسا ہی کیا لیکن حمیدہ پر اس کا اثر نہیں ہوا۔ حمیدہ ہمایوں کی بے لوث محبت کو سمجھنے سے قاصر تھی اس کی نظروں میں ہمایوں حسن پرست اور ہوس پرست تھا اور وہ اس کی ہوس پرستی کا شکار بننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ یہی سمجھتی تھی کہ ہمایوں اس وقت اس کے حسن سے مرعوب ہے ممکن ہے کل وہ اسے ٹھکرا دے اور اس کی زندگی کو تاریک تر بنا دے۔ حمیدہ خود بھی اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتی تھی کہ وہ ملکہ بننے کی خواہش کرے ؂ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ اس نے سبحان قلی کو جواب دیا کہ بادشاہ کو ایک مرتبہ دیکھنا جائز ہے دوسری مرتبہ دیکھنا ناجائز و نامحرمی ہے میں نہیں آؤں گی:

[1] "بیگم جواب دادند کہ دیدن پادشاہ یک مرتبہ جائز است در مرتبہ دیگر نامحرم است۔ من نمی آیم"

حمیدہ کے اس جواب پر ہمایوں سخت غصہ ہوا اس نے کہا کہ ہم نامحرم کو محرم بنائیں گے:

[2] "حضرت فرمودند اگر نامحرم اند محرم می سازیم"

ہمایوں نے اس سلسلہ میں کافی جدوجہد کی اور ہر ممکن طریقہ سے حمیدہ کی خوشنودگی حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی صورت نظر نہ آئی۔ حمیدہ اپنے فیصلہ پر اٹل رہی۔ ہمایوں کی ناراضگی دل دار بیگم کو گوارا نہ تھی وہ خود حمیدہ کے پاس گئی اور اسے سمجھایا کہ حمیدہ تو آخر لڑکی ہے تجھے کسی سے شادی کرنا ہی پڑے گی اس لئے ایک بادشاہ کا کیوں نہ انتخاب کرے اس کے علاوہ دل دار بیگم نے پند و نصائح سے بھی کام لیا تاکہ حمیدہ مان جائے اور مغلیہ حکومت کے تاجدار کو ایک نئی زندگی دے دے جو اس کے بغیر بے کیف بن چکی ہے۔ چالیس روز تک حمیدہ کی خوشنودگی حاصل کرنے کے لئے کوششیں کی گئیں لیکن کوئی جواب امید بخش نہیں ملا۔

---

[1] ہمایوں نامہ ص۵۲ [2] ایضاً ص۵۳

لہ "غرض کہ چہل روز از جہت حمیدہ بانو بیگم مبالغہ و مناقشہ بود و لی بیگم راضی نہ شدند...

حضرت والدہ ام دل دار بیگم نصیحت کردند کہ آخر خود بکسی خواہد رسید بہتر از پادشاہ کہ خواہد بود۔"

دل دار بیگم کا احترام حمیدہ کے دل میں ضرور تھا کیونکہ اس کا باپ اس کا بھائی بلکہ تقریباً پورا کنبہ شاہی ملازمت سے سرفراز تھا اس کے باوجود بھی حمیدہ نے ملکہ کو یہی جواب دیا کہ میں شادی ضرور کروں گی لیکن اس شخص کے ساتھ جس کے گریبان تک میرا ہاتھ پہنچ سکے نہ کہ ایک ایسے شخص کے ساتھ جس کے دامن تک بھی میرا ہاتھ نہ پہنچ سکے:

لہ "بیگم گفتند کہ آری بکسی خواہم رسید کہ دست من بگریبان او رسد نہ آنکہ بکسی برسم کہ دستِ من می دانم بدامن او نرسد۔"

تاہم دل دار بیگم کے الفاظ بے سود ثابت نہ ہوئے۔ حمیدہ نے دل دار بیگم کے خیالات پر دوبارہ روشنی ڈالی اسے دل دار بیگم کے الفاظ یاد آئے کہ اگر ہمایوں کو اس کی طرف سے ناامیدی ہو جائے گی تو مغلیہ سلطنت نیست و نابود ہو جائے گی۔ علاوہ ازیں یہ چیز بھی حمیدہ کے مدِنظر تھی کہ ہمایوں کے دل میں کچھ تو ہے جس کی وجہ سے وہ اتنا بے قرار ہے محض ہوس پوری ہی مقصود ہوتی تو ہمایوں نے بہت پہلے اس کا خیال ترک کر دیا ہوتا اس کے لئے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ غرض کہ حمیدہ نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ ہمایوں نے اسطرلاب کے ذریعہ خود تاریخ نکالی اور جمادی الاول ۹۴۷ھ میں میر ابو البقار نے ان کا خطبۂ نکاح پڑھا[۳]۔ ہمایوں نے میر ابو البقار کو دو لاکھ روپئے اور خلعت سے سرفراز کیا۔ یہ شادی بمقام پاتر ہوئی:

لہ "غرض کہ بعد از چہل روز ماہ جمادی الاول ۹۴۷ھ نہصد و چہل و ہشت در مقام پاتر روز دوشنبہ نیم روز بود کہ اسطرلاب را حضرت پادشاہ بدست مبارک خود گرفتہ اند و بساعت سعد را اختیار کردہ میر ابو البقار طلبیدہ حکم فرمودند کہ نکاح بستند۔ مبلغ دو لک نکاحانہ بمیر ابو البقا دادند۔"

لہ ہمایوں نامہ صفحہ ۵۳ لہ ایضاً سہ یہ شادی پیر کے روز دوپہر میں ہوئی لہ ہمایوں نامہ صفحہ ۵۳ اور منتخب التواریخ حصہ اول صفحہ ۴۳۶

جہانگیر کی حیاتِ معاشقہ تاریخ کے اوراق مزین کئے ہوئے ہے اس کا اور نورجہاں کا رومان انگیز قصہ اور اس کی شہرت جہانگیر اور عالمگیر بن چکی ہے۔ ان کے رومان کو جس رنگ میں اور جس طریقہ سے مورخین نے زمانہ کے سامنے بطور یادگار پیش کیا ہے اس میں حقیقت کا پہلو کم اور مبالغہ کی اکثریت ہے جس کی وجہ سے نورجہاں اور جہانگیر کی عزت وعفت پر ایک ضرب کاری لگ چکی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب کبھی جہانگیر کا ذکر آتا ہے تو نظروں کے سامنے ایک عیاش عاشق کا مجسمہ کھڑا ہو جاتا ہے یہ غلط فہمی نسل در نسل پھیلتی جارہی ہے حتی کہ اسے حقیقت سمجھ کر اسٹیج پر اور پردۂ سیمیں پر پیش کیا جاتا ہے۔ دراصل اس قسم کی غلط فہمی اور ان لوگوں کے متعلق اس قسم کے من گھڑت قصہ کی تخلیق ان سے کئی سال بعد کے مورخوں نے کی ہے۔ مثلاً خفی خاں صاحب منتخب اللباب اور سجان رائے مصنف خلاصۃ التواریخ اس کی بابت ہمیں ان تاریخوں اور کتابوں پر اعتبار کرنا چاہیئے جو جہانگیر یا اس سے کچھ سال قبل قبل یا بعد میں لکھی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے اکبرنامہ۔ آئین اکبری۔ منتخب التواریخ۔ طبقات اکبری۔ اقبال نامہ جہانگیری اور تزک جہانگیری زیادہ مفید ہیں لیکن پہلی چار کتابوں میں اس واقعہ کے متعلق چھان بین کرنا بے سود ہے کیوں کہ ان مورخین نے اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ جس کی وجہ غالباً یہی ہو سکتی ہے کہ یہ تصانیف غیاث بیگ کے آنے سے پہلے لکھی جا چکی تھیں پس اس قصہ کی تحقیق کے لئے ان کے علاوہ دیگر درج شدہ کتابیں مفید اور قابل اعتماد ہیں۔

سب سے پہلے جس رنگ اور جس ڈھب میں قصہ کو پیش کیا گیا ہے اس کے متعلق جاننا ضروری ہے۔ منتخب اللباب کا مصنف اس قصہ کو یوں بیان کرتا ہے: وہ لکھتا ہے کہ جب نورجہاں سن رشد کو پہنچی تب جہانگیر کبھی کبھار اس سے نظریں ملاتا۔ آہستہ آہستہ اس کا دل نورجہاں کی طرف مائل ہوا۔ ایک روز جب کہ محل میں یکتائی اور خاموشی کا عالم تھا تب سلیم نے نورجہاں کو فرطِ محبت سے پکڑ کر اپنی باہوں میں بھینچ لیا۔ نورجہاں نے بڑی جد وکد کے بعد اپنے آپ کو سلیم کی گرفت سے

آزاد کیا اور محل کی دیگر بیگمات کے سامنے شوخ شہزادہ کی شکایت کی۔ یہ خبر اکبر کے کانوں تک پہنچی جس کی وجہ سے اکبر نے غیاث بیگ کو تنہائی میں یہ مشورہ دیا کہ وہ جلد از جلد مہرالنساء کی شادی کردے لہذا اکبر کے مشورہ سے غیاث نے علی قلی خاں استجلو عرف شیر افگن کے ساتھ اپنی بیٹی نورجہاں کی شادی کردی۔ مورخ مزید رقمطراز ہے کہ اکبر نے شیر افگن کو بنگال میں جاگیر عطا کی اور اسے وہاں روانہ کردیا۔ سلیم نے اپنی تخت نشینی کے بعد قطب الدین خاں کو کلتاش کو بنگال کا صوبہ دار مقرر کیا اور شیر افگن کے خلاف کچھ کہہ کر اسے بنگال کو روانہ کردیا بقول مورخ قطب الدین کے اس تقرر سے شیر افگن نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جہانگیر کے دل میں اس کی بیوی مہرالنساء کی محبت اب تک بھڑک رہی ہے چنانچہ اس نے حلقہ فرمانبرداری کو گلے سے نکال پھینکا۔ قطب الدین نے تھوڑے لوگ بھیج کر شیر افگن کو طلب کیا لیکن اس نے بڑی بے پروائی برتی حتیٰ کہ قطب الدین خود اس کی جاگیر میں پہنچا شیر افگن اپنے آپ کو مسلح کر کے چند آدمیوں کے ہمراہ قطب الدین کی ملاقات کو بڑھا آہستہ آہستہ ان کی گفتگو نے بحث و تکرار کی صورت اختیار کرلی۔ اب شیر افگن کو یقین ہوگیا کہ یہاں سے مارنے یا مرنے کے سوا دوسرا راستہ نہیں ہے لہذا اس نے اپنی شمشیر سے قطب الدین کو اس طرح گھائل کیا کہ اس کی آنتیں نکل پڑیں۔ اور وہ وہیں زمین پر گر پڑا۔ اس کے ساتھیوں نے شیر افگن پر پے در پے وار کئے شیر افگن سخت زخمی ہوا اور اسی حالت میں گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے چل دیا تاکہ اپنے سے پہلے اپنی بیوی مہرالنساء کو بھی ختم کردے اور اس طرح سلیم کی حسرت ادھوری رہ جائے مکان پر پہنچا تو اس کی خوشدامن نے شیر افگن کے ارادے کو اس کے زخم آلود چہرے سے بھانپ لیا اور دقت کی نزاکت کو دیکھ کر اندر سے رونے کا شور و غل مچایا اور کہا کہ مہرالنساء نے اپنے شوہر کے قتل کی خبر سن کر اپنے آپ کو کنویں میں ڈھکیل دیا اور مزید کہا کہ وہ فوراً جاکر اپنے زخموں پر مرہم لگوائے لیکن شیر نڈھال ہو چکا تھا وہ زمین پر گر پڑا جہاں سے دوبارہ اٹھ نہ سکا۔ اس حادثہ کے بعد مہرالنساء کو شاہی محل سرا روانہ کردیا گیا جہاں جہانگیر نے مناکحت و مواصلت کی آرزو کا اظہار کیا۔[1]

---

[1] منتخب اللباب حصہ اول ص ۲۶۶-۶۷

خفی خاں کے بعد سجان رائے نے اپنی تاریخ خلاصۃ التواریخ میں اس قصہ میں اور بھی رنگ آمیزی کی اس کا بیان ہے کہ اس ماہ زہری تمثال کے جمال بے مثال سے مرعوب ہو کر جہانگیر نے شیر افگن کو اپنے راستہ کا کانٹا سمجھ کر اسے مروا ڈالا گویا اس مورخ کی رائے کے مطابق شیر افگن کا قاتل جہانگیر تھا:

"حضرت خاقانِ زماں با صفائے خوبہائے آں ماہ لقا تخم عشق و محبت در مزرعہ جان می افشانند دریں صورت عجب نیست کہ شیر افگن بموجب امر والا بہ قتل رسیدہ باشد"[1]

الغرض ان تاریخوں کو منبع معتبر سمجھ کر مورخوں نے اس قصہ کو جو شہرت دی ہے وہ اظہر من الشمس ہے ؎ چوں رہ حقیقت ندیدند رہ افسانہ زدند۔ ان کے بعد کے ہر مورخ نے اس قصہ کے لکھنے میں خیال آرائیاں اور رنگ آمیزیاں کی ہیں۔ تاریخ ہند کا مورخ ڈوی لکھتا ہے کہ نور جہاں نے ملکہ بننے کی خاطر جہانگیر پہ ڈورے ڈالنے شروع کئے اور اپنے رعنائے حسن اور غمزہ ہائے دلربا سے جہانگیر کے دل کو فتح کیا لیکن افسوس کہ اس کی شادی شیر افگن سے کر دی گئی۔ جہانگیر نے خفیہ طور پر شیر افگن کے قتل کا حکم جاری کیا۔ مورخ موصوف مزید لکھتا ہے کہ جب شیر افگن قتل ہو چکا تب نور جہاں نے دوبارہ جہانگیر کو اپنی طرف مائل کیا اور چار سال کے بعد شادی کر لی:[2]

"She (Nurjehan) aspired to The conquest of the Prince salim and succeeded by a dexterous use of her charms and accomplishments at an entertainment in casting a spell over him. But she was married to Sher-Afghan — Jehangir on his accession — devised, in vain, various expedients to get rid

---

[1] خلاصۃ التواریخ صفحہ ۴۴۲ [2] جہانگیر از گلیڈون صفحہ ۱۱

of Sher Afghan who Killed his assasins, who had been set according to secret imperial order to invade his house at Burdawan at night. The vile crafty lady once more laid her palms to captivate Jehangir and after four years completely succeeded.

آزاد کا بھی بیان سن لیجئے جو انھوں نے کہن سال بزرگوں سے سنا ہے۔ مینا بازار کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"لیکن قابل عبرت وہ معاملہ ہے جو کہن سال بزرگوں سے سنا ہے یعنی یہی مینا بازار لگا ہوا تھا بیگمات پری پھرتی تھیں جیسے باغ میں قمریاں یا ہر یاول میں ہرنیاں جہانگیر ان دنوں نوجوان لڑکا تھا بازار میں پھرتا چمن میں آنکلا ہاتھ میں کبوتر کا جوڑا تھا سامنے کوئی پھول کھلا ہوا نظر آیا کہ عالم سرور میں بہت بھایا چاہا کہ توڑے دونوں ہاتھ رکے ہوئے تھے وہیں ٹھیر گیا سامنے سے ایک لڑکی آئی شہزادے نے کہا بوا ہمارے کبوتر تم لے لو ہم وہ پھول توڑلیں لڑکی نے دونوں کبوتر لے لئے شہزادے نے کیاری میں جاکر چند پھول توڑے پھر کر آیا تو دیکھا کہ لڑکی کے ہاتھ میں ایک کبوتر ہے پوچھا دوسرا کبوتر کیا ہوا؟ عرض کی صاحب عالم وہ تو اڑ گیا۔ پوچھا۔ ہیں! کیوں کر اڑ گیا اس نے ہاتھ بڑھا کر دوسری مٹھی بھی کھول دی کہ حضور یوں اڑ گیا اگرچہ دوسرا کبوتر بھی ہاتھ سے گر گیا مگر شہزادے کا دل اس انداز پر لوٹ گیا۔ پوچھا تمہارا کیا نام ہے؟ عرض کی مہر النساء خانم۔ تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟ عرض کی مرزا غیاث حضور کا ناظم بیوتات ہے ..... وہ سلام کر کے رخصت ہوئی جہانگیر باہر آگیا مگر دونوں کو خیال رہا تقدیر کی بات ہے کہ پھر جو مرزا غیاث کی بی بی بیگم کے سلام کو محل میں جانے لگی تو بیٹی کے کہنے سے اسے بھی ساتھ لیا ..... آہستہ آہستہ آمد ورفت زیادہ ہوئی شہزادے کا یہ عالم کہ جب وہ ماں کے پاس آئے تو وہاں موجود وہ دادی کے سلام کو جائے تو یہ وہاں حاضر کسی نہ کسی بہانے سے خواہ مخواہ اس سے بولتا ..... غرض کہ بیگم تاڑ گئی اور خلوت

میں بادشاہ سے عرض کی۔ اکبر نے کہا کہ مرزا غیاث کی بیوی کو سمجھا دو چند روز لڑکی کو یہاں نہ لائے۔ اور مرزا غیاث سے کہا کہ لڑکی کی شادی کر دو۔"

القصہ یہ تمام واقعات من گھڑت ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ مولوی فریدی اپنے ذیل کے الفاظ میں اس من گھڑت قصہ کی وجہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ عبد الحمید اور دوسرے شاہ جہانی مورخین کے دماغ کی اختراع ہے:

"ملکہ عالیہ نور جہاں بیگم اور شاہ جہاں اعظم کی شکر رنجیوں کا کس کو علم نہیں جب جہانگیر نے جہان کی دار و گیر سے نجات پائی تو اس خاتون اعظم کے اثر و اقتدار کو ملیامیٹ کرنے کے لئے کئی قسم کے افسانے تراشے گئے۔ چنانچہ شیر افگن کا قتل، جہانگیر کا شہزادگی کے زمانہ میں نور جہاں سے تعشق، نور جہاں کا قندھار کے بے آب و گیاہ میدان میں پیدا ہونا ...... وغیرہ سب مورخ ملا عبد الحمید لاہوری اور دوسرے شاہ جہانی مورخین کے دماغ کی اختراع ہے۔"[1]

جہانگیر یا اس کے کچھ بعد کی تصانیف میں کہیں بھی اس قسم کے قصہ کا سراغ نہیں ملتا۔ بلکہ ان تصنیفات میں نور جہاں اور جہانگیر کے متعلق جو معلومات دستیاب ہوتی ہیں وہ بیان کردہ قصہ سے متضاد و برعکس ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جہانگیر خود اپنی تزک میں اس کا ذکر نہیں کرتا۔ اقبال نامہ جہانگیری کا مصنف جو جہانگیر کا ہم عصر اور اس کی خدمت میں ملازم تھا اس قصہ کی حقیقت پر یوں روشنی ڈالتا ہے اس کا بیان ہے کہ شیر افگن کے قتل کے بعد نور جہاں بنگال سے واپس آئی اور شاہی محلسرا میں داخل خدمت ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد جشن نوروز کے وقت جہانگیر نے اسے دیکھ لیا اور اس کے حسن و ادا سے مرعوب ہو کر اسے اپنایا:

"شیر افگن[2] ...... آوارۂ بادیہ عدم گردید بہ حکم اشرف متصدیان صوبۂ بنگال صبیۂ مرزا غیاث بیگ را ...... روانہ درگاہ والا ساختند ...... بالجملہ از نیرنگیہای آسمانی روزی در جشن نوروز جہاں فروز بنظر درآمد آں حضرت مقبول آمدہ در سلک پرستاران حرم سرائے خلافت انتظام یافت۔"

---

[1] نقاد کراچی دسمبر ۱۹۵۲ء صفحہ ۳۱ [2] اقبال نامہ صفحہ ۵۵

ظاہر ہے کہ جہانگیر اور نور جہاں میں تعلقات شیر افگن کے قتل کے بعد پیدا ہوئے۔ اقبال نامہ کے درج کردہ الفاظ کے علاوہ ایسے واقعات وحالات بھی ملتے ہیں جن سے یہ نتیجہ برآمد کیا جاسکتا ہے کہ نور جہاں اور جہانگیر کے متعلق جو روایات شہرۂ آفاق ہیں وہ حقیقت سے متجاوز ہیں۔ ان دونوں کے متعلق لایق اعتبار معلومات جو ہمیں ملتی ہیں وہ یوں ہیں:

اقبال نامہ کا مصنف لکھتا ہے کہ نور جہاں کا دادا خواجہ محمد شریف خراسان کے تاتار سلطان بیگم بیگی کی خدمت میں وزارت کے عہدہ پر مامور تھا سلطان کی موت کے بعد اس کے جانشین قزق خاں کا بھی وہ وزیر رہا اور اس کے بعد شاہ طہماسپ کی خدمت میں داخل ہوا۔ شاہ نے اسے یزد کا وزیر متعین کیا ۱۵۷۶ء میں خواجہ شریف کی موت کے بعد اس کے کنبہ پر ایک آسمان ٹوٹ پڑا اس کا لڑکا غیاث بیگ ناسازی زمانہ سے تنگ آکر تلاش معاش میں ہندوستان کی طرف چلا۔ اس وقت اس کے ساتھ اس کی بیوی دو لڑکے محمد شریف اور ابوالحسن اور بڑی لڑکی ساتھ تھے چونکہ راستہ خطرناک تھا اس لئے ایک قافلہ کے ہمراہ جس کا قافلہ سالار ملک مسعود نامی تاجر تھا ہندوستان کا رخ کیا ناچاکیٔ فلک نے یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا غیاث کا بیشتر مال ڈاکوؤں اور قزاقوں کی نذر ہوا۔ قندھار پہنچا تو لڑکی پیدا ہوئی لیکن ان میں اتنی استعداد نہ تھی کہ اس نوزائیدہ بچہ کی پرورش کرسکیں۔ افلاس اور گردش فلک نے ماں کی ممتا کو بھی مغلوب کرلیا تھا۔ غیاث بیگ نے بچہ کو راستہ ہی میں چھوڑا لیکن ابھی دو قدم بھی نہ چلے تھے کہ ماں کی ممتا نے پکارا باپ کا دل دہل گیا۔ غیاث پھر واپس ہوا اور دیکھا کہ بچی کی حفاظت کے لئے قدرت نے ایک اژدہے کو وہاں بھیجا ہے جو اس کے گرد حلقہ کئے بیٹھا ہے غیاث نے اپنی تلوار سے اس کا کام تمام کیا اور بچی کو سینہ سے لگالیا۔ ملک مسعود کو ان کی بےکسی اور لاچاری پر ترس آیا اور اس نے ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ قافلہ بڑھتا گیا مسعود اور غیاث میں دوستانہ تعلقات پیدا ہوگئے۔ ملک مسعود اکبر کا منظور نظر اور عنایت یافتہ تھا اس نے غیاث بیگ اور اس کے لڑکے ابوالحسن کو اکبر کی خدمت میں پیش کیا جہاں ان کی قسمت چمکی

اکبر نے انھیں اپنی خدمت میں داخل کیا۔ یہی مورخ مزید لکھتا ہے کہ جب کبھی ملک مسعود اکبر کی خدمت میں حاضر ہوتا اکبر کسی عمدہ اور بہترین تحفہ کی توقع کرتا۔ اس وقت بھی اکبر نے ملک مسعود سے دریافت کیا کہ ملک مسعود کون سا تحفہ خدمت شاہی میں لایا ہے چنانچہ مسعود نے غیاث اور ابو الحسن کو پیش کیا اور ان کی لیاقت شرافت اور دیانت کی تعریف کی[1]

"بعدہ ملک مسعود کہ در خدمت عرش آشیانی در شناسی و آبرو داشت ہمیشہ تحف و ہدایا آوردہ

شرف اندوز ملازمت میگردید"...... عرش آشیانی فرمودند کہ این دفعہ خلاف سالہای

دیگر تحفہ قابل سرکار نیاوردہ در جواب التماس نمود کہ کدام تحفہ نزد ماکہ پاس فروشان لایق

این درگاہ آسمان بارگاہ می تواند بود اما دریں سفر دو سہ جواہر بے بہا جاندار آوردہ اند"

خدمت شاہی میں داخل ہونے کے بعد غیاث بیگ نے اپنی لیاقت کے جوہر دکھائے اور بادشاہ سے آفریں حاصل کی۔ اکبر اس کے کارناموں سے خوش ہو کر اسے معزز عہدہ دیتا گیا حتیٰ کہ ۱۵۹۵ء میں اکبر نے اسے کابل کا دیوان مقرر کیا اسی دوران میں علی قلی خاں استجلو جو ایران کے شاہ اسماعیل ثانی کا سفرہ چی تھا اکبر کی خدمت میں داخل ہوا اس کی قابلیت اور جوانمردی سے خوش ہو کر اکبر نے غیاث کی لڑکی مہر النساء سے اس کا بیاہ کر دیا۔ جہانگیر نے اپنے دوران حکومت میں علی قلی استجلو کو اس کی جوانمردی سے متاثر ہو کر اسے شیر افگن کا خطاب دیا اور بنگال میں جاگیر دے کر وہاں روانہ کیا۔ بنگال میں شیر افگن اور مہر النساء مسرت کی زندگی گذار رہے تھے شیر افگن کے بدخواہوں نے جہانگیر کو اس کے خلاف اکسایا اور یہ بات اس کے گوش گذار کی کہ وہ بنگال میں نافرمانبرداری کر رہا ہے۔ اس وقت بنگال ان افغانوں کا مرکز بنا ہوا تھا جو مغلیہ حکومت کی بیخ کنی کے منصوبے لئے ہوئے تھے جہانگیر نے یہاں کے حالات کو خوش گوار اور سازگار بنانے کی خاطر قطب الدین خاں کوکلتاش کو کہ کو بنگال کا صوبہ دار بنا کر روانہ کیا اور یہ بھی کہا کہ شیر افگن کے متعلق کوئی شبہ ہو تو اسے پند و نصائح سے

---

[1] منتخب اللباب ص

راہ راست پر لائے اگر وہ نافرمانی کرے تو اسے ہماری خدمت میں روانہ کر دے۔ قطب الدین سیاست کے میدان میں اتنا کامل نہ تھا اس نے کوتاہ اندیشی سے کام لیا اور غلط پالیسی اختیار کر کے چند مسلح سپاہیوں کے ہمراہ شیر افگن کی جاگیر میں داخل ہوا اور اسے طلب کیا شیر افگن اس بات سے سخت متعجب ہوا کہ قطب الدین یکایک بغیر اطلاع کے سپاہیوں کا دستہ لے کر اس کی جاگیر میں کیوں کر داخل ہوا۔ اسے شبہ ہوا کہ ضرور کوئی بات ہے۔ شیر افگن بھی مع ایک دو سپاہیوں کے قطب الدین کی ملاقات کو بڑھا لیکن قطب الدین کے سپاہیوں نے اسے گھیر لیا۔ شیر افگن کو حالات خطرناک معلوم ہوئے قطب الدین نے دورانِ گفتگو میں غیر عاقلانہ رویہ اختیار کیا جو شیر افگن کو پسند نہ آیا کیوں کہ اس قسم کے رویہ سے اس کی عزت و حرمت کو سخت چوٹ آئی اب اس کے لئے یہاں سے مار کر یا مر کر نکل جانے کے سوا کوئی راستہ سامنے نہ تھا لہٰذا اس نے قطب الدین پر اپنی تلوار سے کچھ ایسے وار کئے کہ اس کی آنتیں باہر نکل پڑیں اور وہ زمین پر گر پڑا۔ انبہ خاں کشمیری نے جو قطب الدین کا وفادار اور جاں نثار نوکر تھا شیر افگن کے سر پر وار کئے۔ شیر اپنے زخموں کے باوجود اس پر ٹوٹ پڑا اور اس کا کام تمام کیا۔ سپاہیوں نے جو اس وقت اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے اس پر پے در پے وار کئے اور اسے قتل کر ڈالا۔[1]

شیر افگن کی موت کے بعد اس کے مکان میں ایسا کوئی فرد نہ تھا جو پس ماندگان کو سنبھالتا لہٰذا شاہی فرمان کے مطابق نور جہاں کو شاہی محل میں داخل کر دیا گیا جہاں وہ جہانگیر کی والدہ کی خدمت میں داخل ہوئی۔ مارچ ۱۶۱۱ء میں جہانگیر نے اس ماہ رو کو جشن نوروز کے وقت دیکھا مہر النساء کا حسن اسے اتنا بھایا کہ وہ اس پر فریفتہ ہو گیا اور دوسرے ہی مہینہ میں اس سے شادی کر لی۔[2]

جہانگیر کے حبالۂ نکاح میں آنے کے بعد مہر النساء نے جو ترقی کی وہ ہر شخص جانتا ہے۔ معتمد خاں یوں رقمطراز ہے:

"دانا تانا پایۂ عزت و قبول ارتقاد اعتلا پذیرفت نخست نور محل نام کردند و پس از دو زی چند خطاب

[1] منتخب اللباب صہ ۵۶ [2] ایضاً

نورجہاں بیگم عنایت شد۔ جمیع خویشاں و منتسبان او بانواع مراحم و نوازش اختصاص یافتند۔ شعر

کنند خویش و تبار تو ناز وی زیبد بحسن یک تن اگر یک قبیلہ ناز کند

نورجہاں کا اقتدار اس سے زیادہ بلند کیا ہو سکتا ہے کہ اس کا نام جہانگیری عہد کے سکوں پر منقش ہوا یہ شعر جس میں اس کا نام ہے سکوں پر منقش کیا گیا: شعر

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور بنام نورجہاں بادشاہ بیگم زد

تاریخی حقائق

(حضرت مولانا کشمیری رح کے فضل وکمال کے بعض گوشے)

از

(مولانا محمد ظفیر الدین مفتاحی دارالعلوم معرسانحہ ضلع مونگیر)

"حیات انور" جب ملی تو میں نے خصوصی طور پر اس کا مطالعہ شروع کیا اس لئے اور بھی کہ ایک مدرس کی زندگی تھی، جو اپنے وقت کا بڑا محدث اور بے نظیر فقیہ گذرا ہے۔ دوران مطالعہ میں بعض واقعات نے قلب و دماغ کو کافی متاثر کیا، سوچا آج کل کے مدرسین کے لئے یہ واقعات راہبر کا کام دیں گے۔ چنانچہ ان پر نشان ڈالتا گیا، آج کی فرصت میں انہی میں سے چند حاضر خدمت ہیں۔ خدا کرے علماء کرام اور دوسرے اہل علم ان کو پڑھیں۔ واللہ الموفق والمعین (ظفیر صدیقی)

حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی علمی زندگی تھی، کتب بینی اور مطالعہ کا آپ کو بے حد شوق تھا، لکھا ہے۔

"بیشتر متقدمین کی کتب زیر مطالعہ ہوتی تھیں، حافظ ابن قیم رح، حافظ ابن دقیق العید رح اور اسی قسم کے لوگوں کی کتابیں جو جدید طبع ہو کر آتی تھیں ان کو بڑے شغف کے ساتھ مطالعہ فرماتے تھے اور جس کتاب کے جدید طبع ہونے کا علم ہوتا، فوراً اس کے حصول کی کوشش فرماتے اور حاصل کر لیتے"[1]

ذوق وشوق کا عالم دیکھ رہے ہیں، آہ متقدمین اور مستند مصنفین کی کتابوں کا ذوق اب کہاں باقی رہا۔ یہاں حال یہ تھا کہ جہاں معلوم ہوا کہ فلاں اچھی کتاب طبع ہوئی اور

---

[1] حیات انور صفحہ ۳۴۰

بے چینی شروع ہو گئی اور جب تک حاصل نہ ہوئی اطمینان نہ ہوا، مگر اب ہمارا یہ دور ہے کہ چند گنے چنے کو چھوڑ کر مطالعہ کا ذوق ناپید ہے۔ اب تو مدرسوں میں متقدمین کی کتابیں کیڑوں کی خوراک بن جاتی ہیں اور ہمارے اساتذۂ کرام کو احساس تک نہیں ہوتا۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ عموماً مدرسین ابن القیم اور دقیق العید کو جانتے بھی نہیں، بڑا ذوق ہوا تو بعض اخبار کی سرخی پر نظر ڈال لی اور زیادہ سے زیادہ اردو کی کوئی تصنیف، دعا ہے

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل　　اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں جو کتابیں قلمی تھیں اور مطبوع شکل میں نہ ملتی تھیں، ان کی طباعت کا آپ کو بڑا خیال تھا۔ آپ کے ایک شاگرد کا بیان ہے۔

"تفسیر مظہری کے طبع کے انتظام کی طرف اکثر لوگوں کو توجہ دلاتے تھے اور بہت تعریف فرمایا کرتے تھے اور تمنا تھی کہ یہ تفسیر کسی طرح طبع ہو کر وجود میں آجائے۔"[1]

قلمی شکل میں آپ نے پڑھی ہو گی، مگر کتاب کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ ہر مدرس اور عالم پڑھے۔ اس لئے طباعت کا یہ اشتیاق تھا۔ مگر اب جبکہ یہ کتاب چھپ چکی ہے، ناشر سے پوچھئے اس کی بکری کا کیا حال ہے، علماء کرام کو خیال تک نہیں ہوا کہ یہ موقع غنیمت ہے اس طرح کی کتابیں بار بار نہیں چھپا کرتیں، آپ زندہ ہوتے تو کتنی خوشی ہوتی کہ دیرینہ تمنا بر آئی، مگر آہ ہمارے نوجوان علماء کو احساس تک نہیں۔

تبحر علمی اور ذوق کا عالم یہ تھا کہ مولانا کشمیری رح نے

"خاتم النبیین ۴۸ گھنٹے کی میعاد میں اس طرح تحریر فرمایا کہ ایک ساعت بھی بستر پر کمر سیدھی نہ فرمائی اور اس ۴۸ گھنٹے کی مدت میں حسب معمول درس بخاری بھی مدرسہ کے اوقات میں جاری رہا اور ایک منٹ نیند نہیں فرمائی۔"[2]

آہ اب یہ ذوق و شوق علماء کرام میں کہاں رہا۔ اس مستعدی سے کام کرنے والا

---

[1] حیات انور ص ۳۴۱　[2] ایضاً ص ۳۴۲

ڈھونڈے شاید ہی ملے، اہل علم میں شمار ہونے والوں کا حال یہ ہے کہ وہ عوام کی طرح اپنے بیش قیمت اوقات بے کار باتوں میں ضائع کر دیتے ہیں اور ان کو احساس تک نہیں ہوتا۔ ع

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

حضرت کشمیریؒ ایک دفعہ ملتان جیل میں مفتی کفایت اللہ صاحب سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے، وہاں بھی علمی تذکرہ چھڑ گیا۔ اسی موقع سے ترغیب کے پیرایہ میں آپ نے یہ واقعہ سنایا۔

"حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کو حکومت نے جب جیل بھیجا تو آپ سے دریافت کیا کہ شاگردوں میں کون صاحب زیادہ محبوب ہیں؟ آپ نے حافظ ابن قیمؒ کا نام لیا، ان کو بھی ساتھ ہی نظر بند کر دیا گیا، پوچھا کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہئے، آپ نے کاغذ، قلم، دوات طلب کی، یہ سامان دے دیا گیا۔ آپ نے لکھ لکھ کر سب کاغذ ختم کر دیئے، اس کے بعد جیل کی دیواروں پر لکھنا شروع کر دیا"[1]

یہ علمی ذوق تھا ہمارے بزرگوں اور علماء کرام کا کہ ان کی کوئی مجلس علمی تذکروں سے خالی نہ ہوتی، مگر آہ آج نوجوان علماء کرام ہیں جو بالکل برعکس واقع ہوئے ہیں ان کی کسی بھی مجلس میں علمی باتیں نہیں ہوتیں، وہی غیبت، عیب جوئی اور واہی تباہی گفتگو، علمائے سلف کا یہ واقعہ ہمارے لئے سراپا عبرت ہے کہ ان کا علمی ذوق کتنا بلند اور ان کی زندگی کس قدر کارآمد تھی، کاش ہم اس طرح کے واقعے سے اپنی زندگی میں کوئی انقلاب محسوس کرتے۔

مولانا انوری لائل پوری مدظلہم کا بیان ہے۔

"حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت کے لئے حضرت کے آستانہ پر حاضر ہوا، دیکھا علماء وصلحاء کا عظیم اجتماع ہے۔ گرمی کا وقت ہے، ایک بزرگ چھت کے پنکھے کا رسہ کھینچ رہے ہیں اور نرم نرم مترنم آواز میں فرما رہے ہیں بھائی بیٹھ جاؤ... ہوا لگنے دو، وہ بزرگ حضرت شاہ صاحب

[1] حیات انور ص۳۳

قدس سرہ تھے" [1]

بایں ہمہ فضل وکمال حضرت مولانا کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی یہ خدمت گذاری اور اپنے استاذ محترم کا یہ ادب؟ قربان جائیے ہمارے ان علماء کرام پر، فرمایا جائے اب یہ خوبی باقی رہی؟ سچ کہا گیا ؎

تجھے آباء سے اپنے، کوئی نسبت ہو نہیں سکتی　　　که تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیارہ

درسیات کی فراغت کے بعد حضرت مولانا کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ دنوں مدرسہ امینیہ دہلی میں مدرس کا کام کیا تھا، اس زمانہ کا ایک واقعہ حضرت راوی کے پوری بیان فرماتے ہیں۔

"حضرت شاہ صاحب ڈیڑھ پیسہ کی روٹی منگا کر کھایا کرتے تھے، سارا دن درس متعدد علوم وفنون کا دیتے، دوپہر کو شدت گرما میں کتب بینی فرماتے، جب کہ ہر شخص دوپہر کی نیند کے مزے لیتا ہوتا تھا، موسم سرما میں دیکھا گیا ہے کہ بعد نماز عشاء صبح صادق تک مطالعہ فرما رہے ہیں ... مغرب سے عشاء تک ذکر ومراقبہ میں مشغول رہتے۔" [2]

علوم وفنون میں انہماک دیکھ رہے ہیں، کہ نہ دن میں آرام اور نہ رات کو چین ہے جب دیکھئے کتب بینی میں مشغول، اور پھر کمال یہ کہ ذکر ومراقبہ بھی ناغہ نہیں ہے، یہ ایک نوجوان عالم کا حال ہے، جو ایک نئے مدرسہ میں مدرس کی حیثیت سے زندگی گذار رہا ہے، بتائیے پھر وہ اپنے وقت کا ابن حجر کیوں نہ ہوتا۔

اب یہ محنت اور شوق کہاں ہے؟ مدرسین کتب بینی کو سرے سے اہمیت ہی نہیں دیتے الٹا سیدھا جو آیا پڑھا دیا۔ حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اہل علم ہونے کے ساتھ اہل دل بھی تھے مولانا طیب صاحب جیسے ذمہ دار کا بیان ہے۔

"درس میں بعض اوقات غایت خشیت سے آنکھوں میں نمی آجاتی، جسے ضبط کرنے کی کوشش کرتے۔ انشاد قصائد اور وعظ میں خوف وخشیت کے اشعار تر آنکھوں کے ساتھ پڑھتے۔

---

[1] حیات انور ص ۲۰ [2] ایضاً ص ۲۰

جس سے چہرہ مظہر خشیت الٰہی نظر آتا تھا۔ ۱؎

مدرس جب اہل دل ہو اور اس پر خشیت الٰہی کا ایسا نمایاں اثر ہو، پھر طلبہ اس کے درس میں بیٹھ کر فیض یاب نہ ہوں، غیر ممکن ہے، ہمارے اساتذہ کرام صرف ظاہری ہی علم کے شہسوار نہ تھے بلکہ باطنی علوم میں بھی کمال رکھتے تھے، مگر کیسے یقین دلایا جائے کہ اب یہ خوبیاں ناپید ہوتی جارہی ہیں اور حد یہ ہے کہ اس کی طرف سے بے حسی بھی بڑھتی جارہی ہے۔

علم کا حسنِ ادب جیسا مولانا کشمیری میں تھا اب دیکھنے میں نہیں آتا، مولانا طیب صاحب ہی کا بیان ہے کہ۔

"خود ہی فرمایا کہ میں مطالعہ میں کتاب کو اپنا تابع کبھی نہیں کرتا، بلکہ ہمیشہ خود کتاب کے تابع ہو کر مطالعہ کرتا ہوں" آگے اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہیں ——— "چنانچہ سفر و حضر میں ہم لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ لیٹ کر مطالعہ کر رہے ہوں یا کتاب پر کہنی ٹیک کر مطالعہ میں مشغول ہوں، بلکہ کتاب کو سامنے رکھ کر مودب انداز سے بیٹھتے، گویا کسی شیخ کے آگے بیٹھے ہوئے استفادہ کر رہے ہیں ——— خود ہی یہ بھی حضرت شاہ صاحب نے فرمایا ——— میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک دینیات کی کسی کتاب کا مطالعہ بے وضو نہیں کیا۔" ۲؎

اللہ اکبر یہ تھا کتابوں کا ادب اور احترام۔ ہمارے اس زمانہ میں تو یہ حسن ادب عنقا ہے، کاش ہمارے عزیز طلبہ اور محترم علماء کرام اس سے سبق حاصل کرتے اور اپنے فرائض کا احساس کرتے اور غالباً انہی چیزوں کے ترک کا نتیجہ ہے کہ علوم و فنون میں خود کمال ناپید ہوتا جارہا ہے۔

حضرت مولانا کشمیری رحمتہ اللہ علیہ بے نظیر حافظہ کے مالک تھے، جس چیز کو

۱؎ حیات انور ص ۲۳۲ ۲؎ ایضاً ص ۲۳۲

ایک دفعہ دیکھ لیتے برسوں کے لئے حافظہ کے خزانہ میں محفوظ ہو جاتی، مگر با ایں اہم کتابوں کا بار بار مطالعہ فرماتے اور ہر دفعہ اسی کتاب سے نئی نئی تحقیق فرماتے، آپ کے ایک شاگرد کا بیان ہے۔

"ایک دفعہ (حضرت محدث کشمیری نے) فرمایا کہ فتح الباری کا (جو تیرہ جلدوں کی کتاب ہے) تیرھویں مرتبہ مطالعہ کر رہا ہوں اور یہ بھی فرمایا کہ میں درس کے لئے کبھی مطالعہ نہیں دیکھتا، مطالعہ کا مستقل سلسلہ ہے اور درس کا مستقل۔"[1]

فرمائیے اب یہ ذوق اور یہ محنت علماء کرام میں باقی رہی ہے؟ کیا یہ درست نہیں کہ بڑے بڑے نامی گرامی کا علم سنا سنایا ہے۔ تحقیق کی توفیق کہاں باقی رہی، اب تو ہمارے نوجوان علماء فتح الباری کو صرف نام ہی کی حد تک جانتے ہوں تو جانتے ہوں، شاید ایک جلد بھی کسی نے از اول تا آخر دیکھی ہو، تیرہ تیرہ جلدوں کا پڑھ جانا اور وہ بھی ایک دو مرتبہ نہیں، تیرہ تیرہ مرتبہ، آج کل ذہن میں بھی نہیں آسکتا، مگر کیسے بتایا جائے کہ محققین کا یہی دستور رہا ہے اور جو لوگ ہیں ان کا یہی دستور ہے اور جب تک یہ ذوق و شوق نہیں پیدا ہوتا، علم سے بھی محرومی ضروری ہے۔

حضرت مولانا طیب صاحب مدظلہ، فرماتے ہیں۔

"آپ (یعنی حضرت محدث کشمیریؒ) نے بامتثال اکابر دار العلوم میں درس شروع فرما دیا البتہ غلبۂ زہد و قناعت سے مشاہرہ لینے پر راضی نہ ہوئے اور لوجہ اللہ کام شروع کر دیا۔"[2]

واقعہ ہے عالمانہ شان ہمارے اسلاف ہی کی حد تک ختم ہو گئی، اب یہ شان کہاں دیکھنے میں آتی ہے، اب تو ہم لوگ صرف روپیہ کے نام پر پڑھاتے ہیں، اگر اس سلسلہ میں کوئی بات آپڑے، کام بند کر دیں اور وہاں یہ عالم کہ اصرار پر بھی تنخواہ قبول نہیں کی جاتی، اسی حیات انور سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دس گیارہ برس یونہی بغیر

---

[1] حیات انور ص۲۰۲ [2] ایضاً ص۲۰۳

مشاہرہ حسبتہً للّٰہ درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، اس طرح کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسین پہلے زمانہ میں اپنے کو نوکر سمجھ کر کام نہیں کرتے تھے بلکہ دین کا خادم سمجھ کر، اگو ضرورتاً تنخواہ بھی لیا کرتے تھے، جس کی شرعاً اجازت ہے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہ اپنی شادی کی شرکت کا واقعہ بیان کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحب کے متعلق فرماتے ہیں۔

"تھوڑی دیر چلنے کے بعد ہی یکہ رکوایا اور پا پیادہ ہو گئے، چلچلاتی دھوپ پڑ رہی ہے اور لو چل رہی ہے، چاروں طرف سے مٹی کے تودے ہیں کہ فضا میں گشت لگاتے پھر رہے ہیں اور اسی عالم میں حضرت شاہ صاحب منہ اور کانوں کو رومال لپیٹے ہوئے حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل پڑھتے ہوئے قدم بڑھائے اعتماد پور کی آبادی کی طرف چلے جا رہے ہیں، آخر خدا خدا کرکے مقام آیا"

یہ ہے اپنے وقت کا بے نظیر محدث اور فقیہ اور دارالعلوم دیوبند کا صدر نشین، موقع آیا تو آگ لگنے والی فضا میں بھی پیدل چلنے سے نہ ہچکچایا، اب ہمارے نوجوان علماء کرام میں یہ جفاکشی کہاں ہے؟ ضرورت ہے کہ موجودہ علماء کرام اپنے شاگردوں میں جفاکشی کے جذبات پیدا کریں جس کی اس دور میں بڑی ضرورت ہے۔

حضرت کشمیری رحمتہ اللہ علیہ سب کچھ ہونے کے باوجود بڑے خوددار بھی تھے مولانا اکبر آبادی نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ دہلی میں نظام حیدر آباد سے حضرت کی ملاقات ہوئی اس پر ایک مقامی اخبار مہاجر نے ملاقات کا عنوان "بارگاہ خسروی میں حضرت علامہ کشمیری کی باریابی" یا اسی طرح کا کوئی اور عنوان تحریر کرنا چاہا، مولانا کو معلوم ہوا

"تو حد درجہ برہم اور خفا ہوئے اور فرمایا کہ میں ہر چند ایک مرد بے مایہ و بے بضاعت ہوں لیکن اتنا منکسر المزاج بھی نہیں کہ یہ عنوان گوارا کر لوں، کیسی بارگاہ خسروی اور کیسی اس میں باریابی؟ صاف لکھئے، نظام اور انور شاہ کی ملاقات" [۱]

---

[۱] حیات انور ص۱۷۲

اعتدال اسی کا نام ہے، خواہ مخواہ کی منکسر المزاجی مفید نہیں بلکہ ہر اعتبار سے مضر ہی ہے، حق یہ ہے کہ محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عالمانہ شان یہاں بھی باقی رکھی اور ہر عالم کو یہی طرزِ زندگی اختیار کرنی چاہیئے، جو لوگ مال داروں اور حکمراں طبقے کے مقابلہ میں اس طرح کے عنوان کو پسند کرتے ہیں وہ اس واقعہ سے سبق حاصل کریں ؎

نہیں یہ شانِ خودداری، چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے، کوئی زیبِ گلو کر لے

ایک دفعہ حضرت شاہ صاحبؒ حیدر آباد تشریف لے گئے، نظام کے ایما سے لوگوں نے چاہا کہ آپ نظام سے ملنے تشریف لے چلیں مگر یہ کہہ کر کہ "مجھے ملنے میں عذر نہیں لیکن اس سفر میں نہیں ملوں گا"

"شاہ صاحب کسی طرح رضامند نہیں ہوئے" [1]

اب یہ عالمانہ شان و شکوہ کہاں باقی رہا اور کس کو احساس ہے کہ ایک عالم کو کس طرح زندگی گذارنی چاہیئے۔

لکھا ہے اسی قیام حیدر آباد میں ایک دن سر اکبر حیدری کا ٹیلیفون آیا کہ میں مولانا انور شاہ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں چنانچہ یہ خبر شاہ صاحب کو پہنچائی گئی، آپ نے یہ سنکر فرمایا

"میں تو یہیں ہوں، ابھی کہیں جانا نہیں، حیدری صاحب آنا چاہتے ہیں تو آجائیں"

حیدری صاحب نے جب یہ جواب سنا تو پھر ٹیلیفون پر کہا حاضر ہوتا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ جب میں پہونچوں تو مجلس سے لوگوں کو اٹھا دیا جائے، حضرت محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کو جب یہ شرط سنائی گئی تو آپ نے فرمایا۔

"یہ ناممکن ہے کہ میں حیدری صاحب سے باتیں کرنے کے لئے حاضرین مجلس کو چھوڑ کر الگ ہو جاؤں، یا ان لوگوں سے کہوں کہ الگ چلے جائیں" [2]

---

[1] حیات انور [2] ایضاً ص ۱۷۵

اس محدثانہ شان پر قربان جائیے، آپ نے وہی کیا جو کرنا چاہئے اور یہ کر کے اپنے ماننے والوں اور شاگردوں کے لئے ایک عمدہ نمونہ چھوڑ گئے، کاش نوجوان علمار سمجھتے اور اپنے مرتبہ کی بلندی کا یقین پیدا کرتے۔

حضرت محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ علم و فضل میں جس قدر سربلند تھے اسی تناسب سے رب العزت نے آپ کو مکارم اخلاق سے بھی نوازا تھا، مولانا اکبرآبادی مدظلہٗ نے لکھا ہے۔

"میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کوئی سائل حضرت الاستاذ کے پاس آیا ہو اور وہ نامراد گیا ہو، جیب میں اس وقت جو کچھ ہوتا، روپیہ ہو یا اٹھنی، سائل کے حوالہ کر دیتے، ایسی بات کہنے سے احتراز فرماتے تھے، جس سے کسی کی دل آزاری ہو" [۱]

جو لوگ کہتے ہیں کہ مولوی بخیل ہوتے ہیں، وہ دیکھیں کہ داد دہش میں بھی یہ کتنے وسیع [illegible]ق ہوتے ہیں، جو سائل کو روپیہ اٹھنی دیتا ہو، وہ دوسرے ضرورت مندوں کی احتیاج کا کس قدر خیال کرتے ہوں گے؟ اسی ایک واقعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ صرف بڑے عالم ہی نہ تھے، بلکہ عمل میں بھی اپنی آپ مثال تھے، مولانا منظور نعمانی مدظلہٗ فرماتے ہیں۔

"مگر حضرت استاذ قدس سرہ کو الحمد للہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے غیبت سے زبان کو ایسا محفوظ کیا تھا کہ کبھی اشارۃً کنایۃً بھی غیبت کی قسم کی کوئی بات سننا یاد نہیں، بلکہ یہ یاد ہے کہ حضرت کے سامنے کسی نے غیبت کی قسم کی کوئی بات شروع کی اور حضرت نے فوراً روک دیا۔" [۲]

غیبت کی قسم کی بات سے اپنے آپ کو ہر طرح محفوظ رکھنا کوئی معمولی بات

حیات انور ص ۱۷۰ [۱] ایضاً ص ۱۵۹ [۲]

نہیں ہے آج کل یہ مرض، وبا کی طرح پھیل پڑا ہے، جس سے اچھے اچھے حضرات محفوظ نہیں علماء کرام کے لئے بھی اس واقعہ میں بڑا سبق ہے، واقعہ بھی یہی ہے کہ اہل علم کی مجلس کو ان لایعنی باتوں سے قطعاً پاک ہونا چاہئے اور ہر مسلمان کو اس بڑے گناہ سے بچنا چاہئے۔

محدث کاشمیری رحمتہ اللہ علیہ کا حافظہ زبان زد عام وخاص ہے ایک دفعہ آپ نے حافظہ کے انحطاط پر تاسف کے لہجہ میں فرمایا۔

"پہلے مرا یہ حال تھا کہ اگر آج ایک مضمون متعدد کتابوں میں دیکھوں اور مجھے ان کتابوں کی عبارتیں نقل کرنی ہوں لیکن کسی وجہ سے آج نقل نہ کرسکوں اور کل بھی موقع نہ ملے تو پرسوں تک بھی اس پر قدرت رہتی تھی کہ ہر کتاب کی اصل عبارت صفحہ کے حوالہ کے ساتھ دوبارہ کتاب دیکھے بغیر نقل کرسکتا، اب ... صبح کی دیکھی عبارتیں شام تک نقل کرسکتا ہوں"[1]

یہ اللہ تعالیٰ کی خاص دین تھی، جو ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتی، یہ تو اصل عبارت نقل کرنے کی بات تھی مگر مباحث یاد رکھنے کا جہاں تک تعلق ہے اس کے متعلق حضرت مولانا مدنی مدظلہ کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیں۔

"مجھ سے حضرت شاہ صاحب رح فرماتے تھے جب میں کسی کتاب کا سرسری نظر سے مطالعہ کرتا ہوں اور اس کے مباحث کو محفوظ رکھنے کا ارادہ بھی نہیں ہوتا، پھر بھی پندرہ سال تک اس کے مضامین مجھے محفوظ رہ جاتے ہیں"[2]

اللہ اکبر بغیر ارادہ اور سرسری دیکھی ہوئی چیز بھی جب پندرہ پندرہ سال تک محفوظ رہتی ہو تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جو چیز گہری نظر سے دیکھی جاتی ہوگی اور اس کے محفوظ رکھنے کا ارادہ رکھا جاتا ہوگا وہ کب تک یاد رہتی ہوگی۔

بخاری شریف کے متعلق مولانا منظور صاحب مدظلہ کا بیان ہے کہ حضرت کشمیری رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔

---

[1] حیات انور ص۱۳۷ [2] ایضاً ص ۱۲

"میں نے غور و فکر کے ساتھ صحیح بخاری کے صرف متن کا تیرہ دفعہ بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، شروح یا حواشی کا جو مطالعہ کیا ہے، وہ اس کے علاوہ ہے۔" [۱]

اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بخاری آپ کو کتنی مستحضر رہی ہو گی اور آپ کو اس کتاب جلیل پر کیسا عبور حاصل رہا ہو گا اور پھر ان کے نکات پر کیسی دقیق نظر ہو گی۔ ہمارے وہ علماء کرام جو محنت سے جی چراتے ہیں وہ سوچیں کہ جو عالم ضرب المثل حافظہ کا مالک تھا، اس کے مطالعہ کا جب یہ حال تھا تو ہم کم زور حافظہ والوں کو کتنی محنت کی ضرورت ہے۔

قرآن پاک کے باب میں حضرت محدث کشمیری رحمتہ اللہ علیہ نے ایک دفعہ فرمایا

"میں رمضان المبارک میں قرآن مجید شروع کرتا ہوں اور تدبر و تفکر کے ساتھ اس کو پورا کرنا چاہتا ہوں لیکن کبھی پورا نہیں ہوتا، جب دیکھتا ہوں کہ آج رمضان المبارک ختم ہونے والا ہے تو پھر اپنے خاص طرز کو چھوڑ کر جو کچھ باقی ہوتا ہے اس دن ختم کر کے دور پورا کر لیتا ہوں۔" [۲]

آہ اب تو ذوق و شوق کے ساتھ قرآن پڑھنے کا احساس بھی کم ہی لوگوں کو ہوتا ہو گا، غور و فکر تو دور کی بات ہے، بلکہ اگر کہا جائے کہ کتنے دین دار قسم کے مسلمان رمضان میں قرآن پاک کو چھوتے بھی نہیں تو غالباً کوئی تعجب انگیز بات نہ ہو گی البتہ نماز میں پڑھ لیتے ہیں، کم و بیش یہی حال ہمارے نئے علماء کرام کا ہے۔

حضرت محدث کشمیری رحمتہ اللہ علیہ کو رب العالمین اور رحمۃ للعالمین کے ساتھ خاص قلبی تعلق تھا جس کو وہ عموماً چھپانے کی سعی فرماتے۔

حضرت مولانا گیلانی مدظلہ نے اپنا چشم دید واقعہ بیان کیا ہے۔

"رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر پر وہ اپنے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی قوت کھو چکے تھے

---

[۱] حیات انور ص ۱۳۲ [۲] حیات انور ص ۱۳۳

ذکر مبارک آتا تو آواز بھرا جاتی اور خاص حال میں طلبہ سے فرماتے کہ جاؤ! انہی کے دین کی خدمت کو زندگی کا نصب العین بنالینا۔"[1]

اللہ اللہ یہ تھا تعلق رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے، کاش ہمارے زمانہ کے علماء کرام سمجھتے اصل زندگی اسی کا نام ہے، جس میں سوز و گداز نہیں، اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ والہانہ تعلق نہیں، وہ زندگی ہی کیا، کتابوں کے عالم تو بڑے بڑے نامور غیر مسلم بھی ہوتے ہیں، مسلمان اور پھر عالم جو ہو اس کو تو علم سے زیادہ عمل کا لحاظ چاہیئے اور دین سے شغف۔

حضرت مولانا گیلانی مدظلہ فرماتے ہیں۔

"میرا اندازہ تھا کہ مجموعی طور پر نصف لاکھ یعنی چالیس پچاس ہزار سے کم تعداد ان عربی اشعار کی نہ ہوگی، جو شاہ صاحب کو زبانی یاد تھے، جنھیں جس وقت جی چاہتا، وہ سنا سکتے تھے۔"[2]

آجکل کے جو لوگ اردو، فارسی کے چند سو اشعار کی یاد پر خوشی سے پھولے نہیں سماتے وہ آنکھیں کھول کر پڑھیں اور وہ علماء کرام بھی اس واقعہ کو خصوصی طور پر پڑھیں جن کو ادب عربی سے کوئی ذوق ہی نہیں، بلکہ اسے ایک لایعنی چیز سمجھتے ہیں، اب تو کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ نصاب سے عربی ادب کی کل کتابیں نکال ڈالی جائیں، صرف قرآنی ادب کی دو ایک نئی کتاب پڑھا دی جائے اور بس اور غالباً اسی کا نتیجہ ہے کہ نئے فارغ شدہ علماء کرام کسی عربی کتاب کے مطالعہ پر قدرت نہیں رکھتے۔

حضرت محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا درس بڑا تحقیقی ہوا کرتا تھا، سامنے کتابوں کا انبار رہتا، آپ تقریر کرتے جاتے اور طلبہ کو کتابیں کھول کھول کر دکھاتے جاتے، دیکھو جو میں کہتا ہوں اسے فلاں نے اس طرح لکھا ہے اور فلاں نے یوں بیان کیا ہے، جس سے طلبہ میں تحقیق کا بڑا اچھا خاصا ذوق پڑھنے کے زمانہ ہی سے پیدا ہونے لگتا۔

---

[1] حیات انور ص ۱۳۳ [2] ایضاً ص ۳

حضرت مولانا گیلانی مدظلہٗ نے لکھا ہے

"صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ایک دفعہ صحیح مسلم کے درس میں آکر شریک ہوئے، واپس ہوکر میں نے خود ان سے سنا کہتے تھے کہ آج تو آکسفورڈ اور کیمبرج کے لکچر ہال کا منظر مرے سامنے آگیا تھا یورپ کی ان یونیورسٹیوں میں پروفیسروں کو جیسے پڑھاتے ہوئے میں نے دیکھا ہے، آج ہندوستان میں میری آنکھوں نے اسی تماشے کو دیکھا" [1]

عربی مدرسوں میں اپنے طرز کا درس اوّل و آخر غالباً حضرت شاہ صاحب رح ہی پر ختم ہوگیا، گو اب بھی مدرسوں میں اساتذہ بہت تحقیقی تقریر فرماتے ہیں اور کتابوں کے نام بھی لیتے ہیں، مگر کھول کر دیکھانا یہ رواج اب نظر نہیں آتا اور نوجوان علماء تو کتابوں کے دیکھنے کی زحمت ہی برداشت نہیں کرتے، نوٹ یا نوٹ کی سی جو کتابیں چھپ گئی ہیں انہی پر ان کا سارا دارو مدار ہوتا ہے۔

حضرت حکیم الامت تھانوی رح حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ کی انہی خصوصیتوں کے پیش نظر فرماتے تھے۔

"میرے نزدیک حقانیت اسلام کی دلیلوں میں سے ایک دلیل حضرت مولانا انور شاہ صاحب کا امت مسلمہ میں وجود بھی ہے، اگر دین اسلام میں کسی قسم کی کجی یا خرابی ہوتی تو آپ دین اسلام سے کنارہ کش ہو جاتے" [2]

اللہ اللہ حکیم الامت تھانوی رح جیسے ذہین اور ذی علم کی شہادت جس کے حق میں اتنی اہم ہو، اس کے دل و دماغ کی صلاحیتوں کا کیا کہنا، معلوم ہوتا ہے آپ کو قدرت نے بے نظیر عقل و فہم سے نوازا تھا اور کوئی بات بغیر دلیل آپ نہیں مانتے تھے۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت محدث کشمیری کو اپنے وقت کا امام حدیث یقین کرتے تھے، حضرت محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات پر

---

[1] حیات انور ص ۲۶ [2] ایضاً ص ۲۰

آبدیدہ ہو کر فرمایا تھا۔

"میں محسوس کر رہا ہوں کہ حافظ ابن حجرؒ، شیخ تقی الدین اور سلطان العلماء، کا انتقال آج ہو رہا ہے۔" [1]

اللہ تعالیٰ نے علم کے ساتھ عمل کی دولت سے بھی آپ کو سرفراز فرمایا تھا، آپ نے دار العلوم دیوبند کے مقابلہ میں بڑی بڑی تنخواہوں کو ٹھکرادیا اور زندگی بھر دیوبند یا ڈابھیل میں بخاری اور ترمذی وغیرہ کے درس میں لگے رہے لکھا ہے

"آپ کو ڈھاکہ یونیورسٹی اور مدرسہ عالیہ کلکتہ سے بار بار طلب کیا گیا، بڑی بڑی تنخواہیں پیش کی گئیں لیکن آپ نے کبھی بڑی تنخواہوں کو ترجیح نہیں دی اور ہمیشہ دیوبند و ڈابھیل کے خشک خطوں ہی کو پسند فرمایا۔" [2]

جو علم کا شیدا ہوتا ہے، اس کی نگاہ تنخواہ پر نہیں ہوتی، بلکہ وہ دیکھتا ہے کہ میری ذات سے مخلوق کو زیادہ فائدہ کہاں سے پہنچ سکتا ہے اور علم کی خدمت کہاں سے اچھی ادا ہوگی۔ مگر اب یہ باتیں ہماری جماعت سے آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہیں۔

شیخ الاسلام مولانا مدنی مدظلہٗ نے فرمایا تھا۔

"میں نے ہندوستان، حجاز، عراق، شام وغیرہ کے علماء اور فضلا سے ملاقات کی اور مسائل علمیہ میں ان سے گفتگو کی، لیکن تبحرِ علمی، وسعت معلومات، جامعیت اور علوم عقلیہ و نقلیہ کے احاطہ میں شاہ صاحب کا کوئی نظیر نہیں پاتا۔" [3]

آہ اب تو ہمارے علماء کی جماعت میں چند بوڑھے علماء رہ گئے ہیں، اگر یہ چل بسے تو پھر ہندوستان میں علم کا چراغ ہی گل ہو جائے گا۔

لوگوں میں احساس نہیں کہ نوجوان علماء میں زندگی کی روح دوڑائی جائے اور ان کو تحقیق اور وسعت معلومات کی شاہراہ پر ڈال دیا جائے۔ دوسرے ملکوں سے ہمیشہ ہمارا

---

[1] حیات انور ص ۱۹ [2] ایضاً ص ۱۶ [3] ایضاً ص ۱۲

ملک دینی علوم میں بڑھا ہوا رہا ہے، آئندہ یہ عزت رب العزت کے ہاتھ ہے۔

حضرت محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور آپ کبھی بھی اس سے غافل نہیں رہے کہ علوم وفنون کا سارا ذخیرہ کتابوں میں محفوظ ہے، لہٰذا جتنی بھی اہم کتابیں تھیں ان میں سے کسی سے غفلت نہ برتی اور کثرت مطالعہ ہی کا نتیجہ تھا کہ یہ میدان آپ کے لئے بڑا سہل ہوگیا تھا، بڑی سے بڑی کتابوں کے دیکھنے میں آپ کو کوئی دقت پیش نہ آتی تھی، لکھا ہے کہ

"سرعت مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ "مسند احمد (مطبوعہ مصر) کے روزانہ دو سو صفحات کا مطالعہ فرمایا اس طرح کہ پوری دقت نظر اور کامل غور وفکر کے ساتھ اس کے اسانید اور مشکلات کو حل کرتے جاتے تھے"۔[1]

مصری کتابوں کا مطالعہ اس سرعت کے ساتھ بتاتا ہے کہ قدرت نے آپ کو بے نظیر صلاحیت سے نواز تھا تو ایسی فرائض کے ساتھ ساتھ مطالعہ کا یہ اہتمام شاہد ہے کہ رب العالمین کی عطا کردہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ آپ نے محنت بھی کافی کی تھی، آہ اب تو ہمارے علماء کرام نے محنت کے فوائد کو فراموش کر دیا ہے، دنیا کے سارے کاموں کے لئے وقت ملتا ہے مگر کتب بینی کی توفیق نہیں ہوتی۔

مولانا یوسف بنوری نے لکھا ہے

"حضرت شاہ صاحب نے ۱۳۲۱ھ میں "فتح القدیر" لابن الہمام رحمۃ اللہ کا مع تکملہ بیس دن کے اندر مطالعہ فرمایا اور اس طرح کہ کتاب الحج تک اس کی تلخیص فرمائی اور ابن ہمام نے فتح القدیر میں صاحب ہدایہ پر جو اعتراضات کئے ہیں، اپنے خلاصہ میں ان کے مکمل جوابات بھی قلم بند فرمائے"۔[2]

سرعت مطالعہ کی بات جانے دیجئے، ہمیں غور یہ کرنا ہے اب علماء کرام ان کتابوں کا بالاستیعاب اس طرح مطالعہ کرتے ہیں؟ اپنا خیال ہے بالاستیعاب مطالعہ کا یہ ذوق

---

[1] حیات انور ص ۱۲ [2] ایضاً

تقریباً ختم ہو چکا ہے، ممکن ہے کسی خاص بحث دیکھنے کے لئے متعدد کتابیں کوئی کھولے مگر بسم اللہ سے تمت تک پڑھنا محال ہے، اب تو دیکھتے ہیں کہ علماء، مدرسوں میں پوری کتاب پڑھانے کا رواج بھی اٹھاتے چلے جارہے ہیں، جس کا انجام یہ ہو رہا ہے کہ بعض ابواب پر کبھی بھی نظر نہیں جاتی۔

حضرت محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ہی کا واقعہ لکھا ہے۔

"بلکہ آپ کو یہ کمال حاصل تھا کہ فن کی کوئی کتاب ملی اور اس کو شروع سے آخر تک ضرور ایک بار مطالعہ فرمالیا" [۱]

دیکھ رہے ہیں ادھورا مطالعہ نہ تھا، جیسا کہ آج کل ہمارے بعض اہل علم کا طریقہ ہے کہ ادھر ادھر سے الٹ پلٹ کر دیکھ لیا اور بس، اس مطالعہ سے ٹھوس علمیت نہیں ہوتی ہے، علمی کمال کے لئے کتب بینی لازمی ہے۔

حضرت محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے انہی فضل وکمال کا یہ اثر تھا کہ مصر وشام اور دوسرے ملکوں میں آپ کے تبحر علمی کا سکہ چلتا تھا، علامہ رشید رضا مصری، موسیٰ جار اللہ روسی اور دوسرے غیر ملکی علماء آپ سے بے حد متاثر تھے اور آج ہندوستان و پاکستان کے تقریباً وہ تمام مشہور ومعروف علماء کرام جو نمایاں نظر آتے ہیں، حضرت محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ہی کے فضل وکمال کے چھینٹے ہیں۔ اخیر میں دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا سید محمد ازہر شاہ صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے، جنھوں نے بروقت آپ کی حیات شائع فرماکر اہل علم کی راہ نمائی فرمائی ہے۔

---

[۱] حیات انور ص۱۱

کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ

میں شعرائے اورنگ آباد کی اردو قلمی کتابیں

(جناب نصیر الدین ہاشمی ممتاز منشن روڈ لکڑی کا پل حیدر آباد دکن)

صدیوں پہلے دولت آباد سلطان محمد تغلق کی بدولت پورے ہندوستان کی راج دہانی بن کر علماء اور شعراء کا مرکز ہو گیا تھا مگر کچھ عرصہ کے بعد ہی دولت آباد کی دولت وحشمت پر زوال آگیا اور صرف کاغذ سازی کا ایک قصبہ باقی رہ گیا۔ پھر ملک عنبر کے طفیل کھڑکی آباد ہوا احمد نگر کے بجائے نظام شاہیوں کا مستقر حکومت قرار پایا اس کے بعد عالم گیر خلد آشیانی کے دارالسلطنت بننے کا شرف اورنگ آباد کو حاصل ہو گیا علماء، فضلاء، شعراء اور ادیب یہاں سمٹ آئے بیجاپور اور گولکنڈہ کی تباہی اور پھر دہلی سے پائے تخت کی منتقلی کے باعث اورنگ آباد کو جو ترقی نصیب ہوئی وہ تاریخ کے صفحات سے مٹ نہیں سکتی اورنگ آباد سے عالم گیر کو دلی شغف تھا مرنے کے بعد بھی اورنگ آباد کے قرب میں ہمیشہ کی نیند سونا نصیب ہوا آج بھی اس کی روحانی آنکھیں اورنگ آباد کے عروج زوال کی نگرانی کر رہی ہیں ایک عرصہ تک اورنگ آباد تمدن و تہذیب، علم و ہنر کا سنگم بنا رہا اس کو آصف جاہ اول ناصر جنگ اور صلابت جنگ کے زمانہ میں دکن کے پائے تخت رہنے کا امتیاز بھی حاصل رہا ہے گذشتہ دور میں اس کو انجمن ترقی اردو کا صدر مقام بھی رہنے کا موقع بھی ملا ہے۔ بہر حال اورنگ آباد ایک عرصہ تک علم و فن شعر و ادب کا مرکز بنا رہا اور یہاں کے شعراء اور ادیب اردو ادب کی خدمت کرتے رہے اور اپنے بیش بہا تصانیف سے اردو کے خزانہ میں خاص اضافہ کیا اگرچہ ایک بڑا حصہ گوشہ گمنامی میں ہے لیکن پھر بھی بیسیوں شہ پارے اب تک کتب خانوں کی زینت

بنے ہوئے ہیں اس موقع پر ہم کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ میں جو اردو قلمی کتابیں محفوظ ہیں ان کا مختصر تعارف کراتے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شعراء کے تخلص کے لحاظ سے ان کی صراحت کی جائے۔

(۱) ایجاد نقد علی خاں ایجاد آصف جاہی امراء میں شامل اور اردو کا صاحب دیوان شاعر تھا اس کے کلیات کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ میں دو نسخے موجود ہیں کلیات کا آغاز ان شعروں سے ہے۔

گلشن دل ہے تماشا گاہ رب العالمیں ابر رحمت سے ہمیشہ سبز ہے یہ گل زمیں

باغبان اس روضۃ الرضوان کے غلماں ہیں مالنیں اس جنت فردوس کی ہیں حور عین

دوسرے دیوان کا آغاز اس شعر سے ہے یہ سالار جنگ کے کتب خانہ میں ہے

جب کچھ اثر نہ تھا یہ سخن کی نمود کا معنی بیاں تھا آپ ہی گفت و شنود کا

کتب خانہ سالار جنگ میں قصائد ایجاد کا بھی ایک نسخہ ہے جس میں بارہ قصیدے بارہ اماموں کی مدح میں ہیں پہلے قصیدہ کا آغاز یہ ہے۔

پھر میں نہ جانوں کیا ہے زمانے کا اقتضا دل جس کا دیکھئے تو ہے اس عصر میں خفا

فکروں میں چور منعم و درویش ہیں سبھی اندوہ میں تمام ہیں کیا شاہ کیا گدا

کتب خانہ سالار جنگ کی بعض بیاضوں میں ایجاد کے مرثیے بھی شامل ہیں۔

(۲) افضل بیگ خاں خاکسار اورنگ آباد کا متوطن تھا اس کا تذکرہ شعراء جو تحفۃ الشعراء سے موسوم اور اگرچہ فارسی گو شعراء سے متعلق ہے شائع ہو چکا ہے مگر اس میں بعض شعراء کا اردو کلام بھی شریک ہے اس تذکرہ کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے۔

(۳) اشرف، ولی کا ہم عصر تھا شفیق نے اس کا تذکرہ اپنی تصنیف چمنستان شعراء میں لیا ہے۔ اس کی ایک مثنوی جنگ نامہ ہے اس کا نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے اور کتب خانہ سالار جنگ میں تین نسخے ہیں اس کا آغاز یہ ہے۔

الہٰی دونوں جگ کا کرتار تو   دو عالم کا پیدا کرنہار تو

ایک فقہ کی کتاب لازم المبتدی بھی اس کی تصنیف ہے جو کتب خانہ سالار جنگ میں ہے۔

(۴) تمنا۔ اسد علی خاں تمنا اورنگ آباد کا مشہور شاعر تھا زمانہ مابعد میں جب آصف جاہ ثانی نے اپنا دارالسلطنت حیدر آباد میں منتقل کر دیا تو تمنا بھی حیدر آباد چلا آیا تمنا کا تذکرہ شعراء جو "گل عجائب" سے موسوم ہے اور سنہ ۱۱۹۴ھ میں تالیف ہوا ہے اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے اسی نسخہ سے مولوی ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے اس کو شائع کر دیا ہے۔

تمنا کا کلیات کتب خانہ سالار جنگ میں ہے یہ نہایت ضخیم کلیات ہے (۸×۵) انچ کے (۲۸۸) صفحات پر حاوی ہے۔ کلیات کا آغاز ایک خمسہ سے ہے اس کو تمنا کے ایک شاگرد مجاہد جنگ نے مرتب کیا ہے۔ اس کلیات میں ہر قسم کا کلام۔ مثنویاں۔ قصیدے غزلیات رباعیات مرثیے سب کچھ ہیں قصائد حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی محبوب سبحانی وخواجہ بندہ نواز گیسو دراز امام محمد باقر آصف جاہ ثانی ارسطو جاہ کے مدح میں لکھے گئے ہیں کلیات کا آغاز یہ ہے۔

چھوڑا دے کفر و عصیاں کا دوراہا   دکھا دے راہ عرفاں بادشاہا

بچا رکھ نفس و شیطاں سے الہٰا   الہٰی معذرت خواہا مینا ہا

فاہا ثم آہا ثم آہا

(۵) تجلی، تجلی علی شاہ دکن کا مشہور مورخ اور شاعر تھا اس کی تالیف "مجموعہ فصاحت" ہے جس میں ارسطو جاہ کے مدح میں شعراء کے موزوں کئے ہوئے قصیدے قطعات وغیرہ شامل ہیں ان کو شعراء کے تخلص کے لحاظ سے ردیف وار ترتیب دیا گیا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ سالار جنگ میں اس کے نسخے موجود ہیں سنٹرل ریکارڈ آفس میں بھی ایک نسخہ ہے۔ اگرچہ یہ نسخہ اول الذکر نسخوں سے خوش خط ہے مگر نامکمل ہے یعنی صرف ایک جلد ہے چند سال پہلے اس کتاب پر ہمارا ایک تفصیلی مضمون بھی شائع ہوا ہے۔ ریسرچ کرنے والوں کے لئے یہ ایک بیش قیمت ذخیرہ ثابت ہو سکتا ہے کیوں کہ اس میں دکھنی شعراء کے بیسیوں قصیدے

ہیں جو اپنی فصاحت وبلاغت اور تشبیہ و استعارات اور بلندیٔ مضمون کے لحاظ سے قابل قدر ہیں

(۶) داد رسی اورنگ آباد کا مشہور شاعر ہے اس کو بعض ولی کا ہم عصر اور بعض ولی کا شاگرد قرار دیتے ہیں۔ اس کے دیوان کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں اور ایک نسخہ سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ دیوان کا آغاز ان اشعار سے ہے۔

ابتداء لکھا ہوں اسم اللہ کا ۔۔۔ کھینچ مد دیواں پہ بسم اللہ کا
بعد حمد و ذکر اللہ صمد ۔۔۔ شغل ہے نعت رسول اللہ کا

درگاہ قلی خاں، خاندان سالار جنگ کے مورث مرثیہ گوئی میں مشہور تھے ان کے مرثیے کتب خانہ سالار جنگ کے کئی بیاضوں میں موجود ہیں۔ ایک بیاض میں بہت زیادہ مرثیے ہیں۔ خان دوراں خاں ان کا خطاب تھا۔ بعض مرثیوں پر ۱۱۷۷ھ میں لکھنے کی صراحت موجود ہے۔ پہلے مرثیے کا آغاز یہ ہے۔

غنچۂ باغ محمد پر درود ۔۔۔ نو گل گلزار احمد پر درود
آب و رنگِ گلشنِ دیں پر سلام ۔۔۔ نخل مثمر سرو خوش قد پر درود

(۸) ذرہ ۔ بالاجی ترمیک نام، ذرہ تخلص۔ آزاد بلگرامی کا ہم عصر تھا۔ فارسی اور اُردو میں شعر کہا کرتا۔ اس کے کلیات کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے۔ ضخیم کلیات ہے (۳۷۸) صفحے ہیں۔ اس میں غزلیات ۔ قصیدے ۔ مرثیے ۔ رباعی شامل ہیں۔ آغاز یہ ہے۔

لے نام خدا کا جو میں دیوان کہوں گا ۔۔۔ لاشک ہے کہ موصوف انسان کہوں گا

(۹) سراج ۔ شاہ سید سراج الدین سراج اورنگ آباد کے مشہور و معروف شاعر تھے۔ ان کے کلیات کو مجلس اردو مخطوطات سالار جنگ نے شائع کیا ہے سراج کے دیوان کے چار نسخے کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ میں تین نسخے ہیں۔ ان میں سب سے قدیم دیوان سنہ ۱۱۷۳ھ کا لکھا ہوا ہے جب کہ خود سراج زندہ تھے کیوں کہ ان کا انتقال سنہ ۱۱۷۷ھ میں ہوا ہے یہ نسخہ سالار جنگ کے کتب خانہ میں ہے۔ (۲۷۰) صفحات پر حاوی ہے۔ اس دیوان کا آغاز اس شعر سے ہے۔

عجب قادرِ پاک کی ذات ہے — کہ سب میں نفی اور وہ اثبات ہے

دوسرا نسخہ سنہ ۱۱۹۲ھ کا لکھا ہوا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ کا ایک نسخہ سنہ ۱۱۰۷ھ اور ایک نسخہ ۱۱۰۹ھ کا لکھا ہوا ہے۔

سراج کی مثنوی بوستانِ خیال کے چار نسخے کتب خانہ سالار جنگ میں ہیں۔ اس کی تصنیف سنہ ۱۱۶۰ ہجری میں ہوئی ہے۔ آغاز کے دو شعر یہ ہیں۔

اے ہم نشینو مرا دکھ سنو — مرے دل کے گلشن کی کلیاں چنو

مرے پر عجب طرح کے درد ہیں — کہ سب درد اس درد کے گرد ہیں

(۱۰) لالہ لچھمی نارائن شفیق اورنگ آباد کا مشہور مورخ اور شاعر ہے اس نے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی سے استفادہ کیا تھا۔ فارسی اور اردو میں شعر کہا کرتا تھا کئی کتابوں کا مصنف ہے اس کا تذکرہ "چمنستان شعرا" کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ اسی سے نقل لے کر مولانا عبد الحق نے اس کو شائع کیا ہے۔ شفیق کی مثنوی تصویر جاناں مشہور ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں ہے۔ یہ مثنوی (۵۰) صفحے کی ہے۔ تقریباً ایک ہزار شعر ہیں مثنوی کا آغاز ان اشعار سے ہوا ہے۔

سنو اے حسن کے تصویر ساز و — سنو اے عشق کے جادو طراز و

ٹک اک دل دے کے صاحب کا فسانہ — کہ فن عاشقی میں ہے یگانہ

مری ایک رات کنیں نیند اوچھٹ گئی — صف خواب آنکھوں کے آگے سے ہٹ گئی

(۱۱) نوازش علی خاں شیدا۔ کو بھی اورنگ آبادی شعرا میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ زمانہ مابعد میں وہ آصف جاہ ثانی کے ہمراہ بعض دوسرے شعراء کی طرح حیدر آباد آ گیا تھا۔ شیدا کی مثنویاں۔ اعجاز احمد۔ روضۃ الاطہار کے دو نسخے کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہیں۔ چنانچہ کتب خانہ آصفیہ میں اعجاز احمد کا ایک مکمل اور ایک نامکمل نسخہ اور روضۃ الاطہار کے دو نسخے اور کتب خانہ سالار جنگ میں اعجاز احمد کے تین نسخے مکمل اور تین نامکمل اور روضۃ الاطہار کے سات نسخے ہیں۔ ان کے علاوہ کتب خانہ سالار جنگ میں شیدا کے مرثیے نوحے اور سلام بھی محفوظ ہیں۔

(۱۲) شوق۔ محمد علی نام اورنگ آباد میں سنہ ۱۱۸۱ھ میں اس کی پیدائش ہوئی۔ چار سال کے سن میں باپ کے ساتھ حیدر آباد آگیا۔ کم عمری ہی میں باپ کے مرنے پر آصفی دربار سے آبائی منصب اور جاگیر عطا ہوئی۔ شاہ تجلی سے شوق کو تلمذ تھا۔ اس کی مثنوی منظوم چہار درویش ہے۔ جو ۱۲۲۵ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ ضخیم مثنوی ہے۔ کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ میں اس کے نسخے موجود ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو میں بھی ایک نسخہ ہے مگر وہ ناقص الآخر ہے اس مثنوی کا آغاز ان اشعار سے ہوا ہے۔

الٰہی تیری حمد ہے بے قیاس — بشر کو کہاں اتنا ہوش و حواس
لکھے جو تیری نظم تعریف کے — کہے شعر برجستہ توصیف کے
ہے از بس کہ قدرت نمایاں تری — تری حمد ہے خوب شایاں تری

میر امن کی چہار درویش کو انھوں نے منظوم نہیں کیا بلکہ فارسی سے دکھنی کیا ہے۔

(۱۳) شہید۔ مرزا محمد باقر بقول شفیق طہرانی تھا۔ اورنگ آباد میں اقامت کر لی تھی اس کا ایک مختصر دیوان سالار جنگ کے کتب خانے میں موجود ہے۔

ہمیشہ کور چشماں عیب بیں ہیں اے شہید اپنے — نہیں ہے عیب بینی کام ہرگز چشم بینا کا

(۱۴) عبدالولی عزلت۔ اگرچہ اورنگ آبادی نہیں تھا مگر اورنگ آباد میں اقامت کر لی تھی۔ پھر حیدر آباد آیا۔ عزلت اپنی شاعری، مصوری اور موسیقی کے لحاظ سے مشہور ہیں۔ ان کی تصنیف راگ مالا ہے۔ اس کے نسخے کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہیں۔

(۱۵) عارف الدین خاں عاجز۔ بھی حیدر آباد آگئے تھے مگر اورنگ آباد کے شعرا میں ان کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ ان کی پیدائش یہاں ہی ہوئی۔ ان کی مثنوی لال گوہر مشہور ہے اس کے ۳ نسخے کتب خانہ آصفیہ میں اور سات نسخے کتب خانہ سالار جنگ میں ہیں۔ آغاز کے دو اشعار یہ ہیں۔

الٰہی دے مجھے رنگیں بیانی — عطا کر مجھ کو یاقوت معانی
سخن کا لعل دے میری زباں کو — درِ معنی سے بھر میرے بیاں کو

(۱۶) غضنفر۔ غضنفر حسین۔ اس نے جنگ نامہ عالم علی خاں کی مثنوی لکھی ہے۔ اس

مثنوی میں آصف جاہ اول اور عالم علی خاں کے جنگ شکر کہرہ کا حال قلم بند کیا ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ میں اس مثنوی کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے مثنوی کا آغاز یہ ہے۔

اول حمدِ حق کر بدل ابتدا بخواں بعد نعتِ رسولِ خدا

(۱۷) فترت۔ کا کوئی دیوان یا مثنوی اب تک ہم دست نہیں ہوئی ہے اور نہ کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ میں ان کی کوئی تصنیف موجود ہے لیکن ان کے تذکرے ریاض حسین کی صراحت ضروری کیونکہ یہ شعراء اردو کا ایسا تذکرہ ہے جو اب تک شائع نہیں ہوا ہے۔ اس تذکرہ کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ سنٹرل ریکارڈ آفس میں موجود ہے اس پر ہمارا تفصیلی مضمون مقالا ہاشمی میں شریک ہے۔

(۱۸) فراقی کے متعلق بہت کم معلومات ہیں۔ تاہم یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ولی کا ہم عصر تھا۔ اس کی ایک ضخیم مثنوی "مرات الحشر" ہے اس مثنوی کے نسخے کتب خانہ آصفیہ و کتب خانے سالار جنگ دونوں جگہ موجود ہیں۔ اس مثنوی میں یوم حشر یعنی روز قیامت کے آثار کے حدیثیں اور حکایتیں وغیرہ منظوم کی گئی ہیں۔ فراقی کی ایک اور مختصر نظم کتب خانہ سالار جنگ میں ہے۔ جس کے (۸۴) شعر ہیں۔ ہر چوتھے مصرع میں "نبی جی آسرا تیرا"، لکھا گیا ہے۔

ہمیشہ مجھ سے عاصی کو نبی جی آسرا تیرا

جہنم کی خلاصی کو نبی جی آسرا تیرا

اندھارا مجھ کو نا سوجھے کہ دن اور رات نا سوجھے

(۱۹) شاہ قاسم کے دیوان کے دو نسخے کتب خانہ سالار جنگ اور ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے۔ دیوان کا آغاز اس شعر سے ہے۔

وِرد ہر دم اسم رکھ اللہ کا گرد ہو راہِ رسول اللہ کا

(۲۰) ولی محمد، ولی وہ خوش قسمت اور خوش نصیب شاعر ہے جو گجرات اور دکن دونوں جگہ کے مورخین ادب اس کو اپنے وطن سے متعلق کرنے کے لئے زور آزمائی کر رہے ہیں۔ مگر ڈاکٹر زور نے اپنے ایک دلچسپ اور معلومات آفریں مضمون میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ ولی دکن کا باشندہ تھا اور ولی محمد اس کا نام تھا۔

ہر ایک تذکرہ نویس نے اس امر کی صراحت کی ہے کہ شاہ ابو المعالی ولی کے دوست اور ہم راز اور ہم پیالہ تھے انڈیا آفس میں ابو المعالی کے فرزند کے ہاتھ کا لکھا ہوا قلمی دیوان موجود ہے۔ جس میں انھوں نے ولی کو ولی محمد متوطن دکن لکھا ہے۔ ایک دوست کے فرزند کا نام اور وطن کی غلطی کرنا ممکن ہے بہر حال اورنگ آباد کو ولی کے وطن ہونے کا شرف حاصل ہے۔

اگرچہ ولی کے کلیات یا دیوان کئی مرتبہ شائع ہوا ہے لیکن اس کے قلمی نسخے بعض کتب خانوں میں ملتے ہیں۔ کتب خانہ سالار جنگ میں دیوان ولی کے بارہ نسخے ہیں جن میں قدیم تر دیوان سنہ ۱۱۲۵ھ کا لکھا ہوا ہے چونکہ ولی کا انتقال سنہ ۱۱۱۹ھ میں مصدق ہو گیا ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ دیوان انتقال کے صرف چھ سال کے بعد لکھا گیا ہے۔ ایک نسخہ سنہ ۱۱۵۰ھ کا دوسرا سنہ ۱۱۶۲ھ اور تیسرا نسخہ سنہ ۱۱۷۸ھ کا لکھا ہوا ہے۔

کتب خانہ آصفیہ میں ولی کے دیوان کے چار نسخے ہیں جن میں قدیم تر نسخہ سنہ ۱۱۵۹ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اگرچہ ولی کا کلیات کئی مرتبہ شائع ہوا ہے مگر اس کے قلمی دیوانوں کا مقابلہ کیا جائے تو غیر مطبوعہ کلام ہمدست ہو سکتا ہے۔ کئی سال پہلے ہم نے یورپ کے دیوانوں سے جو غیر مطبوعہ کلام ملا تھا اس کو شائع کر دیا تھا۔ اب بھی ان سولہ دیوان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو بہت کچھ غیر مطبوعہ کلام ہم دست ہو سکتا ہے۔

(۲۱) ہم رنگ شاہ۔ عزیز اللہ ہم رنگ کی تفسیر جو "چراغ ابدی" سے موسوم ہے کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے یہ تفسیر نثر میں ہے۔ اور سنہ ۱۲۲۱ھ میں تالیف ہوئی ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حیدرآباد کے دونوں بڑے کتب خانوں میں شعراء اورنگ آباد کی کئی ایک کتابیں موجود ہیں۔ چونکہ ہنوز سالار جنگ کے کتب خانہ کا پورا کام میں نے ختم نہیں کیا ہے اس لئے بہت ممکن ہے۔ اور کتابیں ہمدست ہو سکیں۔ بہر حال ریسرچ کرنے والوں کے لئے ان کتب خانوں کی قلمی کتابوں سے بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔ اور شعراء اورنگ آباد کے کارنامے بھی مجلا ہو سکتے ہیں۔

اَدَبیّات

آزادِ ہر فنا ہوں میں

جناب الم مظفر نگری

(۱)

حیاتِ عشق ہوں پروردۂ وفا ہوں میں — ازل کے دن ہی سے آزادِ ہر فنا ہوں میں
وقارِ عالمِ تقدیس ہے مرا عرفاں — مری خودی کے تصرف میں ہے نظامِ جہاں
ہزار حشر بدامن ہے میری آہِ خموش — نفس نفس ہے مرا موجۂ پیامِ سروش
مرے جلو میں رواں ہیں فرشتگانِ جلیل — مجھے نصیب ہے ہر لمحہ سایۂ جبریل
میں افتخارِ مکمل ہوں زندگی کے لئے — ہوں وجہ نظمِ دو عالم کی برہمی کے لئے

نہ چھیڑ مجھ کو تو میں ہوں وہ شعلۂ لرزاں
کہ جس کی آنچ سے تھرا رہے ہیں کون و مکاں

(۲)

شفق میں میرے لہو کا شباب باقی ہے — میں وہ بقا ہوں کہ جس سے فنا لرزتی ہے
وہ اقتدار کہ پابند جس کی ہے تقدیر — وہ اختیار کہ وابستہ جس سے ہر تدبیر
وہ اختراعِ ازل جس کی زندگی جواں — ہے اپنے مرکزِ ہستی پہ مثلِ کوہِ گراں
وہ ایک بندۂ مومن کہ جس کا ذوقِ فنا — مقام لا سے پہنچتا ہے تا حدِ اِلّا
وجود نقطۂ پرکار کی طرح سیّار — محیطِ عرصۂ گیتی ہوں مثلِ لیل و نہار
کہیں سے خلد بہ آغوش آ رہا ہوں میں — نوید زندگیٔ شوق لا رہا ہوں میں

غزل

جناب شارق ایم۔اے

غم کدۂ حیات میں، ضبط سے کام چاہئے
ٹپکے نہ اشک آنکھ سے، بادہ بجام چاہئے

میری طرف بھی اک نظر صدر نشینِ انجمن
گرمی بزم کے لئے، گردشِ جام چاہئے

دل کی لگی بجھا تو لوں، جی کی انھیں سنا تو دوں
اور تو کچھ نہیں ذرا، اذنِ کلام چاہئے

ساز بھی ہو تو دل نواز، سوز بھی ہو تو جاں گداز
میری حیاتِ عشق کو، کیف دوام چاہئے

جینے کا پھر مزا نہیں، ہو نہ اگر خوشی میں غم
جامِ حیات میں شریک تلخیٔ جام چاہئے

جاگوں تو رُخ کی ضو نصیب، سوؤں تو گیسوئے حبیب
ایسی بھی صبح چاہئے، ایسی بھی شام چاہئے

وقت کی اب ہے مانگ اور، دور ہے اب یہ اور دور
رحمت خاص ہو چکی، رحمت عام چاہئے

جس میں ہو سوز زندگی، جس میں ہو وقت کی پکار
شارقِ زار آج کل ایسا کلام چاہئے

"غالب" سے

(رباعیاں)

(جناب برج لال جگی رعنا)

جذبات کو تخئیل کی ندرت بخشی
بیمار خیالات کو صحت بخشی

لے غالب خستہ تری ہمت کے نثار
شعلوں کو گلِ تر کی نزاکت بخشی

ہر زشت کو ناپسند کر کے چھوڑا
ہر خوب کو ارجمند کر کے چھوڑا

تھا ذوقِ سخن بلند اتنا تیرا
ہر پستی کو بلند کر کے چھوڑا

اسلوب سے چہرے کو نکھارا تو نے
تشبیہہ کی زلفوں کو سنوارا تو نے

تخئیل کی نادیدہ حسیں پریوں کو
الفاظ کے شیشوں میں اتارا تو نے

شئونِ علمیہ

روس میں سورج کی توانائی

جمہوریہ شورائیہ روس کی اکادیمی آف سائنس کے ادارۂ توانائی کے تجربہ خانے میں سورج کی توانائی میں تجربے کئے گئے تاکہ بلند تپشوں (ٹمپریچر) سے استفادہ کیا جاسکے۔ سورج کی شعاعوں کو ایک بڑے مقعر آئینے کے ذریعہ مرتکز کیا گیا۔

آئینہ کی شکل ایک کامل مکافی نما (پیرابولائڈ) کی ہے۔ اس میں ایک خاص مشین لگائی گئی تاکہ اس کا رُخ دن بھر سورج کی طرف رہے۔ آئینے کی سطح سے جو شعاعیں منعکس ہوئیں وہ آئینے کے ماسکہ (فوکس) پر جمع ہوگئیں اور ایک آتشی داغ حاصل ہوگیا۔

تحقیق سے پتہ چلا کہ داغ کے وسط میں تپش سب سے بلند رہی اور داغ کے کنارے کی طرف تیزی سے گھٹ گئی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس وسطی حصہ میں شعاعوں کا جو "تپش حاصل ہوا وہ لوہے کو پگھلا کر جوڑ دینے کے قابل تھا۔ ٹنگسٹن (ایک دھات) کی ایک سلاخ کے کنارے کو بھی گداختہ کیا جاسکا جس کے لئے کوئی ۳۵۰۰ درجہ مئی (سنٹی گریڈ) کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس گویا گداز ندہ صنعت میں ایک نیا اضافہ ہوا یعنی شمسی گداخت کا۔

امریکہ میں جوہری توانائی

قدرتی اور مصنوعی ربڑ کو ولکنائز یعنی گندھک کے ساتھ مدبر کرنے کے لئے امریکہ ہوائیہ نے ایک نیا اور انقلاب آفریں طریقہ ایجاد کیا ہے۔

اس کام کے لئے اب تک کیمیائی اور حرارتی طریقے کام میں لائے جاتے تھے چنانچہ ایک تجربے میں ربڑ کو مدبر کرنے کی ضرورت تھی تو یہ نیا طریقہ ہاتھ لگا۔ اس میں گاما شعاعیں استعمال کی جاتی ہیں۔ اس کا خیال اسی وقت تھا جبکہ مقررہ طریقے ناکام رہے۔ لیکن نتیجہ مروجہ

طریقوں سے بہتر ہی نکلا۔ ہوائیہ کا کہنا ہے کہ اس نئے طریقے میں کوئی اثرات مابعد باقی نہیں رہتے اور ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ حرارت پہنچانے کی ضرورت نہیں پڑتی اور نہ گندھک اس کے مرکبات اور دھاتی کسائنڈ جیسی کیمیاوی اشیا ملانا پڑتی ہیں۔

بے بجلی کا لاشعاعی آلہ امریکہ کے محکمۂ فوج نے ایک ایسا ہلکا سفری آلہ ایجاد کیا ہے جو میدان جنگ میں آدمیوں کے لاشعاعی (اکس ریز) فوٹو لے سکتا ہے۔ محکمہ نے حال ہی میں اعلان کیا ہے کہ اس آلے میں تابکار تھولیم سے طاقت حاصل کی جاتی ہے۔ پھر یہ آلہ بغیر بجلی، پانی یا تاریک کمرے کے آدمی کا فوٹو لے لیتا ہے۔

انہی لوازمات کے ساتھ جس میں ایک فلم گیر بھی شامل ہے اس آلہ کا وزن کل ۴۰ پونڈ ہے۔ متعدد تجربوں سے پتہ لگا کہ تابکار تھولیم کو چوتھائی انچ موٹی سیسے کی جس تختی میں رکھا جاتا ہے وہ استعمال کرنے والے کو اتفاقی اشعاع کی زد میں آنے سے محفوظ رکھتی ہے۔ تھولیم کی مقدار زیادہ نہیں رہتی۔ اس کا بس ایک ریزہ ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ معمولاً اس کی طاقت ایک سال تک رہتی ہے۔ اس کے بعد اس کو کارخانے میں بھیج دیا جاتا ہے تاکہ دوبارہ اس کو طاقت دار بنایا جا سکے۔

معیاری لاشعاعی فلمیں جب تیار ہوتی ہیں تو ان میں بڑی تفصیل ہوتی ہے۔ لیکن نئے تاسے سے حاصل شدہ تصویروں میں وہ تفصیل نہیں ہوتی۔ لیکن میدان جنگ یا کسی ناگہانی ضرورت پر یہ آلہ بہت کارآمد ہے۔

تبصرے

(۱) حیی بن یقظان (ترجمہ) ضخامت ۱۰۸ صفحات
قیمت مجلد تین روپیہ
(۲) فلسفہ حیی بن یقظان ضخامت ۱۲۴ صفحات
قیمت مجلد عہ/ دو روپیہ

کتابت وطباعت بہتر
پتہ :- جناب سعید احمد صاحب
صدیقی ذکاء اللہ روڈ
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

یہ دونوں کتابیں بھی جناب ظفر احمد صاحب صدیقی کی کاوش قلم کا نتیجہ ہیں۔ ابن طفیل مغرب کے مسلمان فلاسفہ میں ایک نہایت بلند مرتبہ فلسفی ہے اس نے ماحول اور وقت کے تقاضہ سے مجبور ہو کر حیی بن یقظان نامی ایک فرضی کردار کی داستان کے پیرایہ میں اپنے فلسفہ کی اصل روح کو سمیٹ کر بھر دیا تھا یہ کہنے کو کچھ بے ربط سی اور پریشان و منتشر داستان ہے لیکن ابن طفیل نے اس میں خدا کی ذات وصفات۔ روح وصورت۔ سزا وجزا۔ عالم کا حدوث وقدم۔ علم۔ زبان۔ مذہب ان سب اہم مباحث کی نسبت اپنے خاص فلسفیانہ افکار بڑی خوبی اور عمدگی سے بیان کئے ہیں۔ چنانچہ اس کتاب کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ آج یورپ کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں اس داستان کا ترجمہ موجود نہ ہو۔ جناب صدیقی صاحب اردو ادب کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اردو کو بھی اس شرف سے محروم نہ رہنے دیا۔ چنانچہ موصوف نے پہلی کتاب میں ابن طفیل اندلسی کی اصل عربی کتاب سے داستان حی بن یقظان کا اردو میں سلیس وعام فہم ترجمہ کیا ہے اور پھر دوسری کتاب میں ابن طفیل کے حالات وسوانح بیان کرنے کے بعد ابن طفیل کے فلسفہ کا تجزیہ کر کے اس کے ہر ہر جزیہ پر تبصرہ کیا ہے اور سب سے آخر باب میں ابن طفیل کا یورپ کے فلاسفۂ جدید سے مقابلہ وموازنہ کر کے اول الذکر کے فلسفہ کی اہمیت اور حیی بن یقظان

کی فلسفیانہ اور ادبی قدر و قیمت پر دلچسپ اور مفید کلام کیا ہے امید ہے کہ ارباب ذوق ان دونوں کتابوں کا مطالعہ کرکے لطف اندوز ہوں گے۔

حیات ز - خ - ش | از محترمہ انیسہ ہارون بیگم شروانیہ۔ تقطیع متوسط ضخامت ۲۲۶ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت تین روپئے پتہ :- مہتمم مطبوعات۔ مسعود منزل حمایت نگر - حیدرآباد دکن۔

زاہدہ خاتون شروانیہ نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم کی دختر نیک اختر اور شروانی خاندان علی گڈھ کی چشم و چراغ تھیں ان میں شعر و شاعری کا ذوق بچپن سے ہی تھا مور باپ کی نگرانی اور اہتمام میں اعلیٰ تعلیم و تربیت نے اس ذوق کو جلا دے کر اس کو اس قدر استواد اور پختہ کر دیا کہ مرحومہ نو عمری میں ہی پختہ مشق شاعرہ ہوگئیں مرحومہ اپنے باپ کے مسلک کے بر خلاف قومی اور سیاسی معاملات و مسائل میں قوم پرورانہ نقطۂ نظر رکھتی تھیں اور اس نقطہ نظر اور جذبات کو نظم کے پیرایہ میں ظاہر کرتی تھیں یہ نظمیں ز - خ - ش کے نام سے چھپتی تھیں مرحومہ کا نوجوانی میں یعنی ۲۷ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا ورنہ اگر وہ عمر پاتیں تو کوئی شبہ نہیں کہ اردو کے صف اول کے اساتذہ سخن میں ان کا شمار ہوتا۔

اس کتاب میں محترمہ انیسہ ہارون بیگم شروانیہ نے انھیں مرحومہ زاہدہ خاتون شروانیہ کے حالات و سوانح لکھے ہیں جو دلچسپ بھی ہیں۔ معلومات افزا بھی اور آج کل کی بہت سی تعلیم یافتہ لڑکیوں کے لئے سبق آموز بھی۔ محترمہ انیسہ ہارون خود اردو زبان کی شاعرہ اور ادیبہ ہیں اور مرحومہ کی چچازاد بہن بھی ہیں اس لئے اس کتاب میں ادبیت اور سخن طرازی کے ساتھ درد اور سوز و گداز بھی ہے اور ان دونوں باتوں نے مل کر کتاب کو بہت وقیع بنا دیا ہے۔

صحیفۂ ہمام بن منبہ | مرتبہ جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ تقطیع کلاں ضخامت ۶۴ا صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ہے پتہ :- الہدیٰ بک ایجنسی۔ نظام شاہی روڈ - حیدرآباد دکن۔

حضرت ابوہریرہ مشہور صحابی ہیں اور اس درجہ کثیر الروایت ہیں کہ ان کی کثرت روایت کی وجہ سے بعض مستشرقین نے تو خیر ان کی شان میں نہایت گستاخانہ الفاظ لکھے ہی ہیں لیکن خود ان کے زمانہ میں بھی بعض لوگوں کو اس پر تعجب ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے اس کثرت روایت کی وجہ بھی بیان فرمادی تھی۔ حضرت ابوہریرہ کے ایک تلمیذ خاص تھے جن کا نام ہمام بن منبہ تھا۔ حضرت ہمام نے ان روایات کی حفاظت وصیانت کا یہ اہتمام کیا تھا کہ وہ صرف سماعت پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ جو کچھ حضرت ابوہریرہ سے سنتے جاتے تھے اسے قلمبند کرلیتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ ایک مستقل صحیفہ ہوگیا جس کا نام کشف الظنون کی تصریح کے مطابق "الصحیفۃ الصحیحۃ" تھا اور جس میں ۱۳۸ روایات تھیں۔ حضرت ہمام کے بعد یہ صحیفہ دست بدست منتقل ہوتا ہوا صاحب مُسند ابوبکر عبدالرزاق الحمیری کے واسطہ سے امام احمد بن حنبل تک پہنچا تو انھوں نے اپنے مسند میں شامل کرکے اس کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کردیا لیکن بایں ہمہ یہ صحیفہ ابوبکر عبدالرزاق کے دوسرے تلمیذ السلمی کے ذریعہ نہایت حفاظت کے ساتھ دست بدست منتقل ہوتا رہا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے زمانہ تک اس کا باقاعدہ درس ہوتا تھا۔ اس کے بعد یہ گوشہ گمنامی میں جا پڑا اور محدثین کے درمیان متداول نہیں رہا۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر محمد حمیداللہ جو عربی، انگریزی، فرانسیسی اور اردو چاروں زبانوں میں اسلامیات پر نہایت محققانہ اور مفید کتابوں کے نامور مصنف ہیں ان کو برلن اور دمشق میں اس صحیفہ کے دو مخطوطے مل گئے جو علی الترتیب بارہویں اور چھٹی صدی ہجری کے لکھے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی محنت اور بڑے ذوق وشوق کے ساتھ ان دونوں مخطوطوں کا مقابلہ کرکے اس کا ایک اڈیشن تیار کیا اور اسے شائع کرکے وقف عام کردیا۔ چنانچہ زیر تبصرہ کتاب یہی اڈیشن ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اصل صحیفہ کے ساتھ جو عربی کے خوشنما ٹائپ میں ہے صحیفہ کی ہر روایت کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے اور جگہ جگہ نہایت مفید اور معلومات آفریں نوٹ لکھ کر یہ بھی بتاتے گئے ہیں کہ اس صحیفہ کی یہ روایت صحیح بخاری میں خصوصاً اور دوسری کتب متداولہ حدیث میں عموماً کہاں کہاں ہے۔ چونکہ یہ صحیفہ پہلی صدی کے نصف اول

کا لکھا ہوا ہے اس بنا پر اس تطبیق سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ خود صحیح بخاری اور دوسری کتب حدیث جو دوسری یا تیسری صدی ہجری کی مرتب کی ہوئی ہیں ان کے استناد و اعتبار میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا اور اس سے اُن منکرین حدیث کا منہ بند ہو جاتا ہے جو احادیث کو صرف اس لئے قابل اعتبار نہیں مانتے کہ ان کی تدوین دوسری یا تیسری صدی میں ہوئی تھی۔ علاوہ بریں موصوف نے شروع میں ۶۲ صفحات کا ایک مقدمہ اور آخر میں "بازیاد" کے عنوان سے دس صفحہ کا ایک ضمیمہ لکھا ہے جس میں کتابت حدیث کی تاریخ بڑے محققانہ اور فاضلانہ انداز میں بیان کرنے کے بعد عہد نبوت اور عہد صحابہ کے متعدد صحیفوں کا حال لکھا اور ان سے متعارف کرایا ہے اور ان سے متعلق ماخذ کی نشاندہی کی ہے۔ کتابت حدیث سے قطع نظر اسلام میں کتابت کے آغاز، عہد نبوی کے نظام تعلیم و سیاست اور بعض دوسرے مباحث و مسائل سے متعلق بھی اس میں بڑی عمدہ اور مفید معلومات آگئی ہیں اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کی طرف سے عموماً اور ارباب علم کی طرف سے خصوصاً فاضل مرتب کو ان کی اس محنت و کاوش کا اجر جزیل عطا فرمائے کہ در حقیقت انھوں نے اس صحیفہ کو اس اہتمام کے ساتھ مرتب اور شائع کر کے اسلام کی عظیم الشان خدمت انجام دی اور علمی دنیا پر بڑا احسان کیا ہے "ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند" ڈاکٹر صاحب کے ساتھ حیدر آباد دکن کی اسلامک پبلیکیشنز سوسائٹی بھی لائق مبارک باد ہے جس نے اس کو چھاپا اور شائع کیا اور جس کا خاص پروگرام ہی حدیث پر ایسی ہی نادر و نایاب کتابیں اڈٹ کرا کر شائع کرنا ہے۔ فَبَارَکَ اللّٰہُ فِی مساعیھم وجزاھم جزاءً خیراً۔

رہنمائے قرآن

اسلام اور پیغمبر اسلام صلعم کے پیغام کی صداقت کو سمجھنے کے لئے اپنے انداز کی یہ بالکل جدید کتاب ہے جو خاص طور پر غیر مسلم یورپین اور انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کے لئے لکھی گئی ہے۔ جدید ایڈیشن قیمت ایک روپیہ۔

ندوۃ المصنفین کی تاریخی کتابیں

غلامانِ اسلام

اسّی سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور کارناموں کا ایمان افروز بیان

قیمت صہ مجلد سے

عرب اور اسلام

ڈاکٹر حتی کی مشہور و معروف کتاب کا آسان اور نفیس ترجمہ۔

قیمت ہے مجلد للعہ

تاریخ اسلام پر ایک نظر

تاریخ اسلام کے تمام ادوار کے ضروری حالات و واقعات کی تفصیل تاریخ نویسی کے جدید تقاضوں کو سامنے رکھکر اسلوب بیان نہایت ہی دل نشین۔ قیمت سے مجلد ہے

تاریخ اسلام آٹھ جلدوں میں

• تھوڑے وقت میں تاریخ اسلام پڑھنے والوں کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ تاریخ ملت کے یہ تمام حصے مستند و معتبر بھی ہیں اور جامع و مکمل بھی طرز بیان نہایت شگفتہ و رواں، ترتیب دل نشین

نبی عربی صلعم — قیمت عہ مجلد عہ

خلافت راشدہ — قیمت ہے مجلد ہے

خلافت بنی امیہ — قیمت ہے مجلد ہے

خلافت ہسپانیہ — قیمت عہ مجلد عہ

خلافت عباسیہ جلد اوّل — قیمت ہے مجلد للعہ

خلافت عباسیہ جلد دوم — قیمت للعہ مجلد صہ

تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ — قیمت ہے مجلد ہے

خلافت عثمانیہ — قیمت ہے مجلد ہے

غیر مجلد مکمل سیٹ کی قیمت عہ

مجلد مکمل سیٹ کی قیمت عہ

قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات

قرون وسطیٰ کے حکمائے اسلام سائنس دانوں اور فلاسفروں کے بیمثال علمی کارناموں کا بیان

قیمت جلد اول عہ جلد دوم ہے
غیر مجلد عہ ” ہے

مسلمانوں کا نظمِ مملکت

• مسلمانوں کے نظم حکمرانی کی بصیرت افروز تاریخ جس میں مسلمانوں کے آئینِ جہانبانی کے تمام شعبوں کے متعلق نہایت صاف اور روشن معلومات دی گئی ہیں، یہ وقت کی ایک لائق مطالعہ کتاب ہے، اصل کتاب کے مصنف مصر کے مشہور فاضل اور جدید و قدیم علوم کے بالغ نظر عالم ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن ایم اے، پی، ایچ ڈی ہیں اور ترجمہ ندوۃ المصنفین کی نگرانی میں کرایا گیا ہے۔

قیمت للعہ مجلد صہ

مسلمانوں کا عروج و زوال

جدید ایڈیشن (اپنے موضوع پر ایک اچھوتی کتاب)

جس میں خلافتِ راشدہ کے دور سے لے کر ہندوستان کے عہدِ حکمرانی تک مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب کا مبصرانہ اور محققانہ تجزیہ کیا گیا ہے۔ قیمت للعہ مجلد صہ

تاریخ مشائخ چشت

سلسلۂ چشت کے صوفیہ کرام کا محققانہ تذکرہ اور ان کے مقصود حیات نظامِ اصلاح و تربیت پر مدلل بحث قیمت عہ مجلد عہ

فہرست کتب مفت طلب فرمائیے

مینیجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ محسن خاص جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپیہ یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبۂ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲۔ محسنین جو حضرات پچیس روپئے مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے۔ نیز مکتبۂ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" بلا کسی معاوضہ کے پیش کیا جائے گا۔

۳۔ معاونین:۔ جو حضرات اٹھارہ روپئے پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپئے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

۴۔ احبّاء نو روپئے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احبّاء میں ہوگا۔ ان کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات نصف قیمت پر دی جائیں گی یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلبہ کے لئے ہے۔

قواعد رسالہ برہان

(۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابل اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲ر آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہیے۔ خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ چھ روپئے۔ دوسرے ملکوں سے ساڑھے سات روپئے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس پرنٹر پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا